خواجہ غلام السیدین

آندھی میں چراغ

خواجہ غلام السیّدین

آندھی میں چراغ

مصنّف

غلام السیّدین

ناشر: انڈین اکیڈمی ۲۹ نریندرا پلیس نئی دہلی

جیّد پریس دہلی

تعداد ۱۰۰۰

مارچ ۱۹۶۲ء

قیمت

سات روپے پچاس نئے پیسے

نذرِ عقیدت

بخدمت

جناب ڈاکٹر عابد حسین صاحب

جن کی ذات میں بہت سی اعلیٰ قدروں کے حسین چراغ
روشن ہیں اور جن کے فیضِ صحبت سے میں نے
اُردو لکھنے کا تھوڑا سا سلیقہ سیکھا ہے ———

نذرِ عقیدت

بخدمت

جناب ڈاکٹر عابد حسین صاحب

جن کی ذات میں بہت سی اعلیٰ قدروں کے حسین چراغ
روشن ہیں اور جن کے فیضِ صحبت سے میں نے
اُردو لکھنے کا تھوڑا سا سلیقہ سیکھا ہے ـــــــــ

معذرت

مجھے یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ بہت سے لوگ اس کتاب کو پڑھیں گے یا ہمارے نقاد اس کا کوئی خاص نوٹس لیں گے لیکن قرین قیاس ہے کہ کچھ لوگ اس کو پڑھیں گے ضرور۔ ان کی خدمت میں چند باتیں بطور اعتذار کے عرض کرنی ہیں۔

کتاب کے حصہ اول میں دنیا کے عظیم مذاہب کی تعلیم کو پیش کرنا مدنظر نہیں بلکہ بعض معلمین مذہب کے بنیادی خیالات اور قدروں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اس لئے جو چیز کتاب میں نہیں ہے اس کی تلاش غیر ضروری ہے۔ حصہ دوئم میں بعض افراد کی سیرت کشی کی گئی ہے جن میں کچھ مشاہیر شامل ہیں اور کچھ ذاتی دوست، عزیز اور بزرگ۔ یہاں بھی مقصد ان کی سیرت کا تجزیہ اور ان کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کی جانچ نہیں (یہ تو ان کے سوانح نگار کا کام ہے) بلکہ ان شریف قدروں کو اجاگر کرنا ہے جن کا جلوہ میں نے ان کی ذات میں دیکھا۔ یہ شاید میری فطری کمزوری ہے کہ مجھے لوگوں کی خوبیوں کو اجاگر کرنے سے خوشی ہوتی ہے اور ان کی کمزوریوں کی کھوج ایک فعل عبث معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب میں تکنیکی اعتبار سے ایک کمزوری اور ہے اس میں بعض خیالات اور جذبات ایسے ہیں جن کو میں نے مختلف انداز میں بار بار پیش کیا ہے۔ لیکن اس تکرار کی معذرت کیوں کروں؟ یہ میرے بنیادی عقاید ہیں جن پر زور دینا میرا فرض ہے۔ اگر یہ غلط ہیں تو ان کو ایک دفعہ بیان کرنا بھی نقصان دہ ہے۔ اگر صحیح ہیں تو ان کو مختلف طریقوں سے دل میں بٹھانے کی کوشش قابل معافی ہے!۔

غلام السیدین

آندھی میں چراغ

جب میں نے اِس کتاب کو شائع کرنے کا ارادہ کیا تو مجھے اس کے لئے ایک مناسب نام کی فکر ہوئی۔ اس میں جو مضامین شامل کئے گئے ہیں ان میں سے بعض مختلف وقتوں پر اور مختلف وقتوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان کو اس نظر سے دیکھا کہ آیا ان میں کوئی ایسی قدر مشترک کوئی ایسا مرکزی خیال ہے جو ان کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ باوجود زمان و مکان کے فصل اور موضوع کے تنوع کے ان میں ایک داخلی وحدت پائی جاتی ہے۔ وہ سب کسی نہ کسی شکل میں ان قدروں کی ترجمانی کرتے ہیں جن کو میں زندگی کی صحیح اور صالح تشکیل کیلئے ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی ان قدروں کو افراد کی سیرت میں جلوہ گر دیکھا ہے، جن میں سے بعض شمع محفل تھے اور بعض چراغ خانہ کبھی ان کی جھلک ادیبوں، شاعروں، مفکروں کے کلام اور فکر میں نظر آئی ہے اور کبھی ان کا سراغ میں نے قومی زندگی کی حیات بخش تحریکوں میں پایا ہے۔ تمام عمر جہاں تک بن پڑا میری کوشش یہی رہی ہے کہ تحریر اور تقریر کے ذریعہ اور اپنے منصبی تعلیمی کام کی انجام دہی میں ان قدروں کی خدمت اور اشاعت کروں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان قدروں کے خدوخال کو نمایاں کرنے اور زندگی میں ان کے مقام کا تعین کرنے میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ یہ حکم لگانا میرا کام نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ قدریں اپنی جگہ پر بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور جب تک ہم انہیں اپنی انفرادی اور جماعتی زندگی میں عزّت کی جگہ نہ دیں گے زندگی سنور نہیں سکتی۔

مجھے اس بات کا اعتراف بھی کر لینا چاہیئے کہ میں نے جن قدروں کو ان افراد کی سیرت میں یا ان تحریکوں میں دیکھا اور اجاگر کیا ہے وہ شعروں کے انتخاب کی طرح خود مجھے 'رسوا' کرتا ہے۔ یعنی اس میں لازماً ایک حد تک ان قدروں کا عکس ہے جن کو میں خود زندگی کیلئے اہم سمجھتا ہوں یہی وہ "چراغ" ہیں جن کی روشنی میں ہم ایک صالح زندگی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور اگر کہیں خدانخواستہ یہ چراغ بجھ گئے جیسا کہ قوموں کی زندگی میں بار ہا ہوا ہے تو ہم اندھیرے میں بھٹکتے پھریں گے اور اخلاق کی صراط مستقیم سے دُور جا پڑیں گے۔ اس راہ سے ہٹ جانے کے بعد اگر ترقی ممکن بھی ہو تو وہ بے فیض اور بے معنی ہوگی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ جب شروع ہوئی تھی تو ایک اطالوی مدبر فرانسسکو نٹّی نے کہا تھا "یورپ کے چراغ ایک ایک کر کے بجھتے جاتے ہیں۔ خدا جانے یہ لمپ دوبارہ ہماری زندگی میں روشن ہو نگے یا نہیں"۔ آج دنیا میں جو ہیجان برپا ہے اور تباہی کی خوفناک طاقتوں کی یورش نے انسان کے مستقبل کو جس خطرے میں ڈالا ہے اس کے مقابلہ میں تو ۱۹۱۴ء کی جنگ اور اس زمانے کے مسائل بچّوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں!۔

اگر فی الحال دنیا کا ذکر چھوڑ کر ہم خود اپنی قومی زندگی کے رجحانات پر گہری نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی وہ قدریں جن پر زندگی کی شرافت قائم ہے خطرے میں ہیں۔ ان کی حفاظت جس قدر ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ ملک کی عام ذہنی اور اخلاقی حالت کو دیکھ کر بعض دفعہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ دو سو برس کی غلامی کے اثر نے قوم کے دل اور دماغ کو ایک حد تک مسخ کر دیا ہے اور ان میں سے خوب اور ناخوب کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ لیکن اس میں "حکمراں کی ساحری" کے علاوہ بہت سے راستہ دکھانے والوں کی ناعاقبت اندیشی اور راستہ چلنے والوں کی بے حسی اور جہالت کو بھی دخل ہے۔ گاندھی جی کی تحریک کے طفیل ہم نے آزادی کی جنگ میں یقیناً بہت سے شاندار کارنامے انجام دیئے اور اس طوفان نے چند غیر معمولی افراد کی تربیت کی اور ایک بہت بڑی تعداد کو کم سے کم عارضی طور پر خود غرضی اور تنگ نظری کی زنجیروں سے آزاد کر کے ایک بہتر تصورِ حیات کی جھلک دکھائی لیکن ایک آزاد قوم میں جو صفات عام ہونی چاہیئیں وہ ہم میں مستحکم نہیں ہو پائیں۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس آزادی کے حاصل کرنے میں عوام کی جدوجہد سے زیادہ گاندھی جی کی اخلاقی اور ذہنی عظمت اور ان کی قیادت کو دخل تھا۔ صحیح قدریں ہماری زندگی اور فکر میں ابھی تک یقین کے ساتھ اپنی جگہ نہیں لے سکیں۔ لوگ سیاسی ہنگاموں کی رونق دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں یا محض کارخانوں کے دھوئیں میں انہیں قومی زندگی کا سراب دکھائی دیتا ہے یا سیاسی آزادی کا ڈھانچا قائم کر کے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ لیکن وہ غافل ہیں ان خوفناک حقیقتوں کی طرف سے جو ان کے چاروں طرف منڈلا رہی ہیں، ان نامبارک تحریکوں کی طرف سے جو ان کے روحانی اور اخلاقی توازن کو بگاڑ رہی ہیں، ان آندھیوں کی طرف سے جو اچھی قدروں کے چراغوں کو بجھانے کے درپے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں ورنہ روزانہ اخباروں کا مطالعہ ہی ایک سمجھدار شخص کے سکون خاطر کو ختم کر دیتا۔ ان کے دل ہیں لیکن وہ سوچتے نہیں ورنہ اختلاف تعصب اور تنگ نظری کی فضا جو بہت سے لوگوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے اور ہماری قدیم اور روشن تہذیب کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے انہیں مجبور کرتی کہ وہ اپنے دل و دماغ کو ٹٹولیں اور باہمی مخالفتوں اور تعصب کو بھلا کر ان میں رواداری فراخ دلی اور انسان دوستی کے بیج بوئیں اور ان نامبارک رجحانوں کو شکست دیں جو قومی زندگی اور اخلاق کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ بعض اعتبار سے ملک نے گذشتہ پندرہ سال میں کافی ترقی کی ہے زراعت میں صنعت و حرفت میں، آب پاشی میں، تعلیم اور صحت میں لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ تمام ترقی مجھے سطحی اور کم عیار معلوم ہوتی ہے جب تک اس کی بنیاد سچی اور اخلاقی قدروں پر نہ رکھی جائے؟ ہماری تہذیب اور مذہب نے، ہمارے ادب اور فلسفے نے، ہمارے شاعروں اور مفکروں نے، ہمارے فقیروں اور صوفیوں نے، ہمارے عوام کی شرافت اور امن پسندی نے صدیوں کی کوشش سے جو چراغ جلائے تھے اور صدیوں تک روشن رکھے تھے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک خوفناک آندھی کی جھپیٹ میں آگئے ہوں، جیسے وہ نہ لوگوں کے گھروں میں روشن ہوں نہ ان کے دلوں میں۔ مجھے ایک معلم کی حیثیت سے قدروں کا یہ گہن تمام دوسری کمزوریوں اور خرابیوں سے زیادہ کھٹکتا ہے اور زیادہ خطرناک

معلوم ہوتا ہے ۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی قوم عدل، شرافت اور اخلاق کی رسی کو مضبوط تھامے رہتی ہے تو اس کے لئے سیاسی اور سماجی آزادی اور مادی خوشحالی حاصل کرنا ممکن ہے لیکن اگر اس کی گرفت ان قدروں پر ڈھیلی پڑ جائے تو وہ دوسری چیزوں کو حاصل نہ کر سکے گی یا حاصل کرنے کے بعد جلد کھو دے گی۔ اس کی وجہ سے قومی زندگی کے اندر ایسی کشاکش پیدا ہو جاتی ہے کہ اس میں سکون اور توازن قائم نہیں رہ سکتا اور باوجود مادی خوش حالی کے نظر فریب دھوکے کے، اس کی کیفیت ایک درخت کی سی ہو جاتی ہے جس کی جڑیں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں ۔

اس ضمن میں ہمارے سامنے فوراً مقصد اور ذریعہ کا بنیادی سوال بھی آتا ہے ۔ ظاہر ہے دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں اور دونوں کا پاک ہونا لازم ہے بلکہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان میں دوئی نہیں بلکہ وحدت کی کارفرمائی ہے۔ لیکن اگر ہم ذریعہ کو وہ اہمیت دینے لگیں جو مقصد کا حصہ ہے تو یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔ آخر سیاسی آزادی، مادی دولت، صنعت وحرفت کی اہمیت کیوں ہے؟ وہ بجائے خود تو مقصود حیات نہیں۔ ان کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ ان سے کام لے کر انسان اپنی زندگی کو بنائے اور سنوارے، اپنی صلاحیتوں کو فروغ دے اور مذہب کی اصطلاح میں " زمین کو جو فسق و فجور سے بھر گئی ہے عدل اور انصاف سے معمور کر دے "۔ بقول انجیل مقدس کے " کیا فائدہ ہوگا انسان کو اگر وہ ساری دنیا کو حاصل کرے لیکن اپنی روح کی دولت کو کھو بیٹھے ؟ " مجھے اکثر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی انفرادی اور جماعتی خود غرضی کی کشمکش میں نہ صرف " روح کی دولت " کھو بیٹھیں بلکہ دنیا حاصل کرنے میں بھی ناکام رہیں ۔ ہماری مادی محرومیاں تو جہالت غریبی، بیماری، بے روزگاری کی شکل میں ظاہر ہیں ۔ اگر کسی ملک میں اوسط آمدنی ایک روپیہ روز سے بھی کم ہو، اوسط عمر ۳۵ سال کے قریب ہو، سترفی صدی سے زیادہ لوگ ان پڑھ ہوں، انہیں نہ کھانے کے لئے کافی اور مناسب غذا ملے، نہ پہننے کو کپڑا میسر ہو، نہ رہنے کو مکان ۔ اگر شہر اور گاؤں دونوں موجودہ تمدن کی بہت سی عام اور ضروری آسائشوں سے محروم ہوں، اگر ملک کی بہت بڑی اکثریت محض روزی کمانے کی کشمکش میں گرفتار ہو اور اسے زندگی کے دوسرے

امکانات کی طرف توجہ کرنے کے لئے نہ فرصت ہو نہ دل و دماغ۔ اگر کسی ملک میں ایسی صورت حال ہو تو یہ دعویٰ کیونکر کیا جائے کہ اس نے دنیا حاصل کر لی ہے؟ اب رہی روح کی دولت اس پر کس طرح حکم لگایا جائے۔ اول تو یہ ضروری ہے کہ ہم دنیاوی دولت اور روحانی دولت کے صحیح رشتہ کو پہچانیں۔ اہل مذہب اور اہل فلسفہ دونوں نے اکثر جسم اور روح، دین اور دنیا کو ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد سمجھا ہے۔ یعنی "اگر دنیا کی طرف توجہ کرو گے اور جسمانی ضرورتوں کی فکر میں لگے رہو گے تو دین ہاتھ سے جاتا رہے گا اور روح افسردہ ہو کر رہ جائے گی۔" لیکن یہ خیال در اصل صحیح نہیں۔ یہ تو ایک غلط قسم کی "بیمار روحانیت" کی ترجمانی ہے۔ جو قوم اپنی روح کی عفت اور دماغ کی جولانی کو قائم رکھتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ دنیاوی اعتبار سے پس ماندہ رہے۔ برخلاف اس کے اگر کسی قوم کی عام ذہنیت پر پس ماندگی اور بے ہمتی طاری ہو تو اس کا روحانیت کا دعویٰ سرے سے باطل ہے۔ زبورِ عجم میں مرید ہندی پیر رومی سے شکایت کے لہجے میں سوال کرتا ہے:

آسمانوں پر مرا فکر بلند　　　میں زمیں پر خوار و زار و دردمند

کارِ دنیا میں رہا جاتا ہوں میں　　　ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں

کیوں مرے بس کا نہیں کارِ زمیں؟　　　ابلہِ دنیا ہے کیوں دانائے دیں؟

پیر رومی کا جواب جسم اور روح کے اصلی تعلق کو معنی خیز اختصار کے ساتھ یوں واضح کرتا ہے

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود　　　بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود!

یعنی اگر اس کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ روحانی قدروں کو سمجھتا اور اپنی زندگی میں برتتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ انہیں اخلاقی اصولوں اور شرافتوں کو شمع راہ بنا کر اپنی دنیا کو نہ سنوار سکے۔ مادی اور روحانی کامیابی حاصل کرنے کے لئے مختلف یا متضاد صفتوں یا صلاحیتوں کی ضرورت نہیں۔ محنت، ایمان داری، کفایت، انصاف، معاملات میں سچائی، حق پرستی، انسان دوستی، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ دنیا اور عاقبت دونوں کو سنوار سکتی ہیں بشرطیکہ دنیاوی کامیابی کا تصور اس قدر تنگ اور کمینہ نہ ہو کہ اس کے لئے انسان کو ہر اچھی چیز، شرافت کا ہر اصول قربان کرنا پڑے۔ دنیا کے اس غلط تصور کے بارے میں اسلام

کے مفکر اور فلسفی علی مرتضیٰؑ کا قول ہے کہ "دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے!"

لیکن اس اصولی دلیل کو چھوڑ کر بھی اگر ہم ملک کی ذہنی اور اخلاقی آب و ہوا پر نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہماری روحانی دولت بھی خطرے میں ہے۔ دُور کیوں جایئے گذشتہ پچیس سال کے واقعات ہی کو دیکھئے جنہوں نے ہماری امید پروری کو سخت آزمائش میں ڈالا ہے۔ بنگال کے قحط میں پندرہ لاکھ سے زیادہ خدا کے بندے فاقوں سے سسک سسک کر مر گئے لیکن "کالی منڈی" کی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چشم فلک اور چشم انسان نے یہ تماشا دیکھا اور ضمیر عالم میں تہلکہ برپا نہ ہوا۔ بے شک حکومت نے حفاظتی تدبیریں اختیار کیں اور لوگوں نے چندہ جمع کیا لیکن یہ تو ایک فوری ردّ عمل تھا جس سے نہ سماج کے گناہ کا کفارہ ہوا نہ وہ قوم کی قلب ماہیت کی دلیل ہے۔

اس عرصے میں اہل دولت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ نفع خور سوداگر اور مہاجن ذخیرہ اندوزی کرتے اور موت کے اس ڈرامے سے نفع کماتے رہے۔ چاول اور گیہوں کے کھلیان اور رس گلّوں کی دوکانیں بھری رہیں اور لوگوں نے ان کے سامنے بے بسی کے عالم میں دم توڑ دیا۔ میں اپنی خوش فہمی اور ناسمجھی کی بدولت سمجھتا تھا کہ بنگال کی یہ قیامت لوگوں کی آنکھیں اور ان کے دل و دماغ کی تنگ کوٹھریاں کھول دے گی اور وہ یہ سمجھ لیں گے کہ اب شرافت اور دانش مندی کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور اپنی مادی اور تہذیبی زندگی کو بچانے کے لئے جد و جہد کا وقت ہے۔ کسے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ چند سال کے اندر اندر بنگال اور بہار، گڑھ مکتیسر اور دہلی پنجاب اور سرحد کے فساد اور خونریزی اور حیوانیت کے مظاہرے بنگال کے قحط کو بھی بھلا دیں گے۔ خیر قحط کو تو بہت سے لوگ "عذاب آسمانی" سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں (گو سائنس کے اس دور میں ایسا خیال کرنا غلطی ہے) لیکن بہر حال اس طرح بعض لوگوں کو ایک قسم کی جھوٹی تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ "ہم کیا کر سکتے ہیں۔ خدا کی مرضی ہی یہ تھی کہ فصلیں خراب ہو جائیں اور ملک میں کال پڑ جائے۔" لیکن خوں ریزی اور انسان دشمنی جو آزادی کی ہم رکاب بن کر آئی اس کے لئے تو اس قسم کا جھوٹا جواز بھی نہیں مل سکتا۔ اس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہماری تہذیب اور شرافت محض ایک دھوکا یا دکھاوا

تھی کہ ذرا سے اشتعال پر وہ خونخوار درندے نکل پڑے جو ان "انسانوں" کے اندر چھپے ہوئے بیٹھے تھے یا ہمارا اخلاق اور روحانیت کا دعویٰ محض ایک ملمع تھا کہ آگ کی ایک ہی آنچ میں غائب ہوگیا اور اندر سے کم عیار دھات نکل آئی! ایں اقبال کے ان اشعار کو، جن میں تہذیب حاضر پر چُبھتا ہوا طنز ہے یہ سمجھ کر پڑھا کرتا تھا کہ ان کا وار مغرب کی قوموں پر پڑتا ہے خود ہم پر نہیں اور اس سے ایک قسم کا افسردہ اطمینان حاصل ہوتا تھا:

انساں چو رُخ زغازۂ تہذیب برفروخت	خاکِ سیاہِ خویش چو آئینہ وانمود
پوشید پنجہ را نہ دستانۂ حریر	افسونِ قلم شد و تیغ از کمر کشود
ایں بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت	رقصید گردِ او بہ نوا ہائے چنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید	جز "یسفک الدّماء خصیمٌ مبین" نبود

لیکن ان سب واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا ملک جس کو اپنی قدیم تہذیب اور امن پسندی پر ناز رہا ہے، اس الزام سے بری نہیں ہو سکتا۔ نگاہ حقیقت شناس میں اٹیم بم بنانے اور گرانے والوں میں اور فرقہ وارانہ جنون سے حواس باختہ ہو کر بچوں، عورتوں اور نہتے مردوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں میں کوئی فرق نہیں۔ جو بات غلط ہے، خلاف انسانیت ہے، رحم اور ہمدردی کے جذبات کے منافی ہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اتنی ہی قابل گرفت ہے خواہ اس کی وجہ سے ایک شخص پر ظلم ہو یا پوری قوم پر، چند سو آدمیوں کا خون ہو یا چند ہزار کا یا چند لاکھ کا۔ تالمود اور قرآن شریف دونوں میں لکھا ہے کہ جو شخص ایک آدمی کا خون ناحق کرتا ہے وہ گویا تمام انسانوں کا خون کرتا ہے اور جو شخص ایک آدمی کی جان بچاتا ہے وہ گویا تمام انسانوں کی جان بچاتا ہے! لیکن جنگ اور تشدد کے اس دور میں لوگوں کا اخلاقی احساس اس قدر کند ہو گیا ہے کہ اول تو انہیں ایسے واقعات کی نزاکت اور اہمیت کا، ان کے اخلاقی اور معاشی ردّعمل کا پورا اندازہ ہی نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو عارضی۔ ان کے متعلق اخباروں میں چند "بیان" شائع کر کے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فرض پورا ہو گیا اور اکثر بیانوں میں بھی انصاف کی بجائے جنبہ داری کارفرما ہوتی ہے مگر کیا اثر ہو سکتا ہے

معقول بیانوں کا بھی اس مسلسل زہر کے مقابلے میں جو بہت سے اخباروں اور رسالوں وغیرہ میں شائع ہوتا
رہتا ہے اور عوام کی ذہنی خوراک بنتا ہے اور عام طور پر تو لوگ احتساب نفس کرنے کی بجائے
دوسری جماعتوں یا فرقوں پر الزام لگانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور خود "اپنی"
جماعت کی ذمہ داری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے تو ہم اس قسم کے اختلافات کی
ذمہ داری حکومت پر رکھ کر ایک حد تک اپنے ضمیر کو تسکین دے لیتے تھے۔ اب تو وہ سہارا بھی
باقی نہیں رہا! آزادی حاصل ہونے کے اتنے سال بعد اب تک ہندوستان اور پاکستان دونوں
میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہر شریف اور حساس آدمی کا سر شرم سے جھک
جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سیاسی جدوجہد کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی بعض حلقوں
نے عوام کے جذبات کو سالہا سال تک اس درجہ بھڑکایا اور تنگ نظری کا اس طرح پرچار کیا
کہ عام لوگ جو صدیوں سے امن اور آشتی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس زہر کا مقابلہ نہ کر سکے۔
اگر ملک کے با اثر لوگ اور جماعتیں نیک نیتی اور یک جہتی کے ساتھ ان کے خیالات کو بدلنے کی
کوشش نہ کریں گی تو اخلاقی اصلاح کی یہ مہم ہرگز سر نہیں ہو سکتی۔ اس ذہنیت کو بدلنا اس درجہ
ضروری ہے کہ اس کے مقابلے میں مختلف جماعتوں کے سیاسی اغراض اور مفاد اور ان کی
چالبازیاں بلکہ اقتصادی اور صنعتی پروگراموں کی تکمیل بھی ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ بالغوں کی ذہنیت
بدل سکے یا نہ بدل سکے، ضرورت یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی صحیح رہبری کی جائے تا کہ آئندہ
نسلوں کی فلاح اور بہبود خطرے میں نہ پڑے یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان کے دل اور دماغ
کا رشتہ ان ابدی قدروں کے ساتھ جوڑا جائے جن پر انسانی شرف کا دار و مدار ہے!

یہ قدریں کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب ضمناً تو اوپر آچکا ہے لیکن نامناسب معلوم ہوتا
ہے کہ اس کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ ایسا کرتے ہوئے ایک حد تک تامّل
ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک طرح سے یہ قدریں اتنی صاف اور بدیہی ہیں کہ ان کی تشریح تحصیل حاصل
معلوم ہوتی ہے اور دماغ یہ کہتا ہے کہ ایسی باتیں دہرانے سے کیا حاصل جو ہر شخص کو معلوم ہیں

یا ہونی چاہئیں، لیکن دنیا کی اور ملک کی ذہنی اور اخلاقی آب وہوا کچھ اس طرح بدلی ہے کہ بہت
سے لوگوں کے لئے خرد کا نام جنوں اور جنوں کا نام خرد ہو گیا ہے اور اب اندیشہ "تحصیل حاصل" کا
نہیں بلکہ یہ ہے کہ شاید بہت سے لوگ اپنے سیاسی اغراض اور جماعتی اقتدار کی مصلحتوں کے چکر میں
ان قدروں ہی کو چیلنج کریں اور سرے سے ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اور یہ سوال اٹھائیں کہ
اس زمانے میں ان غیر مناسب اور فرسودہ قدروں پر کیوں زور دیا جا رہا ہے! یہ آدرش پسندی کا نہیں
"واقعیت" کا زمانہ ہے جس میں "لفاظی" کام نہ دے گی۔ اس میں تو عقل دنیا دار کی ضرورت ہے۔

میں جن قدروں پر زور دینا چاہتا ہوں ان کو ہمارے ملک میں اور دنیا کے اس خطے میں
بالعموم کوئی شخص یا جماعت واضح طور پر مسترد نہیں کرتی لیکن بہت سوں کا عمل ان کے لفظی دعووں
کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ اس لئے یہ وقت سختی کے ساتھ تنقید اور احتساب نفس کرنے کا ہے، سستی
مقبولیت کی تلاش کا نہیں ۔ ذہنی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ اہل فکر اپنی سمجھ کے مطابق ایمان
داری کے ساتھ سچی بات کہیں خواہ وہ دوستوں اور عزیزوں کو ناگوار ہو یا غیر اس پر اعتراض کریں،
یا ارباب اقتدار اس کو دبانے کی کوشش کریں۔ جو شخص حق کی خاطر، یعنی جس بات کو وہ ایمانداری کے
ساتھ حق سمجھتا ہے، اقلیت میں شامل ہونے کو تیار نہیں بلکہ ہجوم کا سہارا ڈھونڈتا ہے وہ نہ صرف بزدل
ہے بلکہ خود اپنے ساتھ غداری کرتا ہے جو دنیا کی غداریوں میں سب سے زیادہ ذلیل چیز ہے! لہذا
بااصول افراد کا فرض ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں اور جماعت کا کام ہے کہ
فکر اور زبان پر پابندیاں لگائے بغیر انہیں اس کا موقع دے۔ جس سماج میں آزادی خیال سلب
ہو جائے اس کی عقلی اور اخلاقی اصلاح اور ترقی کا امکان ہی باقی نہیں رہتا!

میرا عقیدہ ہے کہ صالح انسانی تہذیب اور اخلاق کی بنیاد اس مرکزی جذبے پر قائم ہے
کہ ہر انسان ایک انمول شخصیت کا امین ہے اور اس کی نشوونما اور پوشیدہ صلاحیتوں کی تربیت
کرنا فرد اور جماعت دونوں کا فرض ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی اصل دولت نہ روپیہ ہے نہ
کارخانے، نہ مکان، نہ سازوسامان، نہ تمدن کے مادّی اور مشینی آلات۔ اس کی اصل دولت

افراد ہیں اور افراد کی دولت، ان کے دل و دماغ کی جولانی، ان کے دل کا گداز، ان کی محرم گرمی ان کی قدر شناسی، ان کا سماجی احساس، ان کی خوب تر کی جستجو، ان کا جذبہ تلاش و تحقیق۔ اقبال نے اس دولت کی تفسیر اپنے ساقی نامہ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے اور یہی وہ متاع فقیر ہے جس نے اس شاعر کو فقیری میں امیر بنا دیا تھا، جو ہر شخص کو امیر بنا سکتا ہے اگر اس میں اس متاع بے بہا کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہو!

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں	مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا گداز	مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری	امیدیں مری جستجوئیں مری
مرادل، مری رزم گاہِ حیات	گمانوں کا لشکر، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر	اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لُٹا دے اسے
لُٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

جس سماج میں فرد کی قدر کی جاتی ہے (بعض کی نہیں بلکہ سب کی بحیثیت انسان کے، کالے اور گورے کی، غریب اور امیر کی، معمولی اور غیر معمولی کی، ذہین اور کند ذہن کی، گوشہ نشین اور آرائش محفل کی۔ اور ان کی تربیت کے لئے ایک سازگار ماحول مرتب کرنے کی فکر کی جاتی ہے، اس کی پرامن ترقی اور فلاح یقینی ہے۔ لیکن جہاں باہمی تعلقات کی بنیاد نفرت، تعصب اور تنگ نظری پر رکھی جائے، جہاں چند کے فائدے کے لئے باقی سب کا نقصان گوارا ہو، جہاں افراد کی ذاتی صلاحیت کی بجائے ان کے نسل، خاندان، رنگ اور مذہب کے لیبل دیکھے جائیں اور ان کے مطابق سلوک کیا جائے وہ سوسائٹی کبھی ایک صالح اور عادل سوسائٹی نہیں بن سکتی۔

اس لئے میرے نزدیک انسان کی سب سے بڑی صفت 'انسانیت' ہے۔ یعنی تمام انسانوں کی عزت کرنا کیونکہ وہ انسان ہیں، ان کی فلاح و بہبود میں اپنی بہتری کی تلاش

کرنا، اس بات کا پر خلوص یقین کہ (تقریباً) ہر شخص کے اندر نورِ الٰہی کی چنگاری پوشیدہ ہے، جس کو محنت، صبر اور محبت کے ساتھ جگانا سماج کا مشترک فرض ہے۔ اکثر عقل کی آنکھ اور مشاہدے کی قوت اس چنگاری کو نہیں دیکھ سکتی۔ کبھی کبھی ماہر نفسیات کی نظر بھی اس تک نہیں پہنچ پاتی لیکن دل اسے محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ محبت کا اسمِ اعظم اس میں پوشیدہ ہو۔ یہ محبت کی کنجی ان سات پردوں کو ہٹا سکتی ہے جن کے اندر یہ چنگاری چھپی ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ لوگ جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں "نورِ الٰہی کی چنگاری" کے الفاظ سے بدکیں۔ لیکن وہ بھی یہ مان سکتے ہیں کہ ہر فرد میں کوئی نہ کوئی ایسی صلاحیت ہوتی ہے جس کی مناسب تربیت سے نہ صرف اس کی اپنی شخصیت مالا مال ہو سکتی ہے بلکہ وہ سماج کا ایک مفید کارکن بھی بن سکتا ہے۔

دراصل یہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہماری تمام سیاسی، سماجی، اقتصادی اور اخلاقی تحریکیں پرکھی جا سکتی ہیں۔ جو تحریک فرد کا احترام کرتی ہے، اس کی نشوونما میں مدد دیتی ہے، ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ جو تحریک فرد کی آزادی پر بے جا پابندیاں لگاتی ہے یا اس کے دل و دماغ کو تنگ کرتی ہے وہ خطرناک ہے خواہ اسے کیسے ہی دل فریب روپ میں پیش کیا جائے۔ ہٹلر کے سیاسی اور نسلی فلسفے کے خلاف انسان کے اخلاقی احساس نے اس وجہ سے بغاوت کی کہ وہ وحدتِ انسانی کے تصوّر اور شخصیت کے احترام کو رد کر کے نسل اور رنگ اور خون کو فضلیت کا معیار قرار دیتا تھا اور فرد کی حیثیت محض حکومت کی مشین کے ایک پرزے کی تھی جس کی قوت محرکہ کسی مطلق العنان حاکم کی مرضی ہو۔ نازی فکر اس بنیادی اصول ہی سے انکاری تھا جس کی قرآن کی زبان میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ "تم میں افضلیت صرف ان کو حاصل ہے جو نیک عمل اور پرہیزگار ہیں"۔ ممکن ہے اس قسم کے نسلی فلسفہ کے ذریعہ نفرت اور تعصب کے جوش اور یک جہتی میں کوئی قوم عارضی طور پر دولت یا سیاسی اور فوجی اقتدار حاصل کر لے یا ایک جماعت دوسروں کی حق تلفی کر کے اپنے لئے ایک ترجیحی حیثیت حاصل کرے لیکن اس کامیابی میں اس کے افراد اپنے ایک بہت بڑے

شرف سے محروم جاتے ہیں۔ یعنی انہیں یہ چیزیں اپنے ضمیر اور عقیدے اور عمل کی آزادی کو تج کر حاصل ہوتی ہیں۔ کیسے نہ کہوں کہ ان داموں یہ سودا بہت مہنگا ہے؟

مگر یاد رہے کہ اخلاقی اندھیر گردی کے اس زمانے میں یہ خرابی اور خطرہ صرف جرمنی یا اٹلی یا روس یا کُلّیت پسند ملکوں تک محدود نہیں بلکہ مختلف شکلوں میں اور کم و بیش دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے خواہ وہ کتنی ہی بلند آہنگی سے آزادی، جمہوریت اور انفرادی حقوق کے احترام کا دعویٰ کیوں نہ کریں۔ برطانیہ اور امریکہ جمہوری ملک ہیں لیکن ان کا سیاسی اور سماجی نظام سرمایہ داری اور نسلی امتیاز کی بنیادوں پر تعمیر ہوا تھا اور ابھی تک بہت کچھ انہیں پر قائم ہے۔ اس لئے وہ بھی بڑی حد تک افراد کی پوری قدر نہ کرنے کے اس جرم میں شریک ہیں جو ان کی طرف سے فاشسٹ یا کمیونسٹ ملکوں پر لگایا جاتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں بیشتر افراد کی حیثیت مقصد کی نہیں رہتی بلکہ وہ دوسرے زیادہ چالاک، زیادہ دولتمند یا زیادہ طاقت ور لوگوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اور اس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے جو مذہب کی تعلیم نے انسانوں کے لئے مقرر کی ہے اور جس پر کانٹ نے اپنے فلسفہ میں خاص طور پر زور دیا ہے یعنی کوئی انسان محض ایک ذریعہ نہیں دوسروں کے مقاصد حاصل کرنے کا بلکہ بجائے خود ایک مقصد ہے۔" پھر نسلی تعصب وہ لعنت ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔ امریکہ میں اس نے صدیوں سے حبشیوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے اور باوجود اس کے کہ اب مقابلتہً ان کی حالت بہت بہتر ہے لیکن بدسلوکی کی یہ المناک کہانی ختم نہیں ہوئی۔ برطانوی کومن ویلتھ اس کو جنوبی افریقہ کی خلاف انسانیت پالیسی کی شکل میں انگیز کرتی رہی ہے اور اس کے بعض دوسرے حصوں میں بھی رنگ اور نسل کی بنا پر انسانوں میں جو امتیاز کیا جاتا ہے وہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی نفی کرتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں صدیوں سے اچھوتوں کے ساتھ نہایت درجہ ظلم اور بے انصافی کی گئی ہے۔ اگرچہ گاندھی جی کی تحریک نے اور بعض دوسرے اثرات نے قومی ضمیر کو بیدار کیا ہے اور قانوناً ان کو مساوی حیثیت حاصل ہو گئی ہے

لیکن ابھی تک عملاً کافی حد تک بدسلوکی جاری ہے۔ اس کے علاوہ ذات پات کا بھید بھاؤ اور ہماری جماعتی زندگی پر اس کا تسلط ہمارے جمہوری دستور اور دعووں کی ہنسی اڑاتا ہے۔ دراصل فرق شدت اور انداز اظہار کا ہے ورنہ بیشتر قومیں "شیشے کے گھروں" میں رہتی ہیں اور انہیں ایک دوسرے پر پتھر پھینک کر اپنے دل کو جھوٹی تسکین یا دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی ملک یا قوم کے اصلی دشمن دوسرے ملک اور قومیں نہیں بلکہ خود اپنی بداعمالیاں اور ظلم اور اخلاقی گمراہی ہے۔ ان کے خلاف سب کو مل جل کر جنگ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یاد رہے کہ دنیا میں جہاں کہیں دکھ درد، ظلم اور بے انصافی ہے ہم اس میں شریک ہیں۔ بحیثیت مجرم کے بھی اور مظلوم کے بھی، اور ایسے ہی ہم شریک ہیں حسن، خیر اور حق کے ان مظاہر میں جو ہماری مشترک دولت ہیں خواہ وہ کسی زمانے میں یا دنیا کے کسی حصے میں مرتب ہوئے ہوں۔ جب ہم انسان کی ذہنی اور اخلاقی میراث کی اس وحدت کو اور خود انسانیت کی یک جہتی کو پہچاننے لگیں گے اور دوسروں کی خودی کا احترام اسی اہتمام سے کریں گے جس طرح اپنی خودی کا کرتے ہیں یا کرنا چاہیئے!، اس وقت زندگی کے معنی ہم پر روشن ہونگے اور آزمائش کے اس نازک دور میں جب انسان واقعتاً موت اور حیات کے نازک دوراہے پر کھڑا ہے۔ آندھیوں کا ساتھ دینے کے بجائے چراغوں کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھیں گے۔

اس وقت ہمارے دیس میں ترقی پسندی اور رجعت پسندی، رواداری اور تعصب کی قوتوں کے درمیان ایک رسہ کشی ہو رہی ہے۔ گو گاندھی جی نے اپنی دوراندیشی کی بدولت اپنی سیاسی تحریک کے ساتھ بہت سی تعمیری تحریکیں بھی اٹھائیں اور انہیں ان میں کافی کامیابی ہوئی، لیکن قومی جدجہد زیادہ تر سیاسی آزادی کی جنگ کے لئے وقف رہی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد اب گذشتہ دس سال میں ایسے منصوبے بنائے گئے ہیں اور اقتصادی اور سماجی تدبیریں اختیار کی گئی ہیں جن کا مقصد عوام کی زندگی کو بہتر بنانا ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ارباب غرض و اختیار نے نئے اصولوں اور نئے تصور حیات کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے

ہے جیسے گاندھی جی کا فیض اور پنڈت نہرو کی شخصیت اور قیادت ایک پوری قوم کو بادل ناخواستہ اس اعلےٰ منزل کی طرف لے جا رہی ہے اور ہم خود اپنے اندر وہ صفات پیدا نہیں کر سکے جو اس یاترا کے لئے ضروری ہیں۔ تاہم اس وقت جو قومی پالیسی کارفرما ہے اس سے کچھ امید ہوتی ہے کہ اب قومی زندگی کے حقیقی مسائل کی طرف توجہ ہوگی جو مادی اور عملی بھی ہیں اور ذہنی اور اخلاقی بھی۔ لیکن اس نئی روش کے دوش بدوش بعض ایسے اثرات بھی زور پکڑ رہے ہیں جو قوم کو آگے کی طرف لے جانے کی بجائے پیچھے کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں اور ابھی تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ چل کر ملک کا نقشہ کیا بنے گا۔ کیا اس دیس کے چارسو کروڑ انسان باہمی مخالفتوں اور اختلافات کے طوفانی سمندر میں سے گزرنے کے بعد زبان، نسل، رنگ، مذہب اور ذات پات کے بھید بھاؤ کو رد کر کے دوستوں اور بھائیوں کی طرح مل جل کر شرافت اور معقولیت کی زندگی بسر کرنا اور ایک دوسرے کی جان اور عزت اور زبان اور مذہب کا پاس کرنا سیکھیں گے یا تنگ نظری اور تنگ دلی کی دلدل میں پھنس کر اپنے روشن مستقبل کے خواب کو جھٹلائیں گے۔ اس سوال کا جواب تو وقت دے گا لیکن جن لوگوں کے دل اور دماغ میں عقل، انصاف اور احساس کے چراغ روشن ہیں ان کا راستہ بالکل صاف ہے۔ وہ صرف اسی مستقبل کے لئے جدوجہد کریں گے جس میں ہر انسان دوسرے انسانوں کی انسانیت اور حقوق کا احترام کرے اور جو اچھی چیزیں اپنے لئے چاہے وہی دوسروں کے لئے عزیز رکھے۔ یہی تقاضہ ہے انصاف اور رواداری کا اور یہی عقل اور مصلحت اندیشی کا۔ اس کے سوا جتنے راستے ہیں وہ تباہی اور زوال کی طرف لے جانے والے ہیں۔

بعض ملکوں میں ایسی ترقی پذیر تحریکیں بھی قوت پکڑ رہی ہیں جن کا مقصد سیاسی آزادی اور مساوات کے ساتھ ساتھ سماجی اور اقتصادی مساوات قائم کرنا اور اس خلیج کو پاٹنا ہے جو 'عوام' اور 'خواص' کے بیچ میں حائل ہے وہاں بہت سی تدبیریں اختیار کی گئی ہیں تاکہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو ختم کیا جائے اور سوشل سروس کا زیادہ وسیع اور موثر انتظام ہو، تعلیم کیلئے سہولتیں بھی زیادہ

عام کی گئی ہیں اور ایک حد تک لوگوں کو اظہار خیال کی آزادی حاصل ہوگئی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ پانی کا بہاؤ صرف ایک ہی طرف نہیں بلکہ بعض رجحانات اس کے خلاف بھی کام کر رہے ہیں ۔ لیکن مجموعی حیثیت سے ، باوجود رکاوٹوں اور رجعت پسندی کی قوتوں کے میلان اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ آزادی اور سماجی انصاف کے رجحانوں کو زیادہ وسیع کیا جائے ۔

جو لوگ اچھی قدروں کو پہچانتے ہیں وہ ایسی تحریکوں کا خیر مقدم کریں گے جن کا مقصد فرد کی خودی کا احترام اور اس کو مستحکم بنانا ہے ۔ اس زمانے میں بعض ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں جو عصر حاضر کے انسان کی انفرادیت کو چیلنج کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان تحریکوں کی اہمیت پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے ۔ صنعت و حرفت کی تنظیم مقامی دستکاریوں کی منزل سے گذر کر قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر ہونے لگی ہے ۔ نقل و حرکت کی جدید سہولتوں نے وقت اور فاصلہ کی اہمیت کو زائل کر دیا ہے ۔ منصوبہ بندی کا تصور پورے ملک پر چھا گیا ہے ۔ اس قسم کی ترقیوں کا لازماً تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی جدوجہد اور سماجی مقصدوں اور منصوبوں کو مقدم سمجھا جائے اور فرد کو موخر ۔ جہاں کاروبار کی وسعت بین الاقوامی ہو اور تجارتی کمپنیاں ملکوں کی حدوں کو توڑ کر ساری دنیا میں پھیل جائیں ، ایک ایک کارخانے میں ہزاروں مزدور کام کریں ریلیں ، موٹریں ، ہوائی جہاز زمین کی طنابوں کو ملا دیں ، تعلیمی ادارے ، لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے اخبار ، رسالے اور کتابیں ، ریڈیو اور فلم لوگوں کے دماغ کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے ہوں ، جہاں سِول زندگی میں فوجی زندگی کی سی یکسانیت اور تنظیم پیدا ہو جائے ۔ وہاں بغیر کسی خاص کوشش کے بھی فرد کے لئے اپنی شخصیت کا توازن اور اپنی ذہنی اور جذباتی دیانت اور آزادی کو قائم رکھنا مشکل ہے ۔ وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ جماعت کے رنگ میں رنگا جائے جس طرح بعض پرندے اور چوپائے اور دوسرے جانور گرمی اور جاڑے میں اپنا رنگ بدل کر ماحول کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں ۔ امریکہ میں سوشیولوجی کے ایک ماہر نے اپنی کتاب Organization man میں اس نئے انسان کی تصویر کھینچی ہے جو کبھی اپنے گرد و پیش کی جماعت یا گروہ کے قدروں اور

نداروں سے اختلاف نہیں کرتا۔ کبھی اپنی شخصیت کو ان کے مقابلے میں نہیں لاتا۔ وہ ان کی زبان بولتا، ان کا لباس پہنتا، ان کے سے خیالات رکھتا ہے اور اسی طرح ایک اچھے یار باش آدمی کی شہرت حاصل کر کے اسی کو اپنی ترقی کی سیڑھی بناتا ہے۔ اس کی شخصیت کی عمارت میں کوئی کمرہ کوئی مرکز ایسا نہیں ہوتا جسے وہ اپنا کہہ سکے، جہاں سماج کی خوشنودی اور ناخوشی کا حکم نہ چلے بلکہ اس کے اپنے ضمیر اور دل و دماغ کی حکمرانی ہو۔ یہ خطرہ ہر قسم کے سماج اور سیاسی نظام میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جہاں "کُلّیت" کی کارفرمائی ہے وہاں بہرحال فرد سماج کا تابع ہے۔ لیکن جمہوریت بھی اکثر "اوسط" کی قدر ہے، "اعلیٰ" کی پوچھ نہیں کیونکہ عام لوگ ایسے شخصوں کی طرف سے بدگمان ہوتے ہیں جو علم یا قابلیت یا اخلاق میں عام معیار سے بہت بلند ہوں۔ اس لئے ہمارے زمانے کا ایک مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ اس پیچیدہ نظام میں فرد کو اس کا صحیح مقام کس طرح حاصل ہو۔ در اصل ہر وہ تحریک خطرناک ہے جو فرد کی اہمیت کو کم کرے، خواہ وہ کسی شکل میں نمودار ہو۔ اور کتنی مختلف شکلوں میں اس نے اپنا سر اٹھایا ہے! کبھی وہ سرمایہ داری کے بھیس میں انسان کو، جسے بجائے خود ایک مقصد ہونا چاہیئے، دوسروں کے لئے ذریعہ یا آلۂ کار بنا دیتی ہے، کبھی شہنشاہیت کے نشے میں چور ہو کر کمزور قوموں کی محرومی اور حق تلفی کا سبب بنتی ہے، کبھی وطن کا لباس پارسائی پہن کر افراد کی عقل پر شب خون مارتی ہے، کبھی نسل اور رنگ کا تعصب بن کر دنیا کے امن کو خطرے میں ڈالتی ہے، کبھی فرقہ پرستی کا جنون بن کر صدیوں کی اخلاقی اور تہذیبی میراث کو تباہ کرتی ہے، کبھی جماعت کو حیوانی قوت کا غرور دلا کر فرد کی آزادی پر چھاپہ مارتی ہے اور کبھی افراد کی خود غرضی اور مطلب پرستی کو ابھار کر جماعت کی یکجہتی اور استحکام کو توڑتی ہے جو دیکھنے میں جماعت کی بیخ کنی ہے لیکن در اصل اس کی چوٹ بھی فرد ہی پر پڑتی ہے۔ غرض اس کے ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ زہریلا۔ یہی کشمکش جو انصاف اور ظلم میں ہمیشہ ہوتی رہی ہے حق و باطل کی اصلی جنگ ہے جو آج بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری ہے، ہندوستان میں اور ساری دنیا میں!

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی!

"شبیری" ذہنیت کی عظمت یہ ہے کہ وہ ہر انسان کی واقعی اور امکانی انسانیت کا احترام کرتی ہے اور جو قوتیں اس کی تحریک کی درپے ہیں، اس کی آزادی ضمیر و عمل کو سلب کرنا چاہتی ہیں ان کا بے خوف ہو کر مقابلہ کرتی ہے اور اس راہ میں کسی قیمت کو گراں، کسی قربانی کو ناممکن نہیں سمجھتی۔ جماعت کی آستینوں میں بت چھپے ہوں مگر وہ حکم اذاں کا احترام اور اس کی تعمیل کرتی ہے۔ برخلاف اس کے "انداز کوفی و شامی"، کتنے ہی مختلف بھیس اختیار کریں سب کا مشترک مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے حقیقی شرف سے محروم ہو جائے، وہ سب کی بھلائی میں اپنی بھلائی، سب کی ترقی میں اپنی ترقی تلاش نہ کرے بلکہ دوسروں کا حق مار کر اپنے نفس کو موٹا کرے اور جبر کے ذریعہ حق کو ناحق تسلیم کرائے۔ انیسویں صدی میں خطرے کی یہ گھنٹی سرمایہ داری نظام کی دست برد کی وجہ سے بجی تھی۔ بیسویں صدی میں بہت سے دوسرے اثرات کی وجہ سے اس کی پکار اور تیز ہو گئی ہے۔ اس خطرے کا مقابلہ بس اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ خودی کو عقل اور عشق دونوں کے ہتھیاروں سے محکم کیا جائے تاکہ اس کے قدم شرافت، انصاف، امن اور خودداری کے راستے سے نہ ڈگمگائیں۔

لیکن خودی کی پاسداری کے آداب میں ایک دل چسپ مقام آتا ہے کوئی شخص اپنی خودی کی پاسداری نہیں کر سکتا جب تک وہ دوسروں کی خودی کی پاسداری میں بھی وہی خلوص اور اہتمام نہ دکھائے۔ اس طوفان میں سے صرف اپنی کملی بچا کر بھاگ نکلنا ممکن نہیں، اس میں دوسرے ڈوبتوں کو بچانا بھی ایک ناگزیر فرض ہے۔ اس میں یا سب ڈوبیں گے یا سب تریں گے۔ بات یہ ہے کہ ہر فرد کی خودی ایک لحاظ سے تو ایک بالکل آزاد اور علیحدہ چیز معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کا اپنے ہم جنسوں کی خودی کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ ہر انسان کی شخصیت کا نقشہ ان دونوں کے باہمی ردعمل، اور ان کے تعلقات کے تانے بانے سے تیار ہوتا ہے یعنی جہاں اس کی خودی شمع محفل کی طرح سب سے جدا ہے وہاں وہ سب کی رفیق بھی ہے! اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں اس خیال کو یوں ظاہر کیا ہے کہ "خودی

کو ایسے ہی عمل سے تقویت حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی اور دوسروں، دونوں کی خودی کا احترام کرے۔"
جب کوئی شخص ایسا کام کرتا ہے یا کوئی جماعت ایسا طریقہ اختیار کرتی ہے جس سے دوسرے
افراد کی خودی ضعیف ہو یا وہ اپنے جائز حقوق سے محروم ہوں تو اس کا اثر دیر یا سویر خود ان پر بھی
پڑتا ہے جنہوں نے ایسا اقدام کیا تھا۔ شیخ سعدی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ تمام بنی آدم
ایک دوسرے کے اعضا ہیں اور اگر کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو باقی تمام اعضا بھی
بے چین ہو جاتے ہیں۔ اگر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں تو انفرادیت اور اجتماعیت کی اس کشمکش
اور تضاد کو حل کرنے میں مدد ملے جو اس زمانے کا سب سے مشکل مسئلہ
ہے

میں نے اب تک برابر اس امر پر زور دیا ہے کہ ہماری اجتماعی جدوجہد اور تنظیم کا مقصد
ہونا چاہیئے خودی کا استحکام اور اس کی مناسب تربیت۔ لیکن اس میں بھی افراط اور تفریط سے
بچنے کی ضرورت ہے۔ فرد اپنی شخصی آزادی کو اس درجہ اہمیت دے سکتا ہے کہ جماعت کی زندگی
اور اس کے رشتے خطرے میں پڑ جائیں۔ عصر حاضر کی "اجتماعیت" کے خلاف احتجاج کے طور پر اس زمانے
میں ایسی تحریکیں بھی پیدا ہوئی ہیں جو ان تمام پابندیوں کو مسترد کرنا چاہتی ہیں جو جماعتی زندگی افراد پر
قائم کرتی ہے۔ اس ضمن میں امریکہ کی ایک مقبول اور کامیاب ناول نویس این رینڈ کا نام ذہن
میں آتا ہے جس نے اپنے کئی ناولوں میں جو لاکھوں کی تعداد میں چھپے ہیں، انفرادیت کے بے پناہ
تقاضوں اور حقوق پر بہت شدت کے ساتھ زور دیا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ امریکہ کی نجات
اسی طرح ہو سکتی ہے کہ وہ فرد کو سماج کی پابندیوں سے بالکل آزاد کر دے اور اس کو صرف اپنی ذات
کی خاطر اور اپنی خواہش کے مطابق اپنی تمام صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع ملے۔ وہ انہیں
کمزوروں، نا اہلوں، غریبوں، محتاجوں کی امداد پر ضائع نہ کریں۔ اس نے پرانی "مسیحی قدروں"
یعنی رحم، ہمدردی، کمزوروں کی مدد اور پشت پناہی کو زوال کی علامت قرار دیا ہے، اس کے ایک ناول کا
میں شریک ہو کر وہ اپنی صلاحیتوں کا سراغ لگاتا اور اپنی ترقی کے موقعے نکالتا ہے۔ اسرار خودی
زندگی کے سکّہ کا ایک رخ ہے۔ رموز بے خودی دوسرا۔ اس لئے فرد معمولاً جماعت کے ساتھ برسرپیکار

نہیں ہو سکتا لیکن جب کبھی ایسا موقع آپڑے کہ جماعت اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اپنی جہالت اور حق ناشناسی کی وجہ سے اعلیٰ انسانی قدروں سے اپنا رشتہ توڑ دے اور حق کی بجائے تعداد کی پرستش کرنے لگے، اس وقت ایک حق شناس انسان کا فرض اس جرم میں شریک ہونا نہیں بلکہ اس کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ سچ کی کسوٹی (ابوالکلام آزاد کے لفظوں میں) "اس کے حامیوں کی کثرت نہیں۔ اس کے لئے تو اتنا کافی ہے کہ وہ سچ ہے" اور اسی وجہ سے اس کے پرستاروں کو اکثر تنہائی کی کڑیاں جھیلنی پڑی ہیں۔ اگر کسی قوم میں ایسے نازک موقع پر ایک بھی ایسا فرد پیدا ہو جاتا ہے تو وہ نگاہ حقیقت سنج میں پوری جماعت پر بھاری ہے۔ اس وقت وزن لوہے کی ترازو پر نہیں اخلاق کی ترازو پر کیا جاتا ہے۔ کس قدر شاندار ہے تنہا مسافروں کا یہ کارواں، جس کے قدموں نے سچ کے راستے میں کانٹوں کی پذیرائی کی اور اس کی خاطر اکثریت کی باطل پرستی کا ساتھ نہیں دیا، سقراط اور مسیح اور بدھ اور محمد، لنکن اور گاندھی اور آزاد! "فکر و نظر کی راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔"

میں نے شروع میں سوال اٹھایا تھا کہ ان مضامین میں قدر مشترک کیا ہے۔ اس کا جواب اب صاف ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں جو مضمون شامل ہیں ان میں سے بعض میں ان دوستوں، عزیزوں اور مشاہیر کی سیرت اور خیالات کی ترجمانی ہے جن کی شخصیت کا میرے دل اور دماغ پر بہت گہرا نقش ہے اور جن کا ساتھ زندگی کے نرم و گرم سفر کا ایک نہایت خوشگوار حصہ گذرا ہے۔ میرے سامنے ایک سوال یہ بھی تھا کہ کتاب میں صرف مشاہیر ہی کے ذکر کو شامل کروں جس میں پڑھنے والوں کو اس لئے دلچسپی ہو کہ وہ ان کو پہلے سے جانتے ہیں یا ان دوستوں اور عزیزوں کو بھی جنہیں شہرت عامہ حاصل نہیں ہوئی لیکن ان کی زندگی بہترین قدروں کی تفسیر کرتی ہے۔ مشاہیر کی سیرت نگاری کرنے والے تو بہت ہیں۔ لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ قومیں بنتی ہیں و اپنی جماعت کے ہر ممبر سے جو اپنے اپنے فن یا حلقۂ عمل میں امتیاز کا درجہ رکھتا ہے یہ حلف لیتا ہے کہ "میں نہ کسی دوسرے شخص کی خاطر اپنی زندگی بسر کروں گا، نہ کسی دوسرے شخص کو اپنے

لئے زندگی بسر کرنے دوں گا"۔ اس نقطۂ نظر میں اس حد تک صداقت ہے کہ انسان کو خود اپنے مقصدوں کا تعین سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے اور ان کے لئے ایمان داری کے ساتھ جدوجہد کرنی چاہیئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ان رشتوں اور تعلقات کو بھول جائے جو اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان ہیں اور جو ان کے حقوق اور فرائض دونوں کا تعین کرتے ہیں۔ "بزور شمشیر" دوسروں کے لئے زندگی بسر کرنا" ایک بات ہے اور اپنی مرضی اور خوشی سے دوسروں کے لئے زندگی بسر کرنا، ان کی خدمت کرنا، ان کے دکھ درد بٹانا، ان کی پیشانی سے محرومی کی سلوٹیں صاف کرنا دوسری بات ہے۔ جب ہم خودی کی تربیت کے لئے کوئی عملی پروگرام بنائیں تو اس کے سماجی رشتوں کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں! دراصل اس کی صحیح نشوونما اسی وقت ممکن ہے جب اس کا تعلق اعلیٰ سماجی مقصدوں کے ساتھ قائم ہو اور فرد جماعت کا ایک مستعد اور فرض شناس کارکن بن جائے۔ اس کے لئے دوسروں کے ساتھ مل کر جل کر کام کرنا اور رواداری اور لین دین کا سبق سیکھنا ضروری ہے اگر یہ صحیح ہے تو انفرادیت کی تلاش اور اس پر زور دینا اجتماعی تنظیم کی مخالفت نہیں۔ وہ سوسائٹی کی اہمیت کو کم نہیں کرتا - اس کا تو اتنا مطالبہ ہے کہ جماعت کی قوت اور تعداد سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ بھول جائیں کہ سماجی جدوجہد کا اصل مقصد جماعت کا تحفظ اور تقویت نہیں بلکہ افراد کی قوتوں کی تربیت، ان کی تہذیب نفس، ان کو ایک بہتر زندگی سے آشنا کرنا ہے۔ جماعت اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے کیونکہ خودی کی تکمیل جماعت سے باہر رہ کر نہیں ہو سکتی پس اس معنی میں یہ کہنا ٹھیک ہے کہ

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ‌ ‌ ‌ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

فرد کی ابتدائی تربیت جماعت کی آغوش میں ہوتی ہے۔ اسی کی ذہنی اور اخلاقی تحصیلات سے یعنی اپنی سماجی میراث سے، وہ اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ اسی کے کاروبار میں اور زندگی سنورتی ہے ان نیک اور شریف انسانوں کی برکت سے جو اپنی حریم ذات میں خدا ترسی، انسان دوستی اور سچائی کی شمع روشن رکھتے ہیں اور گمنامی کے اندھیرے میں رہ کر بھی روشنی پھیلاتے

ہیں۔ان کی یاد کو تازہ رکھنا، ان سے دوسروں کو روشناس کرنا، مشاہیر کی تصویر کشی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کسی بڑے آدمی کی مثال عام لوگوں کے سامنے رکھی جاتی ہے تو ان میں سے اکثر میں اپنی بے بسی اور کم مائگی کا احساس پیدا ہوتا ہے "گاندھی جی تو مہاتما تھے بھلا ہم ان کی کیا برابری کر سکتے ہیں؟ مولانا آزاد کا اور ہمارا کیا مقابلہ؟ گوتم بدھ کے تیاگ کا کیا کہنا لیکن اسے دور ہی سے پرنام کرنا کافی ہے۔" لیکن جب چھوٹے اور گمنام لوگ ان قدروں کی جوت جگائیں اور اپنی کمزوریوں اور اپنے ماحول کی مجبوریوں سے بلند ہو کر دکھائیں تو اس سے عام لوگوں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے کہ ہم بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کو کتاب میں شامل کرنا ضروری سمجھا۔ کچھ مضامین میں ان ابدی قدروں کا ذکر ہے جن کی تفسیر ایسے مردانِ خدا کی زندگی اور تعلیم میں پائی جاتی ہے جن کے سرچشمۂ فیض سے عالم انسانیت نے اپنی روحانی پیاس بجھائی ہے۔ بعض کا تعلق ملک کے عام تعلیمی، سیاسی اور تہذیبی مسائل سے ہے جو ماضی کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ حال کی آب و ہوا میں پلے اور بڑھے اور مستقبل کے بنانے میں ان کا ہاتھ ہے۔ ان میں بھی کسی نہ کسی طرح انہیں قدروں سے بحث کی گئی ہے۔ یہی قدریں انسان کی زندگی کی شاہراہ کا چراغ ہیں لیکن اس زمانے کی گود میں بہت سی خوفناک آندھیاں پرورش پا رہی ہیں اور ہر انسان کا فرض ہے کہ آندھی کی یورش میں ان چراغوں کو نہ بجھنے دے۔ اس کتاب میں زیادہ تر ایسے ہی انسانوں کا ذکر ہے جنھوں نے آندھی میں اپنے اپنے چراغوں کو روشن رکھا ہے اور یہی اس کتاب کے نام کا جواز ہے!

آج صبح جب میں بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں اخبار میں خبر آئی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ روسی سائنس دانوں نے ایک آدمی کو بیرونی فضا میں بھیج کر واپس بلا لیا ہے اور اب گویا سیر افلاک بلکہ تسخیر کائنات کے لئے راستہ کھل گیا ہے۔ بہت سے ماہرین سائنس اس کو تا حال سائنس کا سب سے بڑا معجزہ سمجھتے ہیں اور بہرحال اس میں شک نہیں کہ نقل و حرکت کے میدان میں یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے امکان کو کچھ سال پہلے تک عقل انسانی باور کرنے کو تیار نہ تھی۔

یہ انسانی دماغ کی جیت ہے ایک ایسے اٹل قانون پر جس نے آفرینش عالم سے ہماری دنیا کو محصور
کر رکھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سائنس کے اس کارنامے سے انسانی زندگی کی تصویر
بالکل بدل گئی ہے اور اس کے بنیادی مسئلے وہ نہیں رہے جس پر تہذیب کے آغاز سے اب تک
غور ہوتا رہا ہے لیکن مجھے اس خیال سے بہ ادب اختلاف ہے۔ انسان مادی دنیا میں کتنی ہی
ترقی کرے اس کی کتنی ہی رکاوٹوں کو پھلانگے، اس سے بنیادی اخلاقی اصول اور قدریں نہیں
بدلتیں۔ مسئلے زیادہ پیچیدہ اور مشکل ضرور ہو جاتے ہیں اور نئے ماحول میں ان کو برتنے کے لئے زیادہ
ذہنی کاوش کرنی پڑتی ہے لیکن وہ اپنی جگہ پر مسلّم ہیں۔ سائنس کے اس کارنامے کا ایک نتیجہ یہ ضرور
ہے کہ اس پھیلتی ہوئی کائنات میں ہماری چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں اور چھوٹی، اپنے حقیر اور
گھٹیا مقصد اور زیادہ حقیر اپنی تنگ نظری اور تعصب اور زیادہ تنگ نظر معلوم ہونے ہیں۔
جب انسان کی سعی وفکر کے لئے ایسے لامحدود دایوان ممکنات نکل رہے ہوں تو وہ کس طرح اپنی انگلی
کی پھانس کو زندگی کی سب سے اہم حقیقت اور اپنے پڑوسی کو کمینگی کے ساتھ دھوکا دینا اپنا
سب سے بڑا کارنامہ سمجھ سکتا ہے! لیکن یہ بات بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ میزان عقل و
اخلاق میں عالمی رنج کی اہمیت انگلی کی پھانس کی خلش سے زیادہ ہے اور دیانت داری، دھوکہ
بازی سے اور انصاف حق تلفی سے بہتر ہے۔ نئی دنیاؤں کو فتح کرنے سے یا اسی دنیا میں تعلقات
کی وسعت سے، انسان کی ذمہ داری یقیناً بہت بڑھ جاتی ہے اور اس کو شرافت اور سمجھ داری
کے ساتھ ادا نہ کرنے کے خطرے بھی۔ لیکن اس کی وجہ سے شرافت کا بنیادی تصور نہیں بدلتا۔
بس اس کی حدیں زیادہ وسیع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک زمانے میں صرف اپنے گھر والوں یا پڑوسیوں یا
قبیلے کے لوگوں کے ساتھ مروت اور خوش معاملگی کا سلوک کافی تھا تو اب یہ سلوک تمام انسانوں
کے ساتھ لازم ہے کیونکہ سب ہمارے پڑوسی ہیں۔ فرض کیجئے اقبال کی یہ پیش بینی صحیح ثابت
ہو کہ

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ما است
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

اور یہ سنارے بھی آباد ثابت ہوں تو اس سے کیا لازم آتا ہے؟ کیا اس سے ہماری قدریں خارج از بحث یا زائد المیعاد ہو جائیں گی؟ نہیں، جس شاعر نے "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" کی شاعرانہ پیشین گوئی کی ہے اس نے اس کے بارے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ "ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"۔ یعنی اصل حقیقت اس وقت بھی عشق کا جذبہ ہی ہوگا جس کے بغیر دنیا کا ظہور ممکن نہیں، جس کے بغیر ظلمت سے نور نہیں کاڑھا جا سکتا، اور اگر انسانوں کے تعلقات میں اس کا جلوہ نہ ہو تو یہ ایک ضمنی اور غیر اہم بات ہے کہ جو ایٹم بم یا اس سے بھی زیادہ خوفناک شیطانی آلات انسان کو تباہی کے گھاٹ اتارتے ہیں وہ اسی کرہ ارضی میں ایجاد ہوتے ہیں یا "سیاروں کی جنگ" کے سلسلے میں مریخ یا مشتری یا کسی اور کرہ کے دین ہیں!۔ اس دور کے لئے، جب مادیت کی بے لگام قوتوں نے زندگی کو اپنے نامبارک گھیرے میں قید کر لیا ہے اور انسانیت کے سر پر ایک تلوار لٹکی ہوئی ہے، امید کا ایک ہی پیغام ہے جو پرانا بھی ہے اور نیا بھی اور جو دراصل کبھی پرانا نہ ہوگا، اور وہ پیغام ہے محبت اور رواداری کا، شرافت اور انسانیت کا اور ان اخلاقی قدروں کے بچاؤ کے لئے جدوجہد کرنے کا جو زندگی کو شرف اور معنی بخشتی ہیں اور جس کے بغیر وہ بے فیض اور بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی تصور کے بنیادی جذبے کا نام اقبال کی اصطلاح میں عشق ہے:

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام!

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰے
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

اس دکھ بھری زندگی میں، جو کبھی کبھی ایک مجنوں کی کہی کہانی معلوم ہوتی ہے یہی ایک جلوہ ہے، یہی ایک تابناک حقیقت ہے جو اس میں معنی اور ابدیت کی شان پیدا کرتی ہے!

انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ یقیناً خدمت خلق ہے اور عوام کی ذہنی، مادی اور روحانی زندگی کے معیار کو بلند کرنا اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنی خودی کو بلند کرے، اس میں عشق کی جوت جگائے، اس کو اعلیٰ قدروں کا خادم بنائے، ان قدروں کو دنیا میں پھیلانے کی کوشش کرے جو

قوتیں انہیں شکست دینے، ان کو دبانے کے درپے ہیں ان کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کرے، حق کا ساتھ دے، حق پر قائم رہے، اپنا فرض ادا کرے اور نتیجے کی فکر نہ کرے کیونکہ اس کی ذمہ داری کسی اور کی ہے!

'وہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن خدا اس کو کامیاب کر کے رہے گا خواہ انکار کرنے والوں کو یہ بات کتنی ہی کھلے!'

حصّہ اوّل

ابدی قدریں

چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں۔

(حبیب جالب)

مہاتما بدھ کا پیغام

آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے، آنسوؤں کی اس وادی اور خوف کی اس گھاٹی میں جس کا نام دنیا ہے، جہاں دکھ حقیقت ہے اور سکھ پرچھائیں، بھارت کی گود میں ایک سپوت پیدا ہوا، جس کا نام تھا سدھارتھ۔ اس نے ایک شاہی خاندان میں جنم لیا، عیش و عشرت کی آغوش میں پرورش پائی، اپنے زمانے کے دستور کے مطابق پوری تعلیم حاصل کی اور پھر بہت چاؤ سے اس کی شادی رچائی گئی۔ قیاس یہ کہتا تھا کہ یہ راج کمار ایک دن بھارت کا راجہ بنے گا اور ممکن ہے وہ کوئی ایسا کام کرے کہ اس کا نام تاریخ کے صفحوں میں باقی رہ جائے۔ یا شاید جس طرح زمانے کے اٹل ہاتھ نے اور بے شمار ناموں کو مٹا دیا ہے اسی طرح اس کا نام بھی طاق نسیاں کی زینت بن کر رہ جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا نام محض تاریخ کے صفحوں میں نہیں بلکہ انسانوں کے دل میں ایک قندیل کی طرح روشن ہے۔ آج صرف ہندوستان نہیں بلکہ ساری دنیا اسے گوتم بدھ کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے اور اس کی یاد کو اپنے حریم عقیدت میں جگہ دیتی ہے۔ ابھی چند سال ہوئے اس کے نروان حاصل کرنے کی یادگار ملک بھر میں بڑے پریم اور آدر کے ساتھ منائی گئی اور یونسکو جنرل کانفرنس کے دوران میں ساری دنیا کے مشاہیر نے دہلی میں جمع ہو کر اس کی خدمت میں اپنی عقیدت کی بھینٹ پیش کی۔ یہ کیونکر ہوا؟ یہ شاہزادہ جو اپنے جیون میں کبھی تخت پر نہیں بیٹھا کس طرح آج کروڑوں انسانوں کے دل پر حکومت کر رہا ہے؟ اس کے پیغام میں کیا بات تھی جس نے اس کے نام اور کام

کو امر بنا دیا اور وہ انسانیت کے اونچے اصولوں اور آدرشوں کی روشن کتاب کا ایک جزو بن گیا ہے!

ان کی جیون کہانی کون نہیں جانتا؟ اسے کیا دہراؤں؟ لیکن ان اثرات کو ظاہر کرنے کے لئے جن کا حصہ ہے ان کی طبیعت اور مزاج کے بنانے میں، ان کے چند ابتدائی تجربوں کا ذکر ضروری ہے۔ ان کے باپ نے انہیں ایک ایسے درباری ماحول میں رکھا تھا جہاں ان پر دنیا کے دُکھ، درد اور زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کا سایہ تک نہ پڑے مگر اس کا کیا علاج کہ قدرت نے انہیں ایک حساس دل اور سوچنے والا دماغ دیا تھا۔ باوجود ان رنگ رلیوں کے جو چاروں طرف ہوتی رہتی تھیں وہ اکثر گہری سوچ میں گم ہو جاتے تھے جیسے کوئی ان دیکھی زبردست طاقت انہیں کسی اور طرف کھینچ رہی ہو۔ پھر قدرت کو جب کوئی کام کرنا مقصود ہو تو وہ اس کے لئے سامان پیدا کر دیتی ہے۔ نوجوان شاہزادہ اپنے ایک دوست کو تیر چلاتے دیکھتا ہے جس سے ایک حسین راج ہنس زخمی ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ سے درد کی پہلی چوٹ اس کے دل پر پڑتی ہے۔ وہ اس کی مرہم پٹی کر کے اس کو دکھ کے جال سے آزاد کر دیتا ہے اور اس کو پھر سے اُڑتا دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ وہ راج دہانی کی سیر کرنے کے لئے نکلتا ہے۔ جہاں ساری پرجا اس کے سواگت کے لئے موجود اور اس کے درشن کے لئے بے تاب ہے اور اس کی سواری کے سامنے اپنی عقیدت کے پھول بکھیرتی ہے لیکن نہ معلوم کہاں سے اس ہنگامہ جشن میں زندگی کی ایک تلخ حقیقت ایک کمزور اور بیمار بوڑھے کی شکل میں آکھڑی ہوتی ہے۔ اس کے جسم پر چیتھڑے ہیں اور چہرے پر بڑھاپے کی چغل خور جھریاں اور سدھارتھ کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوتا ہے کہ جوانی کی قوت اور حُسن آنی جانی چیزیں ہیں، کہ دولت ہر کسی کے نصیب میں نہیں آئی اور بڑھاپا اور اس کی محرومیاں اٹل ہیں۔ دوسری دفعہ سیر کو نکلتا ہے تو قدرت پھر اپنا کھیل کھیلتی ہے اور ایک دم توڑتے ہوئے آدمی کی بے بسی اس کی بصیرت کی آنکھ کو روشن کر دیتی ہے۔ تیسری دفعہ درباریوں کی ساری احتیاط اور تدبیروں کے باوجود ایک ارتھی اس کے سامنے سے گذر جاتی ہے اور موت کی اٹل حقیقت اس کے وجدان کو بیدار کر دیتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے جو زندگی کی اصلیت کو اس کی نظر سے

اوجھل رکھنا چاہتے تھے خطاب کرکے کہتا ہے:

"تم نے میرے چاروں طرف عیش وعشرت کا ایک اوچھا اور جھوٹا ماحول پیدا کرکے دکھ کی حقیقت کو مجھ سے چھپایا اور زندگی کا ایک غلط اور نا تمام تصور میرے سامنے پیش کیا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ دنیا سراپا حسین ہے اور اس کی خوشیاں ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے!"

اب ان کا احساس پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کے چہرے پر سے خوش گوار اور نظر فریب نقاب اٹھ گیا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ خوشی ایک بھاگتے ہوئے سائے کی طرح گذر جاتی ہے اور دکھ درد محرومی اور بے انصافی کی جڑیں افراد اور سماج کی زندگی میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ انہوں نے سوچا "یہاں کوئی چیز بھی مستقل معلوم نہیں ہوتی۔ جہاں جاتا ہوں زوال اور موت کا چکر چلتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کیسی دنیا دیوتاؤں نے بنائی ہے جس میں دکھ اور بیماری، حرص وہوس کا دھندا ہر طرف جاری ہے۔ اس دنیا میں شانتی اور نہ مٹنے والی خوشی کیسے پاؤں؟ اس کی زنجیروں سے چھٹکارا کیسے حاصل کروں"۔ بس یہی ایک خیال تھا، ایک بےچین کرنے والی کھوج جوان پر طاری تھی اور اسی کی خاطر ایک رات کی پردہ پوش تاریکی میں انہوں نے محل کو چھوڑا یشودھرا جیسی حسین بیوی اور راہل جیسے پیارے بیٹے کو چھوڑا اور راج اور راجدھانی سے منہ موڑ کر جنگل کی راہ لی اور تپسیا کی ایسی کڑیاں جھیلیں جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ سدھارتھ جس کی جوانی اور خوبصورتی کی ہر طرف دھوم تھی فاقے اور نفس کشی کی بدولت ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا جس کو دیکھنے والے پہچان نہ سکتے تھے۔ لیکن باوجود ان تمام کوششوں کے گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا اور زندگی کی مرکزی سچائی تک پہنچ نہ ہو سکی مگر یہ وہ تلاش نہ تھی جس کی شدت کو راستہ کی کٹھنائیاں کم کر سکتیں۔ ان کا تو دھرم گویا یہ تھا

دست از طلب نہ دارم تا کام من برآید   یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

جان تقریباً بدن سے نکل ہی گئی تھی لیکن چونکہ قدرت کو ان سے کام لینا تھا اس لئے

زندگی نے ساتھ نہ چھوڑا اور آخر کار حقیقت کے اس سچے کھوجی نے حقیقت کو پالیا۔ اس حقیقت کو جو دیکھنے اور بیان کرنے میں بڑی سادہ، بڑی سرل معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے، بہت ہی مشکل۔ اور وہ حقیقت کیا ہے؟ اگر نروان یعنی نجات حاصل کرنی ہے تو اپنے من کو اندر سے صاف کرو، سچی خوشی صرف نیک کاموں سے حاصل ہوتی ہے۔ بُرے کاموں کا نتیجہ، خواہ وہ دیکھنے میں کیسے ہی دل کش معلوم ہوں، دکھ اور پچھتاوا ہے۔ جب کسی انسان کے خیال اور عمل میں، جذبات اور ارادوں میں، بات چیت اور لین دین میں نیکی کی یہ روح سرایت کر جاتی ہے تو اس کے سامنے ابدی مسرت کا وہ راستہ کھل جاتا ہے جو اسے نروان کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب گوتم بدھ نے سچائی کو پا لیا تو "مارا"، کو جو بدی کی روح یا شیطان کا روپ ہے یہ ڈر پیدا ہوا کہ اگر انہیں کہیں اس تعلیم کو دنیا میں پھیلانے کا موقع مل گیا تو اس کا اپنا راج، جو جہالت اور جھوٹ کے ستونوں پر قائم ہے ختم ہو جائے گا اور لوگ بدی کے بجائے نیکی کے راستے پر پڑ جائیں گے۔ وہ ایک ناصح مشفق کا روپ دھار کر ان کے پاس آیا اور ان سے کہا "اب کہ آپ اس سچائی کو پا گئے ہیں۔ کیوں نروان کی اس منزل میں داخل نہیں ہو جاتے جو اپنی آغوش کھولے آپ کے سامنے کھڑی ہے؟ دنیاوی زندگی کی اس بوجھل گاڑی کو کھینچنے سے کیا حاصل ہوگا؟" لیکن مہاتما بدھ کوئی معمولی سنیاسی یا عابد نہیں تھے بلکہ دنیا کے لئے ایک مصلح اور سدھارک بن کر آئے تھے۔ انہیں صرف اپنی آتما کو بچانے اور بلند کرنے کی فکر نہ تھی بلکہ وہ انسانوں کی سیوا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے وہی جواب دیا جو ان کے شایان شان تھا۔ "نہیں مارا، میں ابھی نروان کی منزل میں داخل نہ ہوں گا۔ میں دنیا کے سدھار کی کوشش کروں گا۔ میں جیون چکر کے قانون کو انسانوں میں پھیلاؤں گا تاکہ وہ جن زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں ان سے آزاد ہوں اور سچی خوشی کا راستہ انہیں مل جائے۔ میرا دل جو پریم اور دیا کے چراغوں سے روشن ہے اس سنسار کے اندھیرے کو برداشت نہیں کر سکتا۔" اور انہوں نے جو کہا تھا وہی کر کے دکھایا اور جیون بھر اپنا اپدیش دیس کے کونے کونے میں اور سماج کے ہر طبقے میں پھیلاتے رہے!

گوتم بدھ کا یہ پیغام کیا تھا، اس سوال کا جواب دینا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ انہوں نے جو کہا وہ بہت پرانی بات بھی معلوم ہوتی ہے اور بالکل نئی بھی۔ جس زمانے میں وہ پیدا ہوئے بھارت کی تہذیب میں بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ آریا اور غیر آریا کا امتیاز، ذات پات کی بندشیں، نسل کا گھمنڈ، مذہب کی روح سے بے پروائی اور بے جان ریت رسموں کی پابندی... وقت کسی ایسی آواز کا منتظر تھا جو راستہ بھٹکے مسافروں کو منزل کی طرف بلائے، جو دولت اور قوت کے فرعونوں سے نہ دبے بلکہ سچّی بات کہے جو کڑوی ہوتی ہے لیکن کڑوی دوا کی طرح مرض کا علاج کر سکتی ہے۔ مہاتما بدھ نے اس فرض کو انجام دیا۔ انہوں نے بھٹکے ہوئے انسانوں کو یاد دلایا کہ مکتی کا راستہ دیوتاؤں کی انگلی پکڑ کر، مندروں میں بھینٹ چڑھا کر، یا گھنٹیاں بجا کر پار نہیں ہو سکتا۔ سچّی خوشی اور شانتی آسمان سے آکر تمہاری جھولی میں نہیں گرے گی، نہ آکاش کے تارے تمہارے دل کی مرادیں پوری کریں گے۔ یہاں تو کرم کا قانون چلتا ہے، جیسا کرو گے ویسا بھروگے۔ عمل کے اس اٹل سلسلے کو کوئی چیز نہیں توڑ سکتی اور عمل ہونا چاہیے نش کام، بے غرض، جس میں لابھ اور موہ کا میل نہ ہو، شراب اور شہد کی لاگ نہ ہو۔ جو انسان نفس کا غلام بنے گا وہ ہرگز منزل کو نہ پہنچ سکے گا۔ یہ جو انسان کے من میں "انا" یعنی "میں" کا بت بیٹھا ہوا ہے یہ بڑا خطرناک ہے۔ یہ صرف اپنی ذات کے لئے ہر قسم کی اوچھی خوشیاں اور آسائشیں مانگتا ہے اور ان تمام گھٹیا خواہشوں کا سرچشمہ ہے جن سے دنیا میں کھوٹ کپٹ، ہنسا اور جھوٹ پھیلتے ہیں۔ اس "میں" کو قابو میں رکھنا ہمارا فرض ہے جب تک یہ بت نہیں ٹوٹے گا منزل کھوٹی رہے گی۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں　　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور!

یہ جو ایک دوسرے سے علیحدگی کا احساس ہے درحقیقت ایک دھوکا ہے جس کی حقیقت ایک خواب پریشاں سے زیادہ نہیں۔ منُش کی انسانیت اس کو دوسرے انسان سے جدا نہیں کرتی بلکہ ان سے ملاتی ہے اور ان کے دکھ سکھ میں اپنا دکھ تلاش کرتی ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ تم صرف تپسیا کے ذریعہ یعنی خود کو دکھ پہنچا کر موکش نہیں حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے ان تمام

راستوں کو ٹٹول کر دیکھ لیا ہے، دکھ اور سکھ کا مزہ چکھا ہے، ان کے جام کو تلچھٹ تک پی کر دیکھا ہے۔ یہ سب دل کو دھوکا دینے والی چیزیں ہیں۔ ان کا اعتبار نہ کرو۔ اصل چیز ہے نیک عمل اور نبت کی نیکی، ایثار اور سچائی، سیوا اور دل کی گرمی۔ حرص و ہوس کو چھوڑ کر نیکی کا بہ صاف اور سیدھا لیکن کٹھن راستہ اختیار کرو جو بال سے زیادہ باریک لیکن تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ یہی تمہیں نروان کی منزل تک پہنچائے گا جہاں انسان اپنی ذات کی حدوں سے اوپر اٹھ کر، اس آواگون کے چکر کو توڑ کر حقیقت ابدی کا جزو بن جاتا ہے اور قطرہ سمندر کی آغوش میں پہنچ کر آسودگی اور دوام حاصل کر لیتا ہے۔ جب وہ راستے کی "آٹھ منزلیں" طے کرتا ہوا زندگی کی اس معراج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا دل محبت، خوشی، رحم اور شانتی سے جگمگا اٹھتا ہے اور اس کے دل کی پکار یہ ہوتی ہے۔

"میری آرزو ہے کہ ہر جاندار مضبوط ہو یا کمزور، بڑا ہو یا چھوٹا، دکھائی دے یا نہ دکھائی دے، قریب ہو یا دُور، پیدا ہو چکا ہو یا نہ پیدا ہوا ہو، سچی خوشی سے سرشار ہو۔

میری آرزو ہے کہ کوئی کسی کو دھوکا نہ دے۔ کسی کے بارے میں برے خیالات دل میں نہ رکھے، غصے یا ناراضگی سے متاثر ہو کر کسی کے لئے بُرا نہ چاہے!

جس طرح ایک ماں ساری عمر اپنے اکلوتے بچے کو چاہتی ہے اسی طرح ہر شخص تمام جانداروں کے لئے اپنے دل میں پریم کی جوت جگائے رکھے!

اس کی یہ محبت اتھاہ ہو ساری دنیا کے لئے جو اس سے اوپر، نیچے، آگے پیچھے ہے۔ اس میں دشمنی کی پرچھائیں تک نہ ہو، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس کو ہر وقت مستعدی کے ساتھ محبت کے تقاضوں کا خیال رہے!"

انہوں نے یہ سب کچھ کہا لیکن اس سے اور آگے بڑھ کر انہوں نے اس سماجی نظام کو چیلنج کیا جو ذات پات کے اصول پر قائم تھا۔ انہوں نے کہا کہ اونچی نیچی ذاتوں کی یہ تقسیم بے معنی ہے اور انصاف کے خلاف اس کو توڑ ڈالو۔ آدمی آدمی سب برابر ہیں جو شخص نیک کام کرتا ہے وہی

سربلند ہے۔ نجات حاصل کرنی ہے تو اس کے لئے نہ برہمن کی ذات کام آئے گی، نہ چھتری کی تلوار، نہ ویش کی دھن دولت، وہاں تو صرف نیک عمل کی پوچھ ہے۔ پھر یہ چھوت چھات کیوں؟ پھر یہ اچھوتوں کے سائے سے پرہیز کیوں؟ ان کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کیوں نہیں کرتے؟ ان کے ہاتھ کا اور ان کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ نہ معلوم ان کی زبان میں کیا جادو تھا، ان کی شخصیت میں کیا من موہنی تھی کہ اس انقلابی پیغام کو نہ صرف ان کے دیس والوں نے بلکہ دور دراز کے دیسوں نے گوش ہوش سے سنا اور رفتہ رفتہ نہ صرف عام لوگ بلکہ راجا اور مہاراجا، برہمن اور چھتری سب اس بندہ درویش کے حلقہ بگوش بن گئے۔ خود ان کے باپ نے ان کے اپدیش کے سامنے اپنا سر جھکایا اور دنیا کی تاریخ کے سب سے زیادہ نیک نام شہنشاہ اشوک نے ان کا پرچارک بننا اپنے لئے فخر سمجھا اور ان کا یہ پیغام دنیا کے دُور دراز ملکوں میں سورج کی کرنوں کی طرح بکھیر دیا۔ یہ پیغام جو محبت کا پیغام ہے، جو اہنسا کا پیغام ہے، جو شانتی کا پیغام ہے، جو فراخ دلی اور بے تعصبی کا پیغام ہے، جو انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا پیغام ہے، وہ پیغام جس کی بابت ایک مصنف نے لکھا ہے کہ "اس میں وہ اعتدال پسندی تھی جو یونانی تہذیب کا جوہر مانی جاتی ہے، وہ خاکساری تھی جس نے عیسائی مذہب کو سرفراز کیا اور وہ مساوات جو اسلام کا مایۂ ناز ہے۔"

کس قدر شدید ضرورت ہے آج کل کے زمانے میں اس پیغام کی!

انسان کامل

(۱)

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں کی طرف سے غافل نہیں بلکہ اس نے ان کی اصلاح اور ہدایت کے لئے شروع ہی سے وقتاً فوقتاً اپنے خاص اور نیک بندوں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں نیکی کی طرف بلائیں اور بدی کے راستے پر چلنے سے منع کریں جو اس کو قادر مطلق سمجھتے ہیں انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر اس کی مشیت ہوتی تو وہ انسان کی فطرت میں بدی کا مادہ ہی نہ رکھتا بلکہ فرشتوں کی طرح وہ بھی ہر وقت عبادت الٰہی میں سرگرم رہتا لیکن پھر انسانوں کی ضرورت ہی کیا تھی، فرشتوں کی مخلوق ہی کافی ہوتی! انسان کا امتیاز اور امتحان تو یہی ہے کہ اس کو آزادی اور اختیار کا عطیّہ دیا گیا ہے۔ اس کو نیکی اور بدی کی پہچان ہے اور وہ ان میں سے جس کو چاہے اپنا سکتا ہے۔ "ہم نے اس کو صحیح راستہ دکھایا ہے، اب اس کا کام ہے خواہ وہ راہ شکر اختیار کرے یا راہ کفر" یہی اس کا کمال ہے اور یہی وہ صلیب ہے جو وہ ابتدا سے اٹھائے ہوئے ہے۔ شکر کا راستہ اس کو اخلاق کی انتہائی معراج تک پہنچا دیتا ہے۔ کفر کا راستہ اختیار کرکے وہ "اسفل السافلین" کی پستی میں جا گرتا ہے۔ خدا نے اس کو ارادہ اور فکر و عمل کی یہ آزادی تو ضرور بخشی لیکن وہ اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہوا، اس کی طرف سے "اپنے ہاتھ نہیں دھوئے"۔ اس کو بالکل اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ نظام کائنات کی تخلیق کچھ اس اصول

پر کی ہے کہ یہ انسان تسلیم و رضا اور انکار و بغاوت کی کشمکش میں حصہ لے، حق و باطل کی مسلسل، نہ ختم ہونے والی جنگ میں کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف شریک ہو اور رفتہ رفتہ اپنے علم اور وجدان اور اخلاقی شعور میں ترقی کرے اور بحیثیت مجموعی، باوجود شکستوں اور ناکامیوں اور نافرمانیوں کے خدا کے "بڑھتے ہوئے مقصد" کی تحصیل کا ذریعہ بن جائے۔ اسی غرض سے خدا کے نبیوں، پیغمبروں اور اوتاروں کا ایک سلسلہ اس کو برابر صراط مستقیم کی طرف بلاتا رہا ہے۔

انسان کی بے بصری اور عجلت پسندی کو اکثر یہ گہری مصلحت نظر نہیں آتی اور بعض دفعہ اس کے بہترین افراد بھی دنیا میں ظلم و جور کی کثرت دیکھ کر، طاقت کو حق کے مقابلہ میں کامیاب پاکر یقین کر لیتے ہیں کہ یہاں نہ کوئی نظم و ترتیب ہے، نہ زندگی کی اخلاقی اہمیت ہے، نہ حق کا بول بالا ہونا قرین قیاس ہے۔ وہ اس ذہنی اور جذباتی کیفیت میں گرفتار ہو کر یا تو امید کا دامن ہاتھ سے بالکل چھوڑ دیتے ہیں یا دنیا کی طرف سے مایوس ہو کر محض اپنی روحانی عفت کو بچانے کی فکر کرتے ہیں اور اس غرض سے کوئی گوشۂ عافیت تلاش کر کے ریاضت و عبادت، گیان دھیان میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن ایک حساس دل و دماغ کے لئے یہ راہ فرار ہے، اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اندھیرے کا مقابلہ آنکھیں بند کر لینے سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے چراغ جلانے کی ضرورت ہے اور چراغ کی یہ صفت ہے کہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو ساری دنیا کا اندھیرا بھی اسے نہیں بجھا سکتا۔ بیشک ایک چھوٹے چراغ کی روشنی کھوڑی دور تک پہنچے گی، ایک بڑا چراغ زیادہ دُور تک روشنی پہنچائے گا، اور آفتاب عالم تاب کی زد میں سارا جہان ہے لیکن چراغ جلانا بہرحال انسان کا فرض ہے جس کو وہ ترک نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ وہ اپنے بنیادی انسانی شرف کو تج دینے پر تیار ہو۔

(۲)

آج سے کوئی چودہ سو برس پہلے عرب کی سرزمین پر قریش کے ایک معزز خاندان میں، ایک ایسا انسان کامل پیدا ہوا جس کی تعلیم اور مثال نے اس طویل مدت میں کروڑوں انسانوں کو صراط مستقیم دکھائی ہے اور ان کو حیات کے ایک بہتر تصور سے آشنا کیا ہے جب تک دنیا قائم ہے اس چراغ کی جوت بھی قائم رہیگی۔

اس بچے کا نام محمدؐ رکھا گیا۔ کس کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کا نام اس قدر احترام اور عقیدت کے ساتھ لیا جائے گا اور بے شمار انسان اس کے نام کا کلمہ پڑھیں گے۔ اس کی ابتدائی زندگی کا پس منظر غور کے قابل ہے۔ اس میں ایسے ظاہری اسباب اور حالات نہیں ملتے جو ابتدائی تربیت میں معین ہوتے ہیں۔ بچہ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے اور ابھی اس کی عمر چھ سال کی بھی نہیں کہ شفیق ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ جاتا ہے۔ اب اس یتیم کی نگرانی اس کے دادا کے حصے میں آتی ہے لیکن اس نئی ولایت کو دو سال بھی نہیں گذرے کہ یہ سایہ بھی سر سے اٹھ جاتا ہے۔ جیسے قدرت کو یہ دکھانا مقصود ہو کہ اس کے پالنے والے، اس کی نگرانی کرنے والے اس کے عزیز نہیں بلکہ قدرت الٰہی ہے جو کسی خاص مقصد کے لئے اس کی تربیت کر رہی ہے! ابھی ایک چچا کا دم باقی تھا اور انہوں نے ہی بھتیجے کی سرپرستی کا فرض اپنے ذمہ لیا۔ وہ تجارت کے سلسلے میں شام وغیرہ کا سفر کیا کرتے تھے۔ اس میں انہوں نے اس عزیز اور ہونہار بھتیجے کو اپنے ساتھ لیا اور اس طرح اسے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو دیکھنے اور اس کی مادی، سماجی، اخلاقی اور روحانی حالت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ دل کی آنکھیں تو قدرت نے ابتدا سے روشن رکھی تھیں۔ اب باہر کی آنکھوں نے بھی انسان کی گمراہی اور زوال کے منظر دیکھے جس سے دل پر چوٹ پڑی اور وہ سوچ بیدار ہوئی جو تمام معلمین اخلاق اور انسانیت کے ہادیوں کے حصے میں آئی ہے، یعنی انسانوں کی زندگی کو کس طرح بہتر بنایا جائے، ان کے کردار میں کس طرح پاکیزگی اور شرافت پیدا ہو۔ لیکن یہ زمانہ تیاری کا تھا، سیرت کے نقوش کو تربیت دینے اور اجاگر کرنے کا تھا، دنیا کو دیکھنے اور انسانوں کے برتنے کا تھا۔ ابھی اعلان کا پیغام پہنچانے کا وقت نہیں آیا تھا اس لئے انہوں نے تجارت کا شغل اختیار کیا جس میں مفید مطلب تجربے حاصل ہو سکتے تھے۔ ان کے پاس دولت نہ تھی لیکن نوجوانی ہی میں ان کی دیانت، امانت اور سمجھداری کا شہرہ پھیل چکا تھا۔ اس شہرت سے متاثر ہو کر عرب کی ایک شریف اور بیوہ خاتون نے اپنی تجارت کا انتظام ان کے سپرد کر دیا اور اس فرض کو انہوں نے ایسی ایمان داری، سلیقے اور

کامیابی کے ساتھ انجام دیا کہ اس محترم خاتون بی بی خدیجہؓ نے اپنی طرف سے شادی کی خواہش ظاہر کی اور یہ مبارک رشتہ آئندہ پچیس برس یعنی ان کے انتقال تک قائم رہا۔ اس طرح انہیں خاندانی زندگی کے آداب اور شرافتوں کو برتنے اور دنیا کے سامنے ان کی عملی مثال پیش کرنے کا موقع حاصل ہوا۔

اس وقت ان کی کیا پوزیشن تھی؟ انہوں نے دنیاوی زندگی کے مختلف پہلو دیکھ لئے تھے، کاروبار کا تجربہ حاصل کیا تھا، اپنی شرافت، دیانت، مروت، انسان دوستی، ہمدردی کی بدولت لوگوں کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اُن کی ساری زندگی اِن کی نظروں کے سامنے گذری تھی اور انہوں نے اس میں کوئی کمزوری، کوئی جھول نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے دوستوں، دشمنوں، مخالفوں سب نے انہیں اتفاق رائے کے ساتھ صادق اور امین کا خطاب دیا تھا۔ وہ ان کی سچائی کے قائل تھے اور ان کی سیرت اور کردار کی بلندی کے گواہ۔ اہل وطن کو اس نوجوان سے بہت سی امیدیں تھیں۔ وہ اسے اپنا قائد اور لیڈر ماننے کو تیار تھے ان کے پاس اس وقت کیا کچھ نہ تھا؟ عزت نیک نامی، دولت، خاندانی زندگی کی آسائشیں اور آرام کے ساتھ زندگی گذارنے کی توقع... بے شک یہ سب چیزیں تھیں۔ ایک معنی میں آرام بھی نصیب تھا لیکن اطمینان نہ تھا! اطمینان تو دل کی تسکین اور روح کی مسرت سے حاصل ہوتا ہے جس کا سرچشمہ، ذاتی فراغت نہیں بلکہ معرفت الٰہی اور خدمت خلق ہے۔ اس قلب صافی کو حق کی تلاش تھی اور معرفت الٰہی کی لگن۔ ساتھ ہی انہیں یہ فکر تھی کہ یہ دنیا جس میں بے شمار مرد اور عورتیں، زندگی کے اعلیٰ تقاضوں اور قدروں سے ناآشنا، جانوروں کی سی، بلکہ بعض لحاظ سے اس سے بھی بدتر، زندگی بسر کر رہے تھے کس طرح خالق کائنات کی مشیت کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس گھپ اندھیرے میں کہ چاروں طرف چھایا ہوا تھا اپنی کٹیا میں چراغ جلا کر بیٹھ جانے سے اس جذبہ اصلاح و خدمت کی تشفی کس طرح ہو سکتی تھی جو ان کو بے چین رکھتا تھا؟ ان کو ہر وقت دھن تھی کہ کسی طرح اپنے ہم جنسوں کو اس سیدھے اور سچے راستے پر لگائیں جس سے وہ بھٹک گئے تھے۔

مدینے سے چند میل کے فاصلے پر ایک سنسان علاقے میں ایک غار ہے جو تاریخ میں غار حرا کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا دستور تھا کہ وہ بعض اوقات کئی کئی دن تک اس غار میں مقیم رہتے، خدا سے لو لگا کر اس کی عبادت اور حمد و ثنا کرنے اور اپنے نفس کی گہرائیوں میں اس روشنی کی تلاش کرتے جس کے بغیر دنیا کو ہدایت کا راستہ دکھانا ممکن نہیں۔ اس طرح کی تخلیقی تنہائی کا لطف، جس میں بندہ اپنے معبود کے ساتھ براہ راست رشتہ قائم کرتا ہے اور جزوی اور غیر ضروری باتوں کو بھلا کر حقیقت کا چہرہ بے نقاب دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، کسی نہ کسی شکل میں تمام خاصانِ خدا نے اٹھایا ہے۔ ایک روز کوئی چالیس سال کی سال کی عمر میں جب وہ غار حرا میں مصروف عبادت تھے نورِ حقیقت نے قلب صافی پر جلوہ کیا اور انہیں بشارت ہوئی کہ خدا نے انہیں اپنا رسول بنا کر دنیا میں بھیجا ہے تاکہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو اس کا ابدی پیغام دوبارہ یاد دلائیں، ان کو نیکی کی تعلیم دیں، بدی سے روکیں اور خدا کے سچّے اور سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہبری کریں۔

"(اے رسول) پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے ساری کائنات بنائی ہے، جس نے انسان کو خون کی ایک جمی ہوئی بوند سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا صاحب کرامت ہے اسی نے قلم کے ذریعے (انسان کو) علم سکھایا، وہ سب کچھ سکھایا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ تھی پہلی وحی یا فرمان الٰہی جو ان پر نازل ہوا اور جس میں سب سے پہلے انسان کو علم حاصل کرنے یعنی دماغ کی کھڑکیاں کھولنے کی، زبان اور قلم کے ذریعہ ملک معنی کی تسخیر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ وہ زندگی جہالت کی تاریکی میں یا باپ دادا کے بنائے ہوئے طریقوں پر بسر نہ کریں جن کی افادیت ختم ہو چکی ہے، بلکہ غور و فکر، تدبر اور تفکر کے ذریعہ زندگی کے معنی اور مقصد کو سمجھیں اور اس کو حاصل کرنے کے لئے صحیح ذریعے اختیار کریں۔ انسان اس منزل پر پہنچ گیا تھا جب وہ عقل خداداد کی روشنی میں اپنے راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ خدا کے رسول کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ انسان کے سامنے اس یہ چیلنج کو پیش کرے کہ علم و حکمت تمہاری کھوئی ہوئی پونجی ہے

جہاں کہیں ملے اس کو اپناؤ۔ اور جس کو حکمت مل گئی اس کو ہر طرح کی خوبیاں اور بھلائیاں مل گئیں،
"علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے تمہیں چین ہی جانا پڑے"، یعنی دماغ کو قفل نہ لگاؤ اس کو زندگی کے
مسئلوں کو حل کرنے کی کنجی سمجھو۔

یہ بڑا سخت وقت تھا خدا کے رسول پر بشارت اپنے جلو میں آزمائش لے کر آئی تھی چالیس
سال تک انھوں نے اپنی قوم کے سامنے ایک بے داغ اور بے لوث زندگی گذاری تھی اور اس میں مقبولیت
حاصل کی تھی۔ اب انہیں ان کی گمراہی پر تنبیہ کرنی تھی، گمراہی جس کی جڑیں ان کی انفرادی
اور اجتماعی زندگی میں بہت گہری چلی گئی تھیں سچائی کی خاطر عمر بھر کی ہر دل عزیزی کو قربان کرکے، ہر قسم
کی مخالفتوں اور بدگمانیوں کو جھیلنا اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ لیکن جب خدا کے کسی
منتخب بندے کو یہ بشارت ملتی ہے تو اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ وہ بہت خوشی اور
آمادگی کے ساتھ تمام آزمائشوں اور مصیبتوں کو خاطر نشان کرتا ہے اور خدا کے پیغام کو اس کے
بندوں کے سامنے جرأت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس مرد مجاہد کو اندازہ تھا کہ اب اس کے سامنے
کس قسم کا خارزار ہے لیکن ان کی ہمت کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے
اس بشارت کا ذکر کیا اور کہا کہ میرے دل پر خدا کا خوف اور رعب طاری ہے کہ ایک بہت بڑی
ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ وہ ان کو اپنے ایک عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو
ایک معمر اور صاحب بصیرت عیسائی عالم تھے۔ انہوں نے اس عجیب واقعہ کو سنا حضرت محمدؐ
کے روئے زیبا پر ایک نظر ڈالی اور کہا "بے شک یہ خدا کا پیغام ہے جو آپ پر نازل ہوا ہے۔ یہ
وہی پیغام ہے جو آپ سے پہلے دوسرے بہت سے نبیوں پر، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ پر نازل
ہو چکا ہے۔ میری نظریں اس مستقبل کو دیکھ رہی ہیں جو آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ کاش میں اس وقت
زندہ ہوتا جب قوم آپ کو اپنے وطن سے نکال دے گی اور اس وقت آپ کی کچھ خدمت کر سکتا۔"
پوچھا "کیا قوم مجھے مکّہ سے نکال دے گی؟" جواب ملا ہاں اس دنیا میں جس کسی نے
ایسی انقلابی تعلیم پیش کی ہے اس کو یہی صورت حال پیش آئی ہے اور ہر قسم کی مخالفتیں جھیلنی

پڑی ہیں"۔

دل نے کہا یہ سب منظور ہے۔ اب کہ دل کی کشتی اس طوفان میں ڈال دی ہے تو فکر کیا ہے۔ اس کا کھویا وہی پروردگار ہے جس نے مجھے اس کام کے لئے چھانٹا ہے،

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مُرسٰہا

(۴)

جب انہوں نے خدا کا یہ پیغام، جس کو پہنچانے والے آفرینش عالم سے مختلف لفظوں اور صورتوں میں پہنچانے آئے تھے، پھیلانے کا بیڑا اٹھایا تو عرب اور اس کے گرد و پیش کی دنیا کی کیا حالت تھی؟ پرانے پیغام کتابوں میں محفوظ تھے لیکن دلوں سے محو ہو گئے تھے۔ مذہب کی ظاہری رسمیں اب تک ملکوں میں جاری تھیں لیکن اس کی روح غائب ہو چکی تھی یعنی ؎

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی!

اور جاننے والے جانتے ہیں کہ 'لفظی پابندی (مذہب کی) موت ہے' اس کی روح ہے جو زندہ رکھتی ہے'۔ اس زمانے میں، کہ عرب کی تاریخ میں جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے، ہر طرف بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ ایک خدا کو بھول کر لوگوں نے اپنے بنائے ہوئے معبودوں کی پرستش شروع کر دی تھی۔ یورپ میں علم و فضل کے جو چراغ یونانی تہذیب نے جلائے تھے وہ جہالت اور توہمات کی آندھی نے گُل کر دئے تھے۔ مذہبی تعصب اپنے پورے شباب پر تھا۔ اور پیغمبر امن، مسیح کے پیرو مذہب میں نہ صرف ہر قسم کا جبر و اکراہ بلکہ ظلم و ستم کو روا سمجھتے تھے جس کی وجہ سے مذہبی عدالت کی ستم آرائیاں انسانی تہذیب کی پیشانی پر ایک داغ بن گئی تھیں۔ ہندوستان، چین، مصر جہاں ایک زمانہ میں مذہب اور فلسفہ کا بہت چرچا رہ چکا تھا۔ اب محض علمی موشگافیوں کا مرکز تھے۔ مذہب کی حقیقی شرافتوں اور رواداریوں کو بھلا کر ان کے عالم ایک دوسرے کی تکفیر اور مخالفت میں لگے ہوئے تھے اور بجائے تلاش حقیقت میں تعاون کرنے کے ایک دوسرے کی راہ کاٹنے کی فکر میں تھے۔

خود عرب میں اس وقت نہ کوئی منظم حکومت تھی، نہ قانون کی کارفرمائی، نہ سماج

میں انصاف اور مساوات کا احترام۔ شاید وہاں فن خطابت، آداب شجاعت اور مہمان نوازی کے سوا تہذیب کے کوئی دوسرے دل پذیر عناصر باقی نہ رہے تھے۔ جہالت عام تھی۔ لوگ بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جن کے الگ الگ "خدا" تھے جو ان سے قربانیوں کے طالب تھے اور دوسرے خداؤں سے برسرپیکار۔ ان قبیلوں کے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں لڑائی آگ کی طرح بھڑک اٹھتی اور جائداد کی طرح یہ نفرت اور مخالفت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی اور کشت و خون کا بازار گرم رہتا۔ خانہ کعبہ جس کو حضرت ابراہیم نے "خدا کا گھر" بنایا تھا یعنی اس کی عبادت کے لئے مخصوص کیا تھا اب کئی سو بتوں کا مسکن تھا۔ اس طرح توحید الٰہی اور انسانی وحدت دونوں کا تصور پاش پاش ہو چکا تھا۔ باہمی مروت اور سماجی وضع داریاں ختم ہو چکی تھیں۔ عورت کی حیثیت جانوروں سے بدتر تھی، گھوڑوں اور اونٹوں سے تو یقیناً بدتر جن کی عرب عام طور پر بہت قدر کرتے تھے! اس کی نہ کوئی سماجی پوزیشن تھی نہ اقتصادی۔ اس کو اس درجہ ذلیل سمجھا جاتا تھا کہ اگر کسی شخص کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ اس کو ایک شرمناک بات سمجھ کر پوشیدہ رکھتا اور بعض سنگ دل تو اس معصوم کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے! شراب خواری، قمار بازی اور بے شرمی کے بہت سے اور مظاہر ان کی زندگی کا جزو بن گئے تھے اور ہر اعتبار سے تہذیب و تمدن کی جڑیں کھوکلی ہو چکی تھیں۔

یہ تھی وہ دنیا اور وہ ملک جس میں مشیت الٰہی نے اس بندہ خدا کو بھیجا۔ انہیں پوری طرح اندازہ تھا کہ سچ کی حمایت کی کس قدر گراں قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اور اس راستے میں کس قدر کٹھنائیاں پیش آتی ہیں۔ ایک جابر مطلق العنان حاکم اپنی مرضی زبردستی لوگوں پر عائد کر سکتا ہے لیکن یہاں تو دلوں اور دماغوں کو بدلنے، یعنی ایک زیادہ بنیادی انقلاب لانے کا سوال تھا کیونکہ "خدا کسی قوم کی (خارجی) حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہ کریں"۔ ایک مصلح کو یہ کام محبت، ہمدردی، دل سوزی، صبر اور نفسیاتی سوجھ بوجھ کے ذریعہ کرنا پڑتا ہے اور یہ کام کیا تھا؟ ابدی صداقتوں کے حسین چہرے پر سے اس دھول کو صاف کرنا جو صدیوں

کی بھول اور گمراہی نے اس پر جما رکھی تھی ۔ یہ سماج کی پوری طاقت کے خلاف ایک تنہا اور نہتے مرد مجاہد کا جہاد تھا ۔ بہت ہمت شکن تھا یہ مرحلہ ۔ لیکن جب عشق الٰہی کی آگ کسی دل میں روشن ہو جاتی ہے اور بندوں کی خدمت اور اصلاح کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے تو کوئی خوف اس آگ کو بجھا نہیں سکتا ، کوئی مصلحت اندیشی اس جذبے کو سلا نہیں سکتی چنانچہ انھوں نے بہت مضبوطی لیکن ملائمت کے ساتھ اپنی اس نئی تعلیم کو انکے سامنے رکھا جو ان کی پرانی روایتوں اور عقیدوں کو چیلنج کرتی تھی اور اس کا ردِ عمل وہی ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے ۔ یعنی یہ ہمارے باپ دادا کے طور طریقوں کی مخالفت ہے جس کو ہم گوارا نہیں کر سکتے ۔ اگر سچ کی آواز مصلحت اندیشی کے واسطوں اور دنیاوی لالچوں کی تحریص سے خاموش نہ ہو گی تو اس کو اکثریت کی مخالفت سے دبا یا جائے گا ۔ مطلب ہوا کہ اس نئی تعلیم کے ماننے والوں کو یہ آزادی نہ دی جائے گی کہ وہ اس پر عمل کریں یا اس کی تبلیغ کریں ۔ وہی آزادی ضمیر کا مطالبہ اور مفاد مخصوصہ کی پرانی ضد کہ اس کی اجازت نہیں ملے گی !

لیکن اس تحریک کو کون سی طاقت کچل سکتی تھی جب خلوص اور ایمان کی بے پناہ قوت اس کی پشت پر ہو ؟ انھوں نے گلی گلی کوچہ کوچہ اس پیغام کو سنایا ، میلوں اور منڈیوں میں اس کی اشاعت کی ، زبان سے اس کا اقرار کیا ، دل سے اس کی تصدیق کی ، عمل سے اس کا اظہار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے انہیں صادق اور امین کا خطاب دیا تھا جو ان کی دیانت کی قسم کھاتے تھے ، انہوں نے ہی شروع میں ان کا مذاق اڑایا اور بعد میں ان کو ہر طرح کی تکلیفیں پہنچائیں اور ان کی تعلیم کو خطرناک قرار دیا ۔ اور کیوں نہ دیتے ؟ وہ زندگی کو اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر کے عیش و عشرت اور نفس پرستی میں گذارنا چاہتے تھے اور یہ شخص ایک ایسے دین کو لے کر آیا تھا جس میں سارا زور اعتدال ، اخلاق اور شرافت پر تھا ۔ ان کی وفاداری قبیلوں کی چار دیواری کے اندر محصور تھی اور وہ ایک خدا اور انسانیت کے عالمگیر تصوّر کا قائل تھا ۔ وہ لوگوں کو بتاتا تھا کہ زندگی ایک امانت ہے جس کے لئے اس دنیا میں بھی جواب دہی ہے اور آخرت میں بھی اور ان لوگوں میں سرے سے نہ احساس فرض کا تصور تھا نہ جواب دہی کا ۔ وہ اخوت امن اور مساوات کا پیغامبر

تھا اور یہاں چھوٹے چھوٹے نسلی امتیاز اور جھوٹی بزرگیوں کے بت دلوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ انسانوں میں افضلیت کا معیار تقویٰ اور پرہیزگاری پر ہے اور ایک حبشی غلام جو یہ صفات رکھتا ہے ایک قریشی سید سے کہیں بہتر ہے جو ان صفات سے محروم ہو۔ لیکن عرب کے سردار جو احساس برتری کا شکار تھے "گھٹیا" لوگوں کو اپنا ہم پلّہ ماننے کو تیار نہ تھے کیونکہ یہ بات ان کے سارے نظام فکر کے خلاف تھی۔ لہٰذا یہ زندگی کے دو متضاد تصوروں کی ٹکر تھی جن میں کسی سمجھوتہ کا امکان نہ تھا۔ فرق یہ تھا کہ ایک طرف قدامت کا استحکام اور جمود کی طاقت تھی اور دوسری طرف صرف حق پرستی کا حوصلہ۔۔۔

لیکن نہ معلوم اس شخص کی زبان میں کیسا جادو اور سیرت میں کیا کشش تھی کہ باوجود خواص کی مخالفت اور ایذارسانی کے بہت سے عام لوگ اور خود ان کے خاندان اور قبیلے کے افراد ان کی طرف جھکنے لگے۔ ان کی صداقت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ سب سے پہلے اس تعلیم کا خیر مقدم اِن لوگوں نے کیا جو ان سے سب سے زیادہ قریب تھے یعنی ان کی بیوی حضرت خدیجہؓ، ان کے نوعمر چچازاد بھائی علیؑ، ان کے دوست حضرت ابوبکر، ان کے متبنّیٰ زید بن حارث اور ایک سیاہ رنگ روشن قلب حبشی غلام بلال جو اسلام کے پہلے موذن بنے۔ اب مدینے کے ارباب اختیار کو پریشانی ہوئی اور یہ فکر کہ یہ فتنہ محض ہنسی اڑانے یا جبر کرنے سے نہیں رکے گا۔ لہٰذا پہلا مدافعانہ حربہ یہ اختیار کیا گیا کہ ان کو لالچ دے کر اس خطرناک تعلیم کی اشاعت سے باز رکھا جائے! چنانچہ قریش کے ایک بااثر اور دولت مند سردار عتبہ نے پوری جماعت کی نمایندگی کرتے ہوئے ان سے کہا کہ اے میرے عزیز تم کیوں یہ سب حرکتیں کر رہے ہو؟ کیوں ہمارے معبودوں کو نہیں ماننے اور ان کے بجائے ایک اَن دیکھے، اَن جانے خدا کے وکیل بنے ہو؟ کیوں ہمارے پرانے طور طریقوں کو رد کرتے ہو؟ اگر ان تمام باتوں سے تمہارا مقصد مال اور دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہیں تمہاری خواہش سے زیادہ مالامال کر دیں گے۔ اگر عزت چاہتے ہو تو اپنا رئیس اور سردار مان لیں گے اگر حکومت کی آرزو ہے تو تمہیں عرب کا بادشاہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اگر تمہارا یہ سب دھندا

خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم تمہارے علاج کا بہترین انتظام کرادیں گے"۔ مگر اس ایلچی کو کیا خبر تھی کہ عشقِ الٰہی کا یہ "نشہ" یا "جنون" ایسا نہیں جو کسی دوا یا علاج سے دور ہوسکے؟ بڑی نرمی لیکن یقین کے ساتھ جواب ملا:

"آپ کا خیال صحیح نہیں۔ مجھے نہ مال و دولت چاہیئے، نہ دنیاوی عزت اور حکومت، نہ میرے دماغ میں کوئی خلل ہے۔ میں تو خدا کا ایک سیدھا سادا اور سچا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس میں بشارت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس کے فرمان کو مانیں اور تنبیہ ان کے لئے جو اس سے انکار کریں۔ میں بھی آپ سب کی طرح اس کا ایک معمولی بندہ ہوں، بس اتنی بات ہے کہ مجھ پر اس نے اپنی رحمت سے وحی کے ذریعہ سچائی کو واضح کردیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمام انسانوں کا معبود ایک خدا ہے اسی سے لو لگانی چاہیئے اسی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیئے۔ جو لوگ شرک کرتے ہیں، خیرات نہیں دیتے، آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ بہت گھاٹے میں ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ان کے لئے آخرت میں بڑا اجر ہے۔"

کچھ ایسا اثر تھا اس بیان کے خلوص اور یقین میں کہ عتبہ پر ایک محویت کا عالم طاری ہوگیا اور اس نے جاکر لوگوں سے کہا کہ میں نے محمدؐ سے باتیں کیں اور اس کا کلام سنا۔ اس میں نہ کہانت ہے، نہ شعر ہے، نہ جادو، نہ منتر بلکہ محض عقیدے اور دل کی بات کا اظہار ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، ان کی مخالفت نہ کرو۔ چنانچہ ترکش کا یہ تیر بیکار گیا۔ اب لالچ کے بعد خوف کا حربہ استعمال کرنے کی منزل آئی۔ انہوں نے رسول کے عم محترم حضرت ابوطالب کو پیغام بھیجا کہ ہم آپ کی بزرگی کے خیال سے اب تک چپ ہیں۔ اپنے بھتیجے کو سمجھا لیجیئے کہ وہ اس کام سے باز آئے ورنہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے۔

"ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے"۔ یہ وہ دھمکی ہے جو قوت نے حق کے خلاف ہمیشہ استعمال کی ہے۔ سچ کے پرستاروں کے سامنے موت کبھی زہر کا پیالہ بن کر آئی، کبھی اس نے صلیب کی شکل اختیار کی، کبھی آگ بن کر جلایا، کبھی آری اور خنجر بن کر سر کو تن سے جدا کیا۔ لیکن

اس نے کبھی ان عاشقان صادق پر فتح نہیں پائی۔ ان کے دل کی پکار ہمیشہ یہی رہی ہے کہ یا تو اپنے مقصود حقیقی کو حاصل کریں یا اس کشمکش میں جان، جان آفریں کے سپرد کر دیں۔ یہی محمدؐ عربی کے دل کی پکار تھی۔ جب ان کے سامنے خوف اور لالچ کے سارے واسطے رکھ دیئے گئے اور محبت کرنے والے چچا نے بھی کہا کہ جو کچھ کر رہے ہو اس کے سارے نتیجے سوچ لو تو انہوں نے جواب دیا اور یہ جواب انسانی فضیلت کی تاریخ میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔

"اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لا کر رکھ دیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر، تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا اور خدا کے حکم میں ایک حرف کی کمی بیشی نہ کروں گا خواہ اس کوشش میں میری جان ہی جاتی رہے۔"

پھر انھوں نے مطالبہ کیا کہ اگر تم خدا کے رسول ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ، پہاڑوں کو سامنے سے ہٹا دو، ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دکھاؤ، سونے چاندی کے خزانے محل اور باغ بنا کر دکھاؤ۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ "میں شعبدہ دکھانے نہیں بھیجا گیا۔ سچائی خود اپنی شہادت ہے۔ اس کے لئے معجزوں اور خلاف فطرت مظاہروں کی ضرورت نہیں۔ اگر تم میری تعلیم کو قبول کرو گے تو یہ تمہارے لئے دنیا اور آخرت کا سرمایہ ثابت ہوگی۔ اگر رد کرو گے تو انتظار کرو اس فیصلے کا جو خدا میرے اور تمہارے درمیان کرے گا۔"

اب سمجھوتے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی لیکن ایذا رسانی کے ہاتھ کون باندھ سکتا ہے۔ لوگ فرداً فرداً اور ٹولیاں بنا کر ان پر کیچڑ پھینکتے، پتھر مارتے، راستے میں کانٹے بچھاتے، کھانا پانی بند کر دیتے۔ وعظ کے دوران میں ان کی زبان بندی کی کوشش کرتے لعن وطعن کرتے، ان کو دیوانہ مشہور کرتے، ان کے قتل کے منصوبے بناتے لیکن ان کی زبان سے اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی کوئی سخت کلمہ نہ نکلا۔ جب کہا، یہی کہا 'بارالہا ان لوگوں کو معاف کر دے۔ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں'۔ ایک دفعہ کسی لڑائی میں ان کے جسم پر بہت سخت زخم لگے اور ان کے احباب نے کہا کہ آپ ان لوگوں کو بد دعا کیوں نہیں دیتے تو جواب ملا "میں لعنت

کرنے کے لئے نبی نہیں بنایا گیا۔ مجھے تو خدا کی طرف بلانے والا اور سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔
اے خدا میری اس گمراہ قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ جاہل اور بے خبر ہیں۔ یہ وہی پیغمبرانہ جذبہ ہے
جس کا اظہار مسیحؑ نے اپنی زندگی میں بار بار کیا تھا۔ چنانچہ کفار اپنی ان حرکتوں میں لگے رہے اور خدا کا
رسول ذاتی خطروں اور تکلیفوں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہا اور کام بھی انہیں کی خدمت
اور ہدایت جنہوں نے اس پر عرصہ حیات کو تنگ کر دیا تھا۔ یہ تھی اس کی اخلاقی عظمت اور اس کے
کردار کی بلندی!

(۵)

ایک مختصر سے مضمون میں اس عظیم مرتبت انسان کی اخلاقی اور روحانی خوبیوں کا کس
طرح احاطہ ہو سکتا ہے؟ دریا کو کوزہ میں کیسے بند کیا جا سکتا ہے؟ انسان کی حیثیت سے انہوں نے
ایک ایسی مثال دنیا کے سامنے پیش کی کہ ہر شخص کو اس کی تقلید کا حوصلہ ہو سکتا ہے حالانکہ
اس کمال تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ ان کی شخصیت اور زندگی رعب و جلال کی کیفیت سے
زیادہ محبت اور یگانگی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ایک موقعہ پر فرمایا "مجھ سے نہ ڈرو میں کوئی بادشاہ
نہیں ہوں، قریش کی ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی"۔ ان کی روزمرہ
کی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی سی تھی اور انہیں کے ساتھ ان کو خاص طور پر محبت اور یک جہتی کا
احساس تھا۔ ہر قسم کا ہاتھ کا کام خود کر لیتے تھے۔ اس میں کسی طرح کا عار نہ تھا۔ گھر کی صفائی کرتے،
مویشیوں کو چارہ ڈالتے، بازار سے سامان خریدتے، پھٹے کپڑوں کو پیوند لگاتے، ٹوٹے جوتے کو
گانٹھتے، نوکروں کے ساتھ بیٹھ کر موٹا جھوٹا کھانا کھاتے اور اگر بعض دفعہ کچھ بھی کھانے کو میسر نہ
ہوتا تو خدا کا شکر کرتے اور بھوکے ہی سو جاتے! کبھی کئی کئی ہفتے چولھے میں آگ نہ جلتی اور پانی
اور کھجوروں پر گذارا ہوتا۔ یہ حالت تھی اس زمانے میں بھی جب اس سرزمین عرب میں ان کو دنیاوی
حیثیت سے بھی ایک بادشاہ کا مقام حاصل تھا۔ لیکن خود اپنی دولت اور جو دولت بیت المال
میں آتی سب ضرورت مندوں اور غریبوں کی نذر تھی۔ اپنی ذات کے لئے صرف نہ ہوتی تھی۔ ایسا

شخص کس طرح عرب کے مغرور، امتیاز پسند سرداروں کو گوارا ہو سکتا تھا۔ کوئی غریب ان کے دربار میں چھوٹا نہ تھا۔ نہ کوئی دولتمند اور ذی وجاہت شخص امتیازی سلوک کا مستحق۔ سلام میں ہمیشہ سبقت کرتے تھے اور بچوں سے ہمیشہ شفقت اور عورتوں سے عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی انسان کی دل شکنی نہیں کی۔ کسی کو ذلیل نہیں کیا۔ ہر کسی کو اونچا اٹھانے کی کوشش کی شیریں کلامی کے ساتھ بات کرتے، رحم دلی کا سلوک کرتے، جو لوگ ان کے ساتھ بدی کرتے اس کا جواب نیکی سے دیتے۔ اگر بھولے سے بھی کسی کو ان کی وجہ سے تکلیف پہنچتی تو اس کی معافی مانگنے میں اتنی ہی عجلت کرتے جس قدر دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کرنے میں۔ انتقام کا جذبہ کبھی اس قلب پاک میں پیدا نہیں ہوا مخالفوں کے ظلم وستم کی وجہ سے کئی سال تک اپنے وطن سے باہر رہے۔ جب ایک کامیاب فاتح کی حیثیت سے مکّہ میں داخل ہوئے تو وہاں کے شریر اور مفسد لوگوں کو (جنھوں نے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی تھیں) اندیشہ تھا کہ انہیں اپنی بداعمالیوں کی سزا ملے گی لیکن انکی حیرت کی انتہا نہیں رہی (حالانکہ انہیں حیرت نہ ہونی چاہیئے تھی) جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی زبان پر قرآن کی یہ آیت ہے:

"آج کے دن (میری جانب سے) تم پر کوئی سرزنش نہیں (جو ہونا تھا وہ ہو چکا) اللہ تمہارا قصور بخشدے۔ وہ تمام رحم کرنے والوں میں سے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"!

یہی رحم، ہمدردی، محنت، امن پسندی اس پیغمبر امن کی سیرت کی مرکزی صفات تھیں لیکن کسی شخص کے کردار کا پورا اندازہ اس کے کارناموں سے نہیں ہوتا۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا اثر اس کے عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں بلکہ مخالفوں کی زندگی پر کیا ہوا۔ اس اعتبار سے محمدؐ عربی کا اثر معجزے کا حکم رکھتا ہے۔ جو لوگ ایک دفعہ ان کی صحبت کا پورا فیض پاتے ہمیشہ کے لئے ان کے اثر میں آجاتے اور ان کی دنیا ہی بدل جاتی، زندگی کا تصور بدل جاتا، اس کی قدریں بدل جاتیں، کامرانی اور ناکامی کے اندازے بدل جاتے۔ گویا خرد کا نام جنوں ہو جاتا اور جنوں کا خرد! عقل دنیا دار جس نے اب تک عیش وعشرت کی جستجو کو مقصود حیات

سمجھا تھا اب خدا کی رضا اور رسول کے عشق میں خوشی اور اطمینان کی تلاش کرتی اور راستے کے کانٹوں کو پھول سمجھ کر چن لیتی۔ بلال ایک حبشی غلام تھا۔ نور الٰہی کی چنگاری اس کے دل میں چمکی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ اس جرم کی پاداش میں کیا کیا سلوک ان کے ساتھ نہیں ہوئے، گردن میں رسّی ڈال کر لڑکے انہیں مدینے کی گلیوں میں کھینچتے ہوئے تپتی ہوئی ریت پر بٹھاتے اور گرم گرم پتھر کی سلیں چھاتی پر رکھتے۔ ان کا کھانا پانی بند کیا جاتا اور لکڑیوں سے پیٹا جاتا۔ لیکن ان کے ایمان میں خلل نہ آیا اور زبان سے خدا کے نام کے سوا کچھ نہ نکلا۔ جنگ اُحد کے دوران میں ایک مسلمان عورت کو خبر ملتی ہے کہ اس کا بھائی شہید ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ راہ خدا میں کام آیا۔ پھر باپ کی شہادت کی خبر ملی۔ اس نے دوبارہ خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر شوہر کی سنائی ملی۔ اس نے کمال صبر کے ساتھ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کہا اور اشتیاق کے ساتھ پوچھا کہ خدا کا رسول بھی زندہ ہے۔ جب ان کی خیریت کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو کہا "الحمد للّٰہ۔ اب ہر مصیبت برداشت ہو سکتی ہے"، ایک صحابی تھے حضرت خبیب۔ ان کے جگر کو نیزہ سے چھید کر کافروں نے پوچھا کہ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے اور محمد ؐ تمہاری جگہ لے لیں۔ جواب ملا "خدا واقف ہے کہ میں اس بات کے لئے بھی تیار نہیں ہوں کہ میری جان بچ جائے اور اس کے بدلے رسول کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے۔" اور جب انہیں پھانسی دی جا رہی تھی تو ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے: 'یہ لوگ کہتے ہیں کہ کفر اختیار کر دو تو آزادی مل سکتی ہے مگر میرے لئے اس کے مقابلہ میں موت زیادہ آسان اور قابل قبول ہے۔ میں نہ ان کے سامنے عاجزی کروں گا نہ گریہ و زاری کیونکہ میں تو اپنے خدا کے پاس جا رہا ہوں۔ میرے لئے یہ باعث فخر ہے کہ عرشِ عظیم کے مالک نے مجھ سے کوئی خدمت لی اور مجھے اس حالت میں صبر کی توفیق دی'۔ یاد رہے کہ یہ ذکر صرف رسول کے جلیل القدر صحابیوں کا نہیں، جن کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں اور جن کے فضائل سے دنیائے اسلام واقف ہے۔ ان میں ان کے معمولی عقیدت مند بھی شامل ہیں جن کے دل پر ایک بجلی چمکتی تھی اور ان کی دنیا بدل جاتی تھی۔

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے   ما بے خبراں منتظر شمع وچراغیم

مسیحؑ کو عمر بھر کی ریاضت اور تلقین کے بعد بارہ حواری ملے تھے (اور ان میں سے ایک یہوداہ تھا جس نے آخری وقت میں اپنے رہبر کے ساتھ دغا کی)، ایک مبصر نے لکھا ہے کہ تعجب تعداد کی کمی پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ مسیحؑ کو اتنے وفادار اور مخلص پیرو بھی مل گئے لیکن رسول عربی کا کارنامہ یہ ہے کہ ان کو سینکڑوں ایسے ساتھی ملے جنھوں نے اپنی جان و مال، اولاد، عزت، عیش و عشرت ہر چیز کو رسولؐ کی خوشنودی پر قربان کر دیا۔ تاریخ ایک بھی ایسے شخص کا نام نہیں بتاتی جس نے انعام کے لالچ میں یا مصیبتوں کے خوف سے اپنے راستہ کو چھوڑا یا صداقت سے منہ موڑا ہو۔ بقول مولانا آزاد کے، انہوں نے اپنے سارے پچھلے رشتے بھلا دیئے تھے اور صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی یعنی سب اللہ کے رسول کے فدائی اور اس کے حُسن جہاں آرا پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے والے تھے

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ وچمن   ہمہ زخویش بریدند و در تو پیوستند!

(۶)

آپ نے دیکھیں اس برگزیدہ رسول اور ان کے احباب کی سیرت کی چند جھلکیاں۔ ان کی تعلیم کے چند انقلابی پہلو بھی دیکھ لیجیے جو ایک لحاظ سے آج بھی اتنے ہی انوکھے ہیں جس قدر چودہ سو برس پہلے تھے۔ انہیں مخالفوں کی سرکشی اور حق ناشناسی کی وجہ سے کئی مرتبہ لڑائیوں میں شریک ہونا پڑا لیکن کسی موقع پر انھوں نے عدل اور رحم و شرافت کے ان آداب کو ہاتھ سے نہیں دیا جو انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں برتے تھے اس کے مقابلہ میں تہذیب کے اس دور میں جب انسان کا علم اور اس کی قدرت کمال کو پہنچ گئی ہے اور مذہب، فلسفہ اور اخلاق کی تمام نسلی دولت اس کا سرمایہ ہے، جنگ کے سلسلے میں کیا کیا بربریت روا نہیں رکھی گئی اور انسان نے انسان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا جس کی وجہ سے ہمارا سر خونخوار درندوں کے سامنے بھی شرم سے جھک جاتا ہے۔

عرب کے اس نبی رحمت نے اپنے ساتھیوں کو ایسے آداب جنگ کی تعلیم دی جنھوں نے جنگ کو بھی گویا ایک تعلیمی ادارہ بنا دیا۔ جنگ میں جو قیدی ہاتھ آتے ان کی خبر گیری مہمانوں کی طرح کی جاتی اور ان کی خوراک اور لباس کا مناسب انتظام کیا جاتا۔ جس وقت رسول خدا فاتح کی حیثیت سے مدینے میں داخل ہوئے تو فوج کو مندرجہ ذیل احکام دیے گئے۔ ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل ہر شخص کی جان بخشی کا اعلان تھا جو بالکل ہی خودکشی کا تہیہ نہ کر چکا ہو!

۱۔ جو شخص ہتھیار پھینک دے اس کو قتل نہ کیا جائے۔

۲۔ جو شخص خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے اس کو قتل نہ کیا جائے۔

۳۔ جو شخص (ایک مقامی باشندے) حکیم بن حزام کے گھر میں پناہ لے اس کو قتل نہ کیا جائے۔

۴۔ زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔

۵۔ اسیر کو قتل نہ کیا جائے۔

۶۔ بھاگ جانے والے کا پیچھا نہ کیا جائے۔

قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی یہ مثال قائم کی کہ جس قدر لوگ حنین میں گرفتار ہوتے تھے ان میں سے جتنے اپنے یا حضرت مطّلب کے خاندان والوں کے حصّے میں آئے تھے ان سب کو علی الاعلان بلا کسی معاوضہ کے آزاد کر دیا۔ چنانچہ انصار اور مہاجرین کو بھی ان کی پیروی میں ایسا ہی کرنا پڑا۔ چند لوگ ایسے بھی تھے جو اس بات پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے حصّے کے قیدیوں کو رسولؐ خدا نے خود چھ اونٹ فی نفر کے حساب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ یاد رہے کہ ان میں بہت سے لوگ وہ تھے جو انہیں ایذائیں پہنچانے اور ان پر پتھر برسانے میں پیش پیش رہے تھے!

جب اسلام کے دور اول میں مسلمان مکّے سے ہجرت کر کے مدینے یا حبش چلے گئے تو ان کی غیر حاضری میں ان کے مکانوں اور جائداد پر اہل مکّہ نے قبضہ کر لیا۔ مدینے میں فاتح کی

حیثیت سے واپس اگر انہوں نے رسولِ خدا سے درخواست کی کہ ہماری جائداد یں واپس دلادی جائیں۔ جواب ملا "جن چیزوں کو تم راہِ خدا میں چھوڑ چکے ان کی واپسی کا سوال کیوں کرتے ہو؟" اوران کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔ کس قدر مختلف ہے یہ اندازِ نظر اس رویہ سے جو اس دور تمدن میں رائج ہے!

بہت سے موقع ایسے پیش آئے جب انہوں نے اپنے عقیدت مندوں کو اپنے خطبوں میں نہ صرف اسلام کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دی بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی جن کی اہمیت بہت زیادہ ہے ان کو جینے کا سلیقہ سکھایا اور ایک دوسرے سے اور تمام انسانوں سے میل جول کی شرافتیں سکھائیں۔ جس طرح اشوک اعظم کے فرمان لوہے اور پتھر کے مناروں پر کندہ ہیں، اسی طرح انکے فرمان ثقہ راویوں کے ذریعہ پوری صحت کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں اور کتابوں اور لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہیں۔ مکّے سے ہجرت کا پہلا سال تھا۔ مہاجرین نے ایک چھوٹی سی مسجد کی بنیاد ڈالی تھی پہلے تاریخی خطبہ کے موقع پر کئی سو مسلمان وہاں جمع تھے۔ اور خدا کا یہ رسولؐ اپنے خطاب کے دوران میں زندگی کے بھید ان پر کھول رہا تھا:

"میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں۔ وہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے جس کو اس نے ہدایت، نور اور نصیحت دے کر بھیجا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب مدت سے کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ علم گھٹ گیا تھا اور انسانوں کی گمراہی بڑھ گئی تھی . . . جو شخص خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے (یعنی نیکی کے راستہ پر چلتا ہے) وہ ہدایت پاتا ہے۔ جو ان کا حکم نہیں مانتا وہ راستے سے بھٹک جاتا ہے اے مسلمانو (خدا کی نعمتوں سے) لطف اٹھاؤ لیکن اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو۔ اس نے تمہارے لئے اپنی کتاب بھیجی ہے اور تمہیں اپنا رسیدھا، راستہ دکھایا ہے تاکہ راست باز اور باطل پرستوں میں تمیز ہو سکے . . . . اے لوگو خدا کو یاد کرو اور آئندہ زندگی کو پیش نظر رکھ کر (نیک) کام کرو، کیونکہ جو شخص اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ درست کر لیتا ہے تو اللہ اس کے اور دوسرے

لوگوں کے باہمی معاملات کو بھی درست کر دیتا ہے۔"

اس مختصر سے آخری جملے میں انہوں نے اس گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دین اور دنیا میں اور روحانی اور مادی قدروں میں کوئی تضاد نہیں۔ جو شخص دین کے معاملے میں شرافت کے اصول کا پابند ہے وہ دنیا کے معاملات میں بھی انہیں اصولوں کو برتے گا اور مسجد اور منڈی کے لئے دو بالکل مختلف طریقۂ فکر و عمل اختیار نہ کرے گا۔ اس کے دل کی پکار یہی ہوگی کہ" اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا کی نیکیاں اور بھلائیاں بھی دے اور آخرت کی بھی"۔ کیونکہ یہ دنیاوی زندگی آخرت کے لئے کاشت ہے، جیسا ہم یہاں بوئیں گے، ویسا وہاں کاٹیں گے۔

ان کی نظر حقیقت شناس نے انسانی فطرت کی چھپی ہوئی کمزوریوں کو تلاش کیا، بڑی دل سوزی اور وضاحت خیال کے ساتھ ان کی طرف توجہ دلائی اور ان کا علاج تجویز کیا۔ ایک خطبے میں جو خطبۂ تبوک کے نام سے مشہور ہے زندگی کے لئے ہدایتیں موتیوں کی لڑی کی طرح پروئی ہوئی ہیں اور ان میں ایک ایسا اعجاز بلاغت ہے جو عربی زبان کا مخصوص حصّہ ہے۔ ان میں سے نمونے طور پر چند کے تیور ملاحظہ ہوں:

سب باتوں سے بڑھ کر بھروسہ کی بات تقویٰ ہے اور سب باتوں پر اللہ کے ذکر کو شرف حاصل ہے! تمام اعمال میں افضل وہ عمل ہے جس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے!

دل کا اندھا ہونا سب سے بڑی کوری ہے!

سب سے بڑی دولت دل کی دولت ہے! دولت مندی، زر و مال کی کثرت نہیں۔ غنی وہ ہے جس کا دل غنی ہو۔

بلند ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) پست ہاتھ (یعنی لینے والا ہاتھ) سے بہتر ہے!

دانائی کا سرچشمہ دل میں خوف خدا کا ہونا ہے!

جو شخص دوسروں کے عیب چھپاتا ہے خدا اس کے عیب ڈھانپتا ہے

جو شخص چغلی پھیلاتا ہے، خدا اس کی رسوائی عام کرتا ہے!

قابلِ رشک ہے وہ مال دار جس کو دولت کے صحیح مصرف کی توفیق ہو!

قابل رشک ہے وہ شخص جس کو خدا نے حکمت دی ہو، جو اس پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے!

پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا لاد کر لانا بھیک مانگنے سے بہتر ہے! محنت کر کے کمانے والا خدا کا دوست ہے!

یہ ہیں وہ اصول جو فرد کی سیرت کو سنوارتے ہیں۔ انہیں کا پرتو فرد اور جماعت کے تعلقات کی تفسیر میں بھی نظر آتا ہے۔ عرب کے اس رسولِ اُمّی کی حدیثیں (جس نے کسی مدرسے میں کسی استاد سے باضابطہ تعلیم نہیں پائی) اس مضمون پر ہر ہر پہلو سے کیسی دل نشین روشنی ڈالتی ہیں۔

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں!

تم میں سے کوئی مومن نہیں بن سکتا جب تک اپنے بھائی کیلئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے!

(یاد رہے کہ ان کے تصورِ حیات میں ہر انسان دوسرے تمام انسانوں کا بھائی ہے کہ سب ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں)

خبردار بدگمانی کو اپنی عادت نہ بناؤ کہ وہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ۔ اے اللہ کے بندو، آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو!

دوسروں کے عیب کو تلاش نہ کرو، آپس میں بغض اور نفرت نہ رکھو۔ کسی انسان سے منہ نہ موڑو۔

جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے لازم ہے کہ اپنے ہمسایہ کو ایذا نہ پہنچائے (اور آج کی دنیا میں کون کس کا ہمسایہ نہیں ہے؟) اپنے مہمان کی عزت کرے، بات کہے تو اچھی کہے، ورنہ خاموش رہے! (آداب کلام کا اس سے بہتر گُر کیا ہو سکتا ہے؟)

قوت کا ثبوت دوسروں کو زیر کرنا نہیں بلکہ غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھنا ہے!

(نیکی اس میں ہے کہ) اسیروں کو رہائی دلاؤ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، بیماروں کی خبر گیری کرو!

قیامت کے دن خدا کا سایہ ہوگا اس شخص پر جو چھپ کے خیرات کرتا ہے، اس شان سے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا!

عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر، کالے کو گورے پر، گورے کو کالے پر کوئی افضلیت نہیں کیونکہ فضیلت کا معیار تقویٰ یعنی خدا ترسی ہے!

اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم معاہد (رعایا) کو قتل کرے گا وہ بہشت کی خوشبو بھی نہ سونگھ پائے گا، حالانکہ یہ خوشبو چالیس سال کے فاصلے سے آنے لگتی ہے!"

یہ ہیں وہ قدریں جو ذاتی اور اجتماعی زندگی کی صالح تشکیل کے لئے ضروری ہیں، جو دیکھنے میں بالکل واضح اور بدیہی معلوم ہوتی ہیں لیکن سوائے ان لوگوں کے جن کو توفیق الٰہی اور ضمیر کی دولت حاصل ہے، کس قدر دور ہیں یہ عام لوگوں کی زندگی اور عمل سے! جب تک یہ ہمارے فکرو نظر میں، ہمارے قول و فعل میں رچ نہ جائیں ہم زندگی کا کوئی بڑا یا چھوٹا مسئلہ خوش اسلوبی اور سلامتی سے طے نہیں کرسکتے۔ جب کبھی دنیا کی تاریخ میں یہ چراغ ٹمٹمانے لگتے ہیں، ان کی حفاظت کے لئے ایسے ہی روحانی سرچشموں سے ہدایت حاصل کرنی ہوتی ہے۔

(۷)

ایک اور مخصوص پہلو اس رسول اکرم کی تعلیم کا یہ ہے جیسا میں نے اس باب کے شروع میں ذکر کیا کہ انہوں نے دنیا کے سامنے مذہب کا ایک ارتقائی نظریہ پیش کیا۔ یعنی مختلف مذہب، جو خدا کے بھیجے ہوئے نیک بندے مختلف زمانوں میں لائے وہ ایک دوسرے کے نقیض یا رقیب نہیں بلکہ ایک زریں سلسلے کی کڑیاں ہیں اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں خدا کا پیغام بر نہ آیا ہو کہ لوگوں کو بداعمالیوں کے نتیجے سے خبردار کرے اور ان کو راہ راست پر چلنے کی ترغیب دے۔ ان سب کی تعلیم بنیادی اعتبار سے یکساں ہے۔ ان کے اصول مستقل اور ابدی ہیں۔ گو ان کی تفسیر اور تعبیر میں ان کی فروع (شاخوں) میں زمانے کے

حالات اور ضرورتوں اور نفس انسانی کی تربیت اور ترقی کے مطابق تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اس لئے
لازم آتا ہے کہ ہم سب مذہبوں کے بانیوں اور خدا کے پیغامبروں کا دل سے احترام کریں اور ان
کی تعلیم کا ادب سے مطالعہ کریں۔ یہ دراصل ایک ایسا اصول ہے جو رواداری کو مصلحت پسندی
سے بلند کرکے ایک قدر مستقل بنا دیتا ہے اور نام نہاد "مذہبی" لڑائیوں اور فسادوں کی بیخ کنی
کرتا ہے۔ محمدؐ عربی کی دینی دعوت کے تصور پر جبر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی بلکہ انہوں نے ہر
موقع پر بار بار بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ ہر قوم کی اپنی شریعت
اور طریقہ زندگی ہے جس پر قائم رہنے کا اسے حق ہے۔ اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسے ترک
کرکے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے۔ سچائی اسی وقت سچائی ہے جب ہم دل کی گہرائیوں سے
اس پر ایمان لائیں ورنہ کسی لالچ یا دباؤ سے اس کا زبانی اقرار کرنا بالکل بے معنی ہے۔ اختلاف تو
انسانی فطرت کا جزو ہے۔ اس کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ سچائی کی تلاش میں تبادلہ خیال کی ضرورت
ہے اور دل کو تعصب اور تنگ نظری اور قدامت پرستی کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی۔ اس کے
بعد عقل خداداد خود اپنا راستہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ خدا کے رسول کا کام راستہ کی نشان دہی کرنا ہے۔
وہ "ٹھیکہ دار" بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ زبردستی سب کو ایک ڈگر پر چلائے۔ "اگر تیرا پروردگار چاہتا تو دنیا کے
تمام سننے والے ایمان لے آتے۔ (لیکن اس نے ایسا نہیں کیا) پس کیا اے رسول تم ان لوگوں پر
جبر کر سکتے ہو کہ وہ ایمان لائیں؟ (ہرگز نہیں)" "تمہارا فرض تو ذکر الٰہی کرنا اور خدا کے راستے کی طرف
حکمت اور شیریں کلامی کے ساتھ بلانا ہے اور بس!" "اگر کوئی مشرک بھی تمہارے پاس آکر پناہ
مانگے تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ تم اس کو پناہ دو۔ پھر اس کو کلام الٰہی سناؤ۔ اس کے بعد اسے
(احتیاط کے ساتھ) اس کے مسکن پر پہنچا دو۔" یعنی علم و اخلاق کی جو روشنی خدا کی رحمت سے تمہارے
نصیب میں آئی ہے۔ اس کو دوسروں کو سامنے پیش کرنا تمہارا کام ہے لیکن تم اسے زبردستی کسی پر
عاید نہیں کر سکتے۔ پھر خدا سمجھے ان انصاف ناشناسوں کو جو ان صریح حکموں کی موجودگی میں یہ
ثابت کرنے کی فکر کرتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے!!

اس تعلیم کے بنیادی اصول اور عقائد جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے دراصل انسان کے اخلاقی اور روحانی شعور کی تفسیر ہیں۔ اس میں پہلا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ایک قادر مطلق خدا کے وجود کا اعتراف کیا جائے جو ہر جگہ موجود ہے، جس کی ہر جگہ حکمرانی ہے، جس کی عبادت اور اطاعت ہر انسان کا فرض ہے جو خدائے رحمت و محبت ہے، خدائے غضب و انتقام نہیں، جس نے انسان کو عقل اور ضمیر کی دولت دی تاکہ وہ خیر اور شر میں تمیز کرنا سیکھے۔ دوسرا عقیدہ عقیدہ عدل ہے۔ یعنی خدا ظالم نہیں بلکہ صاحب انصاف ہے اور جس طرح اس کے ہاں ہر معاملہ میں انصاف کی کارفرمائی ہے (خواہ ظاہر بین نگاہیں اس کو نہ دیکھ سکیں) اس طرح انسانی رشتوں اور تعلقات میں انصاف برتنا انسان کا شرف ہے۔ اسلام نے حُسن، خیر اور حق کی قدروں کے ساتھ جو قدیم یونانی تہذیب کا امتیاز ہیں، عدل کو بھی ایک بلند مقام بخشا ہے۔ تیسرا عقیدہ جس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے، خدا کے رسولوں پر ایمان ہے جو ابتدائے آفرینش عالم سے انسان کی ہدایت کے لئے آتے رہے ہیں اور جن کی عزت ایک طرف حق کا احترام ہے اور دوسری طرف مذہبی رواداری کی بنیاد۔ مسلمانوں کے آخری نبی محمدؐ عربی ہیں جن کے پیام اور کلام کو ان کے بعد اماموں اور خدا کے نیک بندوں نے دنیا میں قائم رکھا اور پھیلایا ہے اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں۔ زمانہ آج بھی صداقت پرستوں سے مختلف شکلوں میں قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ پھر قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے یعنی انسان کی زندگی تاریکی کے سمندر میں شرارے کی سی عارضی چمک نہیں کہ ایک لمحہ کے لئے روشن ہوئی اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی بلکہ اس کے لئے مکافاتِ عمل کا قانون ہے۔ کام اور خیال اور نیت کے نتیجوں کیلئے جواب دہی ہے، اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی۔ یہی ذمہ داری، کاموں کی تول، نیک اور بدی کی پرکھ اور ان کا مناسب بدلہ زندگی کا تانا بانا ہے۔ اور جو شخص ایک رائی کے دانے کے برابر نیکی کرے گا وہ دیکھی جائے گی اور جو ایک رائی کے دانے کے برابر برائی کرے گا وہ بھی دیکھی جائے گی، یہ بہی کھاتا کبھی بند نہیں ہوتا، کبھی گم نہیں ہوتا۔ قیامت ایک روز موعود تک محدود نہیں بلکہ ہماری زندگی کے ایک ایک قدم پر اس کا سایہ ہے۔ ہمارے علم

اور اخلاق پر، ہمارے دینی اور دنیوی کاروبار پر، ہماری ذاتی اور اجتماعی زندگی پر اور ہماری عقل خود پسند پر جس کا غرور اکثر خدا کو بھی بھلا دیتا ہے

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزان نیست　　نگاہ بندۂ مومن قیامت خرد است!

اسی تعلیم کا فیض تھا کہ عرب میں اور اس کے بعد دوسرے ملکوں میں جہاں جہاں اس برگزیدہ بندہ خدا کی آواز پہنچی اور اس کی چوٹ حساس دلوں پر پڑی، ان کی زندگی اور زندگی کے تعلقات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا خصوصاً ان طبقوں کو آزادی اور انسانی حقوق کا ایک نیا چارٹر مل گیا جن کو سماج کے ظلم اور بے حسی نے جانوروں کی حیثیت دے رکھی تھی۔ تاریخ میں مدت تک یہ بحث چلتی رہی کہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی روح ہے یا نہیں؟ مگر انہوں نے عورتوں کو مردوں کا ہم دوش قرار دیا، تعلیم کے دروازے ان پر کھولے، ماں باپ کی جائداد میں ان کا حصّہ تسلیم کیا۔ شوہروں کی طرف سے مہر کا ادارہ قائم کیا، خلاف مرضی شادی کو ممنوع کیا، طلاق اور خلع کے ذریعہ صحبت ناجنس کے عذاب کو دور کرنے کا راستہ نکالا، بیواؤں کی شادی کو، کہ سماج کی نظر میں مردود تھی، جائز قرار دیا۔ غرض ہر حیثیت سے ان کے جائز حقوق ان کو دلانے کی کوشش کی۔ اسی طرح غلاموں کی حالت ناقابل بیان تھی۔ انہوں نے نہ صرف غلامی کے تصوّر کو خلاف انسانیت قرار دے کر اسے مسترد کیا بلکہ اس پر ایسی پابندیاں لگائیں اور حسن سلوک کے ایسے نمونے اور اصول قائم کئے کہ یہ دستور رفتہ رفتہ ناپید ہوتا گیا اور جہاں کہیں غلام باقی رہے وہ بھی گویا خاندان کا جزو بن گئے اور ان پر سے ایک مستقل کمتری اور ذلت کا کلنک دور ہو گیا۔ خادموں کے ساتھ سلوک اور احسان اور انصاف کی ایسی سنت قائم کی کہ رسول کے گھر میں آقا اور ملازم کی تمیز بالکل اٹھ گئی۔ رسولؐ کی چہیتی بیٹی فاطمۂ زہرا نے ساری عمر اپنے گھر میں محنت مزدوری کی، ہاتھ کے سب کام کئے، کھانا پکایا، جھاڑو دی، کپڑے سئے اور جب ایک خادمہ (فضّہ) ہاتھ بٹانے کے لئے میسر ہوئیں تو بندھا ہوا معمول یہ تھا کہ ایک دن سارا کام خود کرتیں دوسرے دن فضّہ کی باری آتی۔ رشتہ مساوات کا تھا، آقائی نہ تھی لیکن اسی کا فیض تھا کہ فضّہ نے اپنی محبّت، جاں نثاری اور وفاداری

کے ذریعہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کرلیا کہ فاطمہؑ کے ساتھ ان کا نام بھی عزت اور عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہی صورت اسلام کے موذن اول بلال کی تھی جو ابتدا میں ایک حبشی غلام تھے لیکن ان کا نام آج تک منارہ عظمت کی زینت ہے۔

اس تعلیم کا شاید سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے نسل، رنگ، دولت اور ذات پات کے چھوٹے امتیازوں کو دور کرکے اخوت اور مساوات کو اجتماعی زندگی کا بنیادی اصول قرار دیا۔ اس کے اثر سے ایک حد تک مختلف نسلوں قبیلوں اور مذہبوں کے لوگ جو ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے محبت یگانگی کے ایک سلسلے میں گندھ گئے۔ ایک طرف اس نے خدا کی عظمت اور کبریائی کا نقش انسان کے دل پر بٹھایا اور دوسری طرف انسان کو اس کا صحیح مقام دکھایا جو نیابت الٰہی کا مقام ہے، جہاں انسان اپنی اخلاقی جدوجہد کے ذریعہ دنیا میں مشیت الٰہی کی تکمیل کرنے کا حوصلہ دکھاتا ہے۔ اس نے خیر و شر کا ایک عالم گیر تصور انسان کے سامنے پیش کیا جس نے جغرافی حد بندیوں کو نظر انداز کرکے انسانوں کو شرافت اور امن دوستی کی بنیادی قدروں پر جمع کرنے کی کوشش کی کہ وہی اتحاد اور محبت کا راستہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سورہ فاتحہ کی تفسیر کے آخری باب میں اس سورت کی "تعلیمی روح" بیان کی ہے جو در اصل اسلام کی تعلیمی روح ہے اور پیغمبر اسلام کے عالم گیر تصور انسانیت کی تفسیر۔ پہلے اس سورہ کا ترجمہ پیش کرتا ہوں اور پھر مولانا کی تفسیر کے چند جملے جو محمدؐ عربی کی تعلیم اور ہر شریف انسان اور سچے مسلمان کے دل اور دماغ کی بہت موثر تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس سے بہتر خاتمہ اس مضمون کے لئے میرے ذہن میں نہیں آسکتا۔

"ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے، جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالامال کررہی ہے۔ جو اس دن کا مالک ہے جس دن (اپنے) کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصہ میں آئے گا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔

اور اخلاق پر، ہمارے دینی اور دنیوی کاروبار پر، ہماری ذاتی اور اجتماعی زندگی پر اور ہماری عقل خود پسند پر جس کا غرور اکثر خدا کو بھی بھلا دیتا ہے

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزان نیست　　نگاہ بندۂ مومن قیامت خرد است!

اسی تعلیم کا فیض تھا کہ عرب میں اور اس کے بعد دوسرے ملکوں میں جہاں جہاں اس برگزیدہ بندہ خدا کی آواز پہنچی اور اس کی چوٹ حساس دلوں پر پڑی، ان کی زندگی اور زندگی کے تعلقات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا خصوصاً ان طبقوں کو آزادی اور انسانی حقوق کا ایک نیا چارٹر مل گیا جن کو سماج کے ظلم اور بے حسی نے جانوروں کی حیثیت دے رکھی تھی۔ تاریخ میں مدت تک یہ بحث چلتی رہی کہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی روح ہے یا نہیں؟ مگر انہوں نے عورتوں کو مردوں کا ہم دوش قرار دیا، تعلیم کے دروازے ان پر کھولے، ماں باپ کی جائداد میں ان کا حصہ تسلیم کیا۔ شوہروں کی طرف سے مہر کا ادارہ قائم کیا، خلاف مرضی شادی کو ممنوع کیا، طلاق اور خلع کے ذریعہ صحبت ناجنس کے عذاب کو دور کرنے کا راستہ نکالا، بیواؤں کی شادی کو، کہ سماج کی نظر میں مردود تھی، جائز قرار دیا۔ غرض ہر حیثیت سے ان کے جائز حقوق ان کو دلانے کی کوشش کی۔ اسی طرح غلاموں کی حالت ناقابل بیان تھی۔ انہوں نے نہ صرف غلامی کے تصوّر کو خلاف انسانیت قرار دے کر اسے مسترد کیا بلکہ اس پر ایسی پابندیاں لگائیں اور حسن سلوک کے ایسے نمونے اور اصول قائم کئے کہ یہ دستور رفتہ رفتہ ناپید ہوتا گیا اور جہاں کہیں غلام باقی رہے وہ بھی گویا خاندان کا جزو بن گئے اور ان پر سے ایک مستقل کمتری اور ذلت کا کلنک دور ہو گیا۔ خادموں کے ساتھ سلوک اور احسان اور انصاف کی ایسی سنت قائم کی کہ رسول کے گھر میں آقا اور ملازم کی تمیز بالکل اٹھ گئی۔ رسولؐ کی چہیتی بیٹی فاطمہؓ زہرا نے ساری عمر اپنے گھر میں محنت مزدوری کی، ہاتھ کے سب کام کئے، کھانا پکایا، جھاڑو دی، کپڑے سئے اور جب ایک خادمہ (فضّہ) ہاتھ بٹانے کے لئے میسر ہوئیں تو بندھا ہوا معمول یہ تھا کہ ایک دن سارا کام خود کرتیں دوسرے دن فضّہ کی باری آتی۔ رشتہ مساوات کا تھا، آقائی نہ تھی لیکن اسی کا فیض تھا کہ فضّہ نے اپنی محبت، جاں نثاری اور وفاداری

کے ذریعہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کرلیا کہ فاطمہؓ کے ساتھ ان کا نام بھی عزت اور عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہی صورت اسلام کے موذن اول بلال کی تھی جو ابتدا میں ایک حبشی غلام تھے لیکن ان کا نام آج تک منارہ عظمت کی زینت ہے۔

اس تعلیم کا شاید سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے نسل، رنگ، دولت اور ذات پات کے چھوٹے امتیازوں کو دور کرکے اخوت اور مساوات کو اجتماعی زندگی کا بنیادی اصول قرار دیا۔ اس کے اثر سے ایک حد تک مختلف نسلوں قبیلوں اور مذہبوں کے لوگ جو ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے محبت یگانگی کے ایک سلسلے میں گندھ گئے۔ ایک طرف اس نے خدا کی عظمت اور کبریائی کا نقش انسان کے دل پر بٹھایا اور دوسری طرف انسان کو اس کا صحیح مقام دکھایا، جو نیابت الٰہی کا مقام ہے، جہاں انسان اپنی اخلاقی جدوجہد کے ذریعہ دنیا میں مشیت الٰہی کی تکمیل کرنے کا حوصلہ دکھاتا ہے۔ اس نے خیر و شر کا ایک عالم گیر تصور انسان کے سامنے پیش کیا جس نے جغرافی حدبندیوں کو نظر انداز کرکے انسانوں کو شرافت اور امن دوستی کی بنیادی قدروں پر جمع کرنے کی کوشش کی کہ وہی اتحاد اور محبت کا راستہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سورہ فاتحہ کی تفسیر کے آخری باب میں اس سورت کی "تعلیمی روح" بیان کی ہے جو در اصل اسلام کی تعلیمی روح ہے اور پیغمبر اسلام کے عالم گیر تصور انسانیت کی تفسیر۔ پہلے اس سورہ کا ترجمہ پیش کرتا ہوں اور پھر مولانا کی تفسیر کے چند جملے جو محمدؐ عربی کی تعلیم اور ہر شریف انسان اور سچے مسلمان کے دل اور دماغ کی بہت موثر تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس سے بہتر خاتمہ اس مضمون کے لئے میرے ذہن میں نہیں آسکتا۔

"ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے، جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالامال کر رہی ہے۔ جو اس دن کا مالک ہے جس دن (اپنے) کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصہ میں آئے گا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔

(خدایا!) ہم پر سعادت کی سیدھی راہ کھول دے وہ راہ جو ان قوموں کی راہ ہے جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ ان کی جو راہ بھٹک گئے۔"

آخری تین آیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے۔ لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی طبقے کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو تمام رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ اس طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے۔ لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل یا قوم یا کسی مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوع انسان کی عالم گیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوع انسان کی عالمگیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی، تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی!

غور کرو، مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن اور عواطف کے لیے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے! جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا۔ کم از کم دو باتوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی، خدا کی عالم گیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی۔ دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی وہ نسل، قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا، عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا اور دعوت قرآن کی اصل روح یہی ہے۔"

جانتا ہوں کہ اس روح کو مسلمانوں اور دوسرے انسانوں نے بڑی حد تک بھلا رکھا ہے لیکن کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ تاریخ انسانی کے اس دور میں، جہاں بعض مرتبہ تہذیب اور بربریت کی حدوں میں امتیاز ناممکن ہو جاتا ہے دنیا کو اس پیغام محبت اور تصور انسانیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے! ❊

شہادت حسین کا سبق

دنیا کی تاریخ میں بعض شخصیتیں ایسی گذری ہیں جن کی عظمت کے سامنے عقیدت کی گردن جھک جاتی ہے اور الفاظ کو اپنے عجز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ انہیں کی بدولت انسانیت سربلند ہے اور انہیں کی روشنی کے سہارے اس ظلمت کدے میں وہ سچائی کا راستہ تلاش کرتی ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت امام حسین علیہ السلام کی تھی جن کی شہادت کی یاد کو ہر سال کروڑوں انسان محرم کے دنوں میں تازہ کرتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے بڑے بڑے فاتح، حکمراں، عالم، فن کار اور سیاست داں گذرے ہیں لیکن انہیں یا تو تاریخ نے بالکل بھلا دیا یا ان کا ذکر محض اس کے صفحات میں محفوظ رہ گیا ہے لیکن حسینؑ غریب و مظلوم کی یاد پر صدیوں کے گذرنے کا کوئی اثر نہیں۔ بلکہ جوں جوں وقت بیتتا جاتا ہے دلوں پر اس کا نقش گہرا ہوتا جاتا ہے۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟

اس معمے کا حل ہمیں امام حسینؑ کے غیر معمولی اور بلند کردار میں تلاش کرنا ہوگا۔ ایک نظر سے دیکھئے تو انسان کی زندگی ایک ٹمٹماتے چراغ کی طرح ہے جو ایک مختصر سی مدت کے لئے روشن ہوتا ہے اور پھر موت کا ایک ہلکا سا اشارہ اسے بجھا دیتا ہے، ہمیشہ کے لئے بجھا دیتا ہے۔ لیکن جب انسان اپنی زندگی کو بعض ابدی قدروں کے ساتھ وابستہ کر لیتا ہے، بلکہ خود ان قدروں کا حامل بن جاتا ہے تو آندھیاں بھی اس چراغ کو نہیں بجھا سکتیں اور وہ موت پر فتح پا کر امر بن جاتا

ہے۔ موت اس کے جسم کو ضرور فنا کر دیتی ہے لیکن اس کے دماغ کی جولانی، اس کے دل کا گداز، اس کی روح کی بلندی، اس کے مقصد کی تابانی قائم رہتی ہے اور تھکے ماندے راستہ بھٹکے مسافروں کی ہمت بندھاتی اور ان کو سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔

حسینؑ کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا کہ وہ حق کی تائید اور نصرت کریں یا باطل کے ساتھ معاملہ کر کے اس کی قوت کے سامنے سر جھکا دیں۔ ان کے نانا حضرت محمد مصطفیٰؐ نے دنیا کے سامنے خدا شناسی اور خدا ترسی، نیکی اور پرہیزگاری، انسان دوستی اور عدل و شرافت کا ایک ہمہ گیر پیغام پیش کیا تھا جس نے اس زمانے کے لوگوں کو زندگی کے ایک بہتر تصور سے آشنا کیا، اور جس کی جوت آج تک قائم ہے۔ حسینؑ نے اسی فضا میں آنکھیں کھولیں اور اسی تعلیم کی گود میں پرورش پائی۔ اس لئے یہ قدریں بچپن ہی سے ان کی ذات میں رچ گئی تھیں۔ لیکن رسول کی وفات کے بعد واقعات نے ایک ایسی کروٹ لی کہ اسلام کی پڑھائی اور سکھائی ہوئی شرافتوں کو لوگوں نے بھلا دیا اور سیاسی طاقت یزید کے ناپاک ہاتھوں میں آ گئی جس کو نہ اسلام کے اصول کا پاس تھا نہ ان قدروں کا احترام جن کو دنیا کے نیک اور شریف آدمیوں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے۔

یزید کی یہ کوشش تھی کہ وہ اسلام کے روشن چہرے پر اپنی سیاہ باطنی اور بے اصولی کی مہر لگا دے اور اسلام نے شرافت، اخوت، مساوات اور جمہوریت کا جو سبق پڑھایا ہے اس کو لوگوں کے دلوں سے بھلا دے۔ اس نے خلیفہ رسول ہونے کا دعویٰ کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ عرب کے سب لوگ اس کے ہاتھ پر "بیعت" کریں یعنی اپنے ضمیر کو 'بیع' کر کے، اس کے ہاتھ بیچ کر حق کو ناحق تسلیم کریں۔ قوت اور ظلم سے مرعوب ہو کر بہت سے لوگوں نے تو اس کی مخالفت کی جرأت ہی نہیں کی اور باقی میں سے بھی بیشتر کو اس نے لالچ دے کر ہموار یا جبر کے ذریعے خاموش کر دیا تھا۔ اس طرح بہت بڑی اکثریت اس کی طرف جھک گئی۔ اگر اس کو اپنے ناپاک مقصد میں کامیابی ہو جاتی تو اندیشہ یہ تھا کہ وہ تاریخ کے سامنے اسلام کی ایسی تصویر پیش کرتا جو در اصل اس کی اپنی مکروہ سیرت کا عکس ہوتی۔ اس نے اس ناپاک مقصد کو حاصل کرنے کی

پوری کوشش کی ۔ اسے ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ عرب میں کوئی ایسا بااثر شخص یا جماعت رہ جائے جو اس کی خلافت کو تسلیم نہ کرے ۔ دراصل ظلم اور بدی کی مخالفت میں ایک قسم کا ہوگا ہوتا ہے جو انہیں نیکی اور شرافت کے مٹانے پر مجبور کرتا ہے ۔ چنانچہ یزید نے امام حسینؑ کو بھی پیغام بھیجا کہ یا تو میری بیعت کرو ورنہ سر کٹانے کو تیار ہو جاؤ ۔ یہ وہ چیلنج ہے ، حق اور باطل میں سے ایک راستے کو اختیار کرنے کا چیلنج ، جو ہر زمانے اور ہر ملک میں خاصان خدا کے سامنے پیش کیا گیا ہے ۔ حسینؑ کے سامنے بھی چیلنج آیا اور ظاہر ہے کہ ان کے سامنے دو راستے نہیں تھے ، صرف ایک ہی راستہ تھا ، سچ اور دیانت اور ایمان اور آزادی ضمیر کا راستہ ۔ کیونکہ

ماسوا اللہ مسلماں بندہ نیست پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

یعنی کوئی سچا مسلمان (اور کس قدر مشکل ہے سچا مسلمان ہونا !) خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں بن سکتا ، کسی فرعونِ وقت کے سامنے اپنا سر نہیں جھکا سکتا ۔ اس لئے حسینؑ نے باطل کے ساتھ سمجھوتہ کا سہل راستہ ٹھکرا کر شہادت کا کٹھن راستہ اختیار کیا ، "شہادت" جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنے عقیدے کی سچائی کا اس شدت کے ساتھ قائل ہو کہ اس کی "گواہی" دینے کیلئے ہر قربانی پیش کرنے کو تیار ہو ۔ یہاں تک کہ اس کے لئے خوشی سے اپنے سر کی بازی لگا دے یعنی جب منبر سے کلمۂ حق کہنا کافی نہ ہو تو اس کا اعلان فراز دار سے کرے ۔

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است بردار تواں گفت و بہ منبر نہ تواں گفت

یہ کوئی آسان چیز نہیں ۔ دنیا کی ساری تحریصیں اور الفتیں اس آزمائش کے وقت انسان کو روکتی ہیں ۔ لیکن ایک مومن کامل پر ان کا جادو نہیں چل سکتا ۔ اس کے قدم میں لغزش پیدا نہیں ہوتی کیا کیا مصیبتیں حسینؑ کو میدان کربلا میں اور خصوصاً عاشورے کے روز پیش نہیں آئیں ؟ تین دن کی بھوک اور پیاس ، قیامت کی گرمی ، زخموں کی کثرت ، عزیزوں اور پیاروں کا آنکھوں کے سامنے دم توڑنا ، اہل بیت کی بے کسی و بے یاری اور ان کی اسیری کا تصوّر ، مگر حسینؑ نے ان کو بہ رضا و رغبت قبول کیا کیونکہ ان کے سامنے جو مقصد تھا اس کے مقابلے

میں یہ تمام مصیبتیں ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔

اس مقصد کے بہت سے پہلو تھے۔ ان میں سے ایک تو آزادی اور جمہوریت کے ان اصولوں کی علم برداری تھی جو اسلام نے دنیا کو سکھائے تھے۔ یزید کا انتخاب عام لوگوں نے آزادی رائے سے نہیں کیا تھا بلکہ اس نے جبر اور تشدد کے ذریعہ اپنی بے دین حکومت قائم کی تھی۔ اسلامی ریاست کا تقاضہ ہے کہ حکومت کے معاملات میں لوگوں کی رائے اور انکے شہری حقوق اور آزادیوں کا احترام کیا جائے اور پبلک زندگی میں بھی انصاف اور شرافت کے وہی اصول برتے جائیں جو شخصی زندگی کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ یزید نے ان اصولوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اسے اصولوں اور قاعدوں کی پابند حکومت درکار نہ تھی۔ وہ بے لگام قوت کا خواہش مند تھا۔ اس کی عیاش طبیعت کو اسلامی زندگی کی سادگی اور پاکیزگی بار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے سرے سے اسلامی نظام تمدن کو رد کر دیا۔ اسلام نے دولت کے صرف اور سماجی معاملات میں انصاف اور مساوات کا سبق پڑھایا تھا۔ وہ انصاف اور مساوات دونوں کی ہنسی اڑاتا تھا اور اس نے اس کی بجائے ظلم اور عیاشی کو اپنا شعار بنایا تھا۔ امام حسینؑ کی شہادت ان تمام حرکتوں اور بے اصولیوں کے خلاف ایک زبردست احتجاج تھی۔

دنیا کی تاریخ میں خدا کے بہت سے نیک بندوں نے اعلیٰ مقصدوں کے لئے اپنی جان دی ہے۔ امام حسینؑ کا ایسا کرنا کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی۔ لیکن اس کا انداز، اس کا طریقہ بالکل نرالا تھا۔ انہوں نے ایک ایسی شان کے ساتھ اس جہاد کا فرض انجام دیا جس کی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ عقل کا تقاضا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص جنگ کرے تو اس کے لئے پورا انتظام کرے، زیادہ سے زیادہ فوج اور جنگ کا سامان مہیا کرے اور ہر موقع پر اپنے ساتھیوں کو فتح کا یقین دلائے اور ان کی ہمت بڑھائے۔ لیکن کیسی عجیب بات معلوم ہوتی ہے یہ کہ نہ انہوں نے کوئی بڑی فوج جمع کی جو وہ اپنے اثر سے کر سکتے تھے۔ نہ جنگ کا ساز و سامان فراہم کیا۔ بس ایک بہتر آدمیوں کی جماعت ان کے ساتھ تھی جن میں چند اس قدر بوڑھے تھے جنہوں نے اپنی جھکی ہوئی کمروں کو باندھ کر ان کا خم دور کیا تھا اور اپنی آنکھوں پر پڑی گھنی سفید پلکوں تک کو

رومال سے باندھا تھا۔ چند نوجوان اور چھوٹے چھوٹے بچے تھے جن کے دن کھیل کے تھے، ہتھیار اٹھانے

کے نہ تھے۔ ایک چھ مہینے کا شیر خوار بچہ تھا جو حسینؑ کی آنکھوں کا نور تھا اور صرف ماں یا باپ کی گود میں

بیٹھ کر ہی میدان جہاد میں جا سکتا تھا۔ کچھ خاندان نبوت کی عورتیں تھیں جن کی زندگی مدینے کے گوشہ عافیت

میں گذری تھی۔ اس ساری "فوج" میں جوانوں کی تعداد جو باقاعدہ جنگ کر سکتے تھے، بہت ہی کم

تھی چشم فلک نے اپنے صدیوں کے تجربے میں اس شان کی فوج شاید ہی کبھی دیکھی ہوگی!

یہ انتظام مصلحت کے عام تصور کی رو سے یقیناً عجیب تھا لیکن حسین کے سامنے جو مہم

تھی وہاں معمولی سمجھداری اور مصلحت اندیشی کا کام نہ تھا۔ وہاں تو صداقت پرستی اور عشق الٰہی کی

وہ آگ درکار تھی جو احتیاط بلکہ حفاظت نفس کے جذبے تک کو خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالتی ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل تھی محو تماشائے لب بام ابھی!

حسینؑ کو اپنی مثال سے یہ دکھانا تھا کہ جب سانچ پر آنچ آئے۔ جب باطل حق کو کچلنے اور

ظلم و شر کی آندھیاں اخلاق اور شرافت کے چراغ بجھانے کے در پے ہوں تو حق کی حمایت کرنا ہر

مرد و عورت، ہر بچے بوڑھے، ہر مریض اور تندرست کا فرض ہے۔ حسینؑ کوئی فوجی جیت نہ چاہتے تھے۔

وہ تو روحانی فتح کے متلاشی تھے جو کبھی زندگی کو جاں سمجھتی ہے اور کبھی تسلیم جاں! اس جیت کے لئے

ہتھیار بھی شایان شان ہونے ضروری ہیں، ایثار اور صبر اور جرأت اور قربانی کے ہتھیار، ایسی قربانی

جو عالم انسانیت کے ضمیر میں تہلکہ بپا کر دے۔ اگر امام حسینؑ کربلا کے میدان جنگ میں عام اصولوں

کے مطابق لڑتے تو تاریخ کی نظر میں وہ ایک معمولی جنگ ہوتی اور لوگوں کے سوئے ہوئے ضمیر

نہ جاگتے، نہ فتح سے۔ نہ شکست سے! لیکن ان کی دل ہلا دینے والی قربانیوں نے لوگوں کے

دل اور دماغ میں ایک ایسی ہل چل پیدا کر دی کہ چند ہی سال کے اندر نہ صرف یزید کی حکومت

بلکہ یزیدیت کی تحریک کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے اور اسلام کے بیچ میں ایک ایسی دیوار کھنچ گئی

جس کو کوئی قوت مسمار نہیں کر سکتی۔

لیکن حسین کے کردار کی عظمت کا پورا اندازہ محض ان کی ذاتی قربانی سے نہیں ہوتا۔

اس کی بزرگی کو سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کے ساتھیوں کی شخصیت پر ان کا کتنا زبردست اثر پڑا تھا۔ جب حق پر سخت وقت آکر پڑا اور حسینؓ نے جہاد کا علم بلند کیا تو ان بندگانِ خدا نے اپنے گھر بار چھوڑ کر، دنیا کے عیش و آرام سے منہ موڑ کر خوشی خوشی کربلا کا کانٹوں بھرا راستہ اختیار کیا، اپنے آقا کی محبت میں سرشار اور ان کی شخصیت کے اعجاز سے متاثر ہو کر ان کے مقصد کو اپنایا، ہر چیز کو بہ رضا و رغبت خدا کی راہ میں قربان کر دیا اور موت کا اس طرح استقبال کیا جیسے کوئی شہد کا گھونٹ پیتا ہے۔

نشان مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

کس قدر نازک مگر کیسے مضبوط تھے وہ رشتے جو حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو ایک تسبیح میں منسلک کئے ہوئے تھے! عاشورہ کی رات کو انہوں نے اپنی مختصر سی فوج کو ایک خیمے میں جمع کیا اور ان کو خطاب کر کے کہا کہ یزید کو صرف مجھ سے پرخاش ہے اور وہ میرے سر کا طالب ہے۔ میں تم سب پر سے اپنی بیعت اٹھاتا ہوں اور تمہیں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ اس وقت رات کی تاریکی میں تم یہاں سے چلے جاؤ تاکہ خواہ مخواہ تمہاری جانیں ضائع نہ ہوں۔ اور یہ کہہ کر چشم مروت کے احترام میں اس شمع کو بجھا دیا جو احباب حسینؓ کے غمناک چہروں پر اپنی لرزتی ہوئی روشنی ڈال رہی تھی لیکن کوئی جانباز اپنی جگہ سے نہیں سرکا۔ ہاں چند منٹ بعد خیمے کے سناٹے میں دفعتہً آہ و بکا کے نعرے بلند ہوئے کہ اے حسین ہم تمہارے قدموں سے جدا نہ ہوں گے، خواہ ہمیں دنیا کی ساری دولت اور عیش و آرام پیش کیا جائے۔ اگر ہم ستر بار مریں اور پھر ستر بار زندہ ہوں تو بھی آپ کی رفاقت سے منہ نہ موڑیں گے اور آپ پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے!

کیسا زبردست میر کارواں تھا یہ حسین، جس کی نگاہ بندہ نواز نے کارواں کے ایک ایک فرد کو دنیا کی تاریخ کا روشن ستارہ بنا دیا اور حُسنِ اخلاق کی جو شان اس کی اپنی ذات میں فروزاں تھی اس کی چھوٹ سے اس کے سب ساتھیوں کا کردار جگمگا اٹھا! واقعہ یہ ہے کہ آج بھی جو لوگ چشم بصیرت سے امام حسینؓ کے کردار کا مطالعہ کرتے ہیں، انہیں اس میں اسلام اور

قرآن کی تعلیم کے بنیادی راز ہاتھ آتے ہیں اور وہ اس کی جہاں تاب روشنی سے اپنے چھوٹے چھوٹے چراغ روشن کر سکتے ہیں۔

حسینؑ کے کردار کے کس کس پہلو کی طرف اشارہ کروں؟ شبِ عاشور کو دشمنوں کی فوج جنگ کی تیاری کر رہی ہے اور صبح کے واقعات کا بھیانک نقشہ ان کے چشم تصوّر کے سامنے ہے لیکن حسینؑ پر نہ غم طاری ہے نہ خوف کیونکہ جب عشق الٰہی کا کانٹا دل میں چبھتا ہے دوسرے تمام کانٹے جسم اور دماغ سے نکال دیتا ہے! حسینؑ رات کا بیشتر حصہ عبادت الٰہی میں بسر کرتے ہیں۔ آخری بار عبد اور معبود کے درمیان راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اور جو وقت بچتا ہے اس میں بچّوں اور عورتوں کو تسکین دیتے ہیں اور ان کو آنے والی آزمائشوں کے لئے تیار کرتے ہیں۔ صبح عاشور طلوع ہوتی ہے تو سب سے پہلے فریضۂ سحر ادا کرتے ہیں اور پھر جب جنگ کا میدان گرم ہوتا ہے تو ظہر کی نماز تیروں کی بوچھاڑ میں اور عصر کی نماز خنجر کے نیچے ادا کرتے ہیں تاکہ دنیا کو دکھا دیں کہ حقوق اللہ کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تمام دن عزیزوں اور دوستوں کی لاشوں کو خیمہ گاہ میں لانے، عورتوں اور بچّوں کو پرسہ دینے اور ان کی دلجوئی میں صرف ہوتا ہے۔ اس شفقت اور محبّت میں عرب اور عجم کی، آقا اور مظلوم کی، چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ کیونکہ حسینؑ کا اخلاق زمین اور آسمان کی طرح وسیع ہے اور حقوق عباد کی ادائیگی میں یہ ساری تفریقیں بے معنی ہیں۔ انسان دوستی اور عفو و رحم کا یہ عالم ہے کہ جس وقت شمر گلے پر خنجر پھیرنے کے لئے بڑھتا ہے تو حسینؑ کے سوکھے ہونٹوں سے یہ صدا سنائی دیتی ہے کہ اے میرے معبود ان ظالموں کو معاف کر دے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

حسینؑ کا یہ جہاد ایک تبلیغی جہاد تھا جس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ جب صداقت پر آنچ آتی ہے، جب باطل کی پھونکیں حق کا چراغ بجھانے کی کوشش کرتی ہیں اس وقت ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اس کی حمایت کے لئے کھڑا ہو جائے خواہ وہ ستّر برس کا بوڑھا ہو یا تیس سال کا جوان، دس گیارہ سال کا بچّہ ہو یا چھ مہینے کا طفل شیر خوار۔ جو مجاہد ضعیفی کی وجہ سے کمر خمیدہ ہے وہ شوقِ شہادت

میں کمر کس کر جوان بن جائے گا۔ جو بچہ اپنے پاؤں پر نہ جا سکے گا وہ باپ کی گود میں اس کی گردن میں بازو
حمائل کر کے جائے گا۔ عورتیں جو جنگ میں شریک نہ ہو سکیں گی حق اور صداقت کی خاطر اسیری،
خانماں بربادی اور دربدری کے صدمے جھیلیں گی اور اس طرح ضمیر انسانیت میں تہلکہ بپا کریں گی۔
یعنی ایسے وقت میں کوئی حساس اور حق شناس آدمی کسی بہانے کی آڑ لے کر اس فرض سے نہیں
بچ سکتا۔ لیکن یہ ایسا کڑا امتحان ہے کہ بہت کم لوگ اس میں پورے اترتے ہیں اور جو اس راہ میں
ثابت قدم بھی رہے انہوں نے بھی زیادہ تر انفرادی حیثیت سے ایسا کر کے دکھایا۔ امام حسینؑ کا
اعجاز یہ ہے کہ اس دشوار گذار راستے میں ان کے بہتّر ساتھیوں اور عزیزوں میں سے کسی ایک کا
قدم بھی نہیں ڈگمگایا اور انہوں نے مجموعی طور پر جہاد فی سبیل اللہ کا ایک ایسا مظاہرہ پیش کیا
جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی!

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

امام حسین علیہ السلام کی زندگی بقول ایک شاعر کے حق کا پروانہ تھی اور ان کی نظر حق
کا پیمانہ۔ انہوں نے صرف عربوں اور مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کو جو حق اور باطل کی
نہ ختم ہونے والی جنگ میں شریک ہیں، اور جن کو اپنا راستہ صاف طور پر نظر نہیں آتا، یہ سبق
پڑھایا کہ شرافت کے اصولوں پر قائم رہو خواہ اس کے لئے کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے، شرافت
کے چراغ روشن کرو خواہ کیسی ہی زبردست آندھیاں ان کے بجھانے کی در پے ہوں . . .
ہر شخص عزم اور ثبات کی اس بلندی کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ہر شخص کا فرض بہر ضرور ہے کہ جہاں تک
ہو سکے اپنے چراغوں کی حفاظت کرے اور قوت کے خوف یا اکثریت کے دباؤ کی وجہ سے ان کو
تاریکی کے حوالے نہ کرے۔ اس میدان میں فتح کا دار و مدار مادّی قوت، فوج اور سامان جنگ پر
نہیں بلکہ حق پرستوں کے خلوص ایثار اور جرأت پر ہے۔ "سچ کی کسوٹی اس کے حامیوں کی کثرت
نہیں۔ اس کے لئے تو اتنا کافی ہے کہ وہ سچ ہے"!

امام حسینؑ کی سیرت کے کون سے نقوش ہیں جو کربلا کے واقعات سے نمایاں ہوتے ہیں؟

حق پرستی اور جرأت اور استقلال، خدا کی رضا جوئی اور اس کے بندوں کے ساتھ شفقت، عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی، روزمرہ کی زندگی میں نرمی جو دلوں کو موہ لے اور اصول کی حمایت میں وہ ثابت قدمی جو کوہ کو کاہ بنا دے۔ یہ تھے حسینؑ جنھوں نے سرداری کو چھوڑ کر خدمت، عیش و آرام کو چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی، جن کو خدا کے راستے کی موت شہد سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی تھی، جن کے دل میں عزیزوں، دوستوں، مسافروں، اجنبیوں، نوکروں بلکہ مخالفوں اور دشمنوں تک کے لئے جگہ تھی، جو لین دین اور کاروبار میں عادل تھے، دوستوں کے مخلص تھے، دشمنوں کے ساتھ شجاعت اور انسانیت کا سلوک کرتے تھے، جو دوسروں کے لئے عفو اور احسان کا سرچشمہ تھے اور اپنے لئے سخت گیر، روزمرہ کے معاملات میں ہر قسم کی رعایت کے لئے آمادہ اور اصول کے معاملے میں اٹل، جن کے دل میں خدا کا خوف تھا اور انسانوں کی محبت۔ اس سے بڑھ کر انسانی سیرت کی بلندی کیا ہو سکتی ہے؟

○

گرونانکؒ کی تعلیم

مذہب کا اصلی کام زندگی کو سدھارنا اور اس کو شرافت اور محبت کے اصول اور طریقوں سے آشنا کرنا ہے۔ وہ اس فرض کو اسی صورت میں ادا کر سکتا ہے جب وہ دلوں کو ملائے اور ان اثرات کو زائل کرے جو انسان کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں اور نفرت، تعصب اور تنگ دلی کے زہریلے بیج بوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر رادھاکرشنن نے دھرم اور ادھرم کی بہت دل لگتی تعریف کی تھی انہوں نے کہا تھا ہر وہ چیز جو دلوں کو ملاتی ہے دھرم ہے، جو دلوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے ادھرم ہے۔ اسی حقیقت کو مولانا روم نے بلاغت کی سادگی کے ساتھ یوں ادا کیا تھا۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

یعنی اے انسان تو دنیا میں میل محبت بڑھانے کے لئے آیا ہے۔ پھوٹ ڈالنے نہیں آیا!

نگاہ حقیقت شناس صرف انہی لوگوں کی قدر اور عزت کر سکتی ہے جو اس کسوٹی پر پورے اتریں خواہ وہ مذہبی راہ نما ہوں یا سیاست کے نیتا۔ گرونانک کی اخلاقی عظمت اور روحانی کشش کا اصلی راز یہی ہے کہ ان کی تعلیم محبت اور رفاقت کی تعلیم ہے۔ انہوں نے سب انسانوں کو ان کی مشترک انسانیت کی یاد دلائی اور ذات پات، رنگ روپ، امیری غریبی

کے بھید بھاؤ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس وقت اس دیس کے بہت سے باسی مذہب کی سچی تعلیم کو بھلا چکے تھے اور اس کی ظاہری رسموں اور شکلوں میں الجھ کر رہ گئے تھے انہوں نے سب کو یہ قدیم لیکن انقلاب آفریں پیغام سنایا کہ زندگی کا قانون ایک دوسرے سے محبت کرنا ہے۔ یہی محبت کا جذبہ ہے جو عقیدت اور بھکتی کی روح بیدار کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ انسان کی رسائی خدا تک ہوتی ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گرو نانک کی نظر اس ابدی اور بنیادی حقیقت تک پہنچ گئی تھی جو مختلف مذہبوں میں الگ الگ روپ اختیار کر لیتی ہے لیکن باوجود اس ظاہری فرق کے باطن میں ایک ہی ہے۔ حضرت مسیح نے ہمدردی اور محبت کا پیغام ہی نہیں دیا بلکہ اپنی زندگی میں اس کی اعلیٰ ترین مثال دکھائی۔ اسلام نے سکھایا کہ "تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے" اس لئے سب کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور شرافت کا سلوک کرنا چاہیئے جیسا وہ اپنے قریبی عزیزوں سے کرتے ہیں۔ رنگ ونسل اور ذات پات کے امتیاز بالکل جھوٹے اور مصنوعی ہیں۔ اصل چیز خداشناسی، خداترسی اور نیک عمل ہے۔ عبادت کے آداب اور رسوم بدل سکتے ہیں لیکن یہ بنیادی اصول اٹل ہے۔ بھگوت گیتا نے بھی انسانی وحدت کے اصول کی بنیاد اس خداشناسی پر رکھی ہے "جو شخص ہر کام میری خاطر کرتا ہے جو مجھ کو سب سے مقدم اور اعلیٰ سمجھتا ہے، مجھ سے عقیدت رکھتا ہے، جس کو دوسری چیزوں سے لگاؤ نہیں جو دنیا کے کسی جاندار سے دشمنی نہیں رکھتا۔ وہی میرے حضور میں باریاب ہوگا۔" دیکھیئے یہاں بھی شرط وہی ہے پرماتما سے خلوص اور عقیدت اور اس کے بندوں سے محبت۔ جو اس شرط کو پورا کرتے ہیں ان کی ایک برادری ہے خواہ وہ خود کو کسی نام یا مذہبی لیبل سے پکاریں۔ آپ کو الو بن ادھم کا خواب یاد ہوگا کہ اگر میرا نام خدا کے محبوب بندوں میں نہیں لکھ سکتے تو اس فہرست میں لکھ لو جس میں خدا کے بندوں سے محبت کرنے والوں کے نام ہیں۔ اور اس کا نتیجہ؟ ان کا نام خدا کے محبوب بندوں کی فہرست میں سر عنوان تھا۔ خدا کی رضا اور توفیق حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے۔

انسانوں سے یہ محبت ایک عام جذبہ بھی ہے اور خاص بھی۔ خاص طور پر وہ لوگ اس کے مستحق ہیں جو مصیبت زدہ اور مسکین اور کمزور ہیں، جن کو ذات پات کے بندھنوں اور دولت مند یا اونچی ذات والوں کے اَنیائے نے اپنے انسانی حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ وہ سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں یعنی گاندھی جی کی اصطلاح میں "ہری جن" ہیں۔ گرونانک کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہم عصروں اور بعد کے آنے والوں کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ ان گرے ہوؤں کو اٹھانا انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔

گرونانک نے ایک غریب گھرانے میں ایک پٹواری کے یہاں جنم لیا۔ شاید قدرت کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ اصلاح اور ہدایت کے سوتے کسی بڑے گھرانے یا عالم فاضل خاندان ہی میں پھوٹیں۔ لیکن انہوں نے اپنے خلوص اور محبت اور میٹھے بولوں کے ذریعہ ہر قسم کے لوگوں کے دل میں گھر کر لیا۔ اس طرح نہیں کہ ان غلطیوں اور توہمات کو جو ہر طرف پھیلے ہوئے تھے مان لیں اور لوگوں کی ہاں میں ہاں ملائیں بلکہ انہوں نے نرمی اور سمجھ داری کے ساتھ ان پر تنقید کی اور ایسی مثالوں کے ذریعہ اپنی تعلیم کو پیش کیا کہ وہ دل سے نکلتی تھیں اور دل میں اتر جاتی تھیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب ان سے جنیو پہننے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انہیں شروع ہی سے ظاہری علامتوں کی نہیں بلکہ چھپی ہوئی حقیقت کی تلاش تھی۔ انہوں نے سوال کیا "روئی کے دھاگے میں روحانیت کہاں سے آگئی؟" روحانیت تو رحم اور محبت، قناعت اور سچائی اور بے نفسی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب سیرت ان صفات کے تانے بانے سے ترتیب پائے گی اس وقت انسان، انسانیت کے اصلی مقام پر پہنچ سکتا ہے۔ تبھی من و تو کے امتیاز مٹ سکتے ہیں جس کے بغیر نہ انسان دوسرے انسانوں کے دلوں میں گھر کر سکتا ہے نہ خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ ایک مشہور وید ان کے علاج کے لئے بلایا گیا۔ لیکن انہوں نے اس سے بہت نرمی سے کہا کہ تم میرا کیا علاج کرو گے تم خود مریض ہو۔ اس نے پوچھا میرا مرض کیا ہے؟ جواب ملا انانیت، خود نمائی، اپنے کو دوسروں سے برتر اور الگ تھلگ سمجھنا۔ یہ جذبہ

نہ صرف ہمارے اور ہمارے ہم جنسوں کے درمیان دیواریں کھڑی کرتا ہے بلکہ ہمیں خدا سے بھی دور رکھتا ہے جو تمام زندگی کا سرچشمہ ہے یہ وہی انانیت ہے جس کی طرف غالب نے اپنے مخصوص انداز میں اشارہ کیا تھا

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

یہ وہی پیغام ہے جو دنیا کو مختلف زمانوں میں صوفیوں، رشیوں اور خداشناسوں نے اپنی اپنی زبانوں میں دیا ہے۔

گرو نانک کا پیغام ہمارے لئے صرف ذاتی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ جماعتی لحاظ سے بھی بہت ضروری اور قابل قدر ہے۔ اس دیس میں جہاں ہزاروں برس سے مختلف مذہبوں کے ماننے والے بستے ہیں ابھی تک باہمی مفاہمت اور رواداری اور ایکتا کی وہ روح، وہ فضا پیدا نہیں ہو سکی جو ہر قسم کی مادی اور اخلاقی ترقی کے لئے پہلی شرط ہے۔ مثلاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو لیجئے جو ان کے زمانہ میں بھی تھے اور پھر اس زمانے میں تو اتنے بڑھے کہ انہوں نے ملک کی تقسیم کرا کے بھی دم نہ لیا۔ گرو نانک نے کبھی مذہبوں کے باہمی جھگڑوں اور ناسمجھوں کے بنائے اختلافات کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ ان کی بنیادی تعلیم کی وحدت کے اسی طرح قائل تھے جس طرح مثلاً اسلام قائل ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ "نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان" اس پر بہت چہ میگوئیاں ہوئیں، اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ سمجھائیں کہ انہوں نے یہ بات کیسے کہی۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا "مسلمان ہونا بہت مشکل ہے۔ مسلمان میرے نزدیک وہ ہے جو اپنے ایمان میں پختہ ہو جس کے روزمرہ کے کاموں میں پیغمبر اسلام کی تعلیم کی جھلک پائی جائے، جس کا دل غرور اور لالچ سے پاک ہو اور موت زندگی کے دھوکوں سے بلند، جو رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر لے اور یہ جانے کہ جو کچھ کرتا ہے وہ خدا کرتا ہے۔ دراصل وہی شخص اپنے کو مسلمان کہہ سکتا ہے جو خود پرستی کے بندھنوں سے خود کو آزاد کرے اور جس کے رحم کی چھایا خدا کی

ساری مخلوق پر ہو"۔ کس قدر بلند اور سچا ہے یہ تصوّر جو گرو صاحب کے نزدیک ایک اچھے مسلمان ہی کا نہیں بلکہ ہر اچھے انسان کا ہے۔ چنانچہ اس بیان کا مقابلہ اگر آپ اُس تعریف سے کریں جو انہوں نے ایک سچّے سکھ کی بتائی ہے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ان کو مذہبوں کی تعلیم کی وحدت اور خیر و شر کے بنیادی مفہوم کا کس قدر گہرا احساس تھا۔ بھگیر تھ نے ان سے پوچھا کہ ایک سچے سکھ کی کیا خصوصیت ہونی چاہیئے۔ انہوں نے فرمایا "وہ جو سچا ہو، قناعت کی صفت رکھتا ہو اور سب پر دیا کرے، جو لالچ و نفرت سے پاک ہو، جو کسی کو نقصان یا دُکھ نہ پہنچائے، جو خواہش کے پھندے سے رہا ہو چکا ہو جس کو اپنے اوپر قابو ہو اور خیر و شر میں تمیز کر سکے، جو خدائے بزرگ و برتر کی رضا کے سامنے اپنا سر جھکا دے اور اس کی خوشنودی کو اپنا معیار بنائے۔ ایسا ہی ہم آہنگ شخص اس حلقہ میں شریک ہونے کے قابل ہے"۔

دیکھا آپ نے؟ یہ تھا ان کا تصور انسانیت، جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی سب شامل ہیں۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ "میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ مذہب کا سچا پیرو وہی ہے جو خدا کے کلام پر ایمان لاتا ہے جو سارے مذہبوں کے بانی اور پیغام بر دنیا میں لائے ہیں۔ میرے لئے سب یکساں ہیں کیونکہ سب خدا کا پیغام ہیں"۔

گرو نانک کے شبد پڑھتا ہوں تو ان میں اسی سچی مذہبیت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور محبت رحم، ہمدردی، خدمت اور زندگی کی سچی قدروں کا وہ پیغام ملتا ہے جس کے لئے آج دنیا بھوکی اور پیاسی ہے، یہ دنیا جس کے دل اور دماغ دونوں امن کی دولت سے محروم ہیں، جس کے ہاتھوں میں قوت ہے لیکن اس کا استعمال نہیں آتا، جس کی رفتار میں بجلی کی سی تیزی پیدا ہو گئی ہے لیکن منزلِ مقصود آنکھوں سے اوجھل ہے۔ ان کی تعلیم پکار پکار کر ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے کہ زندگی کی اصلیت، وحدت اور ایکتا ہے، محبت اور پریم ہے آپس کی خونریزی اور چھین جھپٹ نہیں۔ آپس کے ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کی کوئی اہمیت نہیں جو ہمیں اپنے بھائیوں کی دشمنی پر اکساتے ہیں۔ مانا کہ قدرت کے "دانت اور پنجے خون سے رنگین ہیں" لیکن یہ جنگل کا قانون انسانی زندگی کا چراغ نہیں بن سکتا۔ انسان کو

انسان بننے کے لئے بھٹی میں تپنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی سیرت کا سونا جس میں بہت سا کھوٹ ملا ہے، کندن بن سکے۔ اسے اپنے دل و دماغ کی کھڑکیوں کو کھولنا ہے اور ان میں سے ہنسا اور نفرت کو خارج کر کے محبت اور شرافت کو جگہ دینی ہے یہی وہ پیغام ہے جس کو مختلف الفاظ اور انداز میں ابراہیم اور عیسیٰ اور موسیٰ اور مہاتما بدھ اور حضرت محمدؐ اور گرُو نانک اور خدا کے بہت سے نیک اور پاک بندوں نے پیش کیا ہے۔

حصّہ دوئم

صحبت اہل صفا

صحبت اہل صفا نور و حضور و سرور

(اقبال)

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

سحر آفریں

(مہاتما گاندھی)

چارلز ڈکنز نے اپنے مشہور ناول "دو شہروں کی کہانی" میں انقلاب فرانس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"وہ بہترین زمانہ تھا، وہ بدترین زمانہ تھا، وہ ایمان کا دور تھا، وہ شک کا دور تھا، وہ آشا کی حسین بہار تھی، وہ نراشا کا ٹھٹھرتا ہوا جاڑا تھا۔"

کچھ ایسا ہی حال تھا ہمارا جس سال ہم آزادی سے ہم کنار ہوئے اور امید صبح کے ستارے کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دی اور پھر اسی سال کے دوران میں ہم میں سے بہت سے تو اپنی عقل اور سمجھ، اپنی شرافت اور مروت، اپنی امن پسندی اور انسان دوستی کھو بیٹھے اور انہوں نے ایسے ایسے جرم اور سیاہ کاریاں کیں جن کی وجہ سے شریف انسانوں پر مایوسی کی تاریک گھٹا چھا گئی اور انہیں یہ شبہ ہونے لگا کہ آزادی کو حاصل کرنے کے لئے، جو انسان کی سب سے بڑی دولت ہے، انہوں نے جو قیمت ادا کی ہے کہیں وہ سودا بہت مہنگا تو نہیں پڑا!

اس فرقہ وارانہ جنون اور کشمکش کی تاریکی میں، جب اخلاق کے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور ایمان کے قدموں میں لغزش آگئی تھی، جب اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ گئے تھے، جب کمینگی کا بول بالا تھا اور بہت سے شریف آدمی اس کی شدت اور تشدد سے ڈر کر خاموش تھے، ایک چراغ تھا جو استقلال کے ساتھ، ذاتی خطروں کو نظر انداز کر کے، جلتا رہا اور جوں جوں اندھیرا بڑھتا گیا

اس کی روشنی تیز ہوتی گئی، مہاتما گاندھی! معقول اور نیک نیت لوگ جن کی اپنی ہمت جواب دے چکی تھی، بس اسی ایک مردِ مومن کی اخلاقی جرأت اور قیادت پر آسرا لگائے ہوئے تھے۔ اور ان کی امید ٹھیک نکلی۔ اس نہتے مجاہد نے رجعت پسندی اور تعصب کی تمام بھیانک قوتوں پر بہادری کے ساتھ دھاوا بول دیا اور گو اس کو کبھی کبھی ایک لالۂ صحرائی کی طرح اپنی تنہائی کا احساس ہوتا اور اپنی پکار صدا بہ صحرا معلوم ہوتی لیکن اس نے دھیرے دھیرے ان تھک محنت اور صبر اور ہوش مندی کے ساتھ ہندوستانی ریاست کے طوفان زدہ جہاز کو امن اور عافیت کے ساحل کی طرف کھینچا۔ امریکہ کے مشہور افسانہ نویس سٹیفن ونسنٹ بینٹ نے اپنی ایک معرکتہ الآرا کہانی میں دکھایا ہے کہ ایک نامور وکیل ڈینیل ولسٹر کس طرح اپنے موکل کی روح کے لئے شیطان کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے اور انسان کی ہزاروں سال کی اخلاقی جدوجہد اور اس کی ناکامیوں کا ایسا اثر آفریں نقشہ کھینچتا ہے کہ جیوری کے ممبروں کی آنکھوں میں جو انتقام کی خوفناک جہنمی شعلے ہیں (کیونکہ ان سب کو شیطان نے مفید مطلب سمجھ کر چھانٹا ہے) بجھ جاتے ہیں اور وکیل بالآخر اپنا مقدمہ انسان کے حق میں جیت لیتا ہے۔ گاندھی جی کی زندگی کے آخری دور کا خیال کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اس وقت اپنے موکل یعنی اپنے پیارے وطن کو روحانی موت سے بچانے کے لئے شیطانی قوتوں کے ساتھ رسہ کشی کر رہے تھے۔ انھوں نے پھر ایک بار مبارزانہ انداز میں انسانی ضمیر کے سامنے اس تاریخی سوال کو پیش کیا کہ "کیا فائدہ ہوگا انسان کو اگر وہ ساری دنیا کو جیت لے لیکن اپنی روح کی دولت کو کھو بیٹھے"؟ کیا فائدہ ہوگا اگر ہندوستان سیاسی آزادی حاصل کرے لیکن اس کی قیمت میں ان روحانی قدروں کو ہار دے جن پر اس نے ہمیشہ ناز کیا ہے یعنی اپنی امن اور رفاقت کی جستجو، اپنی رواداری اپنے دل کی فراخی اور زندگی کا احترام؟۔ انہوں نے اس سوال پر، جو انسان کی زندگی کا بنیادی سوال ہے، اپنی جان کی بازی لگا دی اور جب ایمان کی آزمائش کا وقت موعود آیا تو انھوں نے اس شان کے ساتھ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی کہ ہونٹوں پر رام کا نام تھا اور شانتی کی مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ اپنی اس دل ہلا دینے قربانی سے انھوں نے ظلم اور انتقام کے نہ بند ہونے والے اور

PIERRE VAN PAASEN   DAYS OF OUR YEARS.

نامبارک سلسلے کو توڑا اور سب جماعتوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر اپنی حرکتوں پر غور کریں اور اس طرح انہوں نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو ایک نہایت زبردست فوری خطرے سے (جو سیاسی بھی تھا اور اخلاقی بھی) بچا لیا۔ یہ تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس خطرے کے سیاہ بادل بالکل چھٹ گئے ہیں اور مطلع صاف ہو چکا ہے۔ کوئی نبی یا پیغمبر بھی زبردستی عقل اور ایمان کو دوا کی گولی بنا کر کسی قوم یا جماعت کو نہیں کھلا سکتا! قرآن شریف میں صاف طور پر لکھا ہے کہ خدا کسی قوم کے دن اس وقت تک نہیں پھیرتا جب تک وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں ایک صالح انقلاب پیدا نہ کرے، نہ وہ اپنے پیغام لانے والوں کو نجات کا ٹھیکہ دار بنا کر بھیجتا ہے۔ البتہ ایک سچے اور ایماندار راہبر کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی مثال اور تعلیم اور ضرورت ہو تو اپنی آخری قربانی پیش کر کے ان کے دل و دماغ میں ایک تہلکہ پیدا کر دے تاکہ ان کو ایک "لمحہ فکریہ" ایک مہلت ایسی مل جائے جس میں وہ اپنے افعال کا جائزہ لے سکیں اور تباہی کی خندق میں گرنے سے خود کو روکیں۔ گاندھی جی کی آخری جدوجہد اور قربانی نے یہی کام کیا اور ایک دفعہ پھر اس صداقت کو آشکار کیا کہ اگر ایک شخص کی ذات میں عشق کی گرمی اور ایمان کی پختگی پیدا ہو جائے تو وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ یہ تھی گاندھی جی کی اہمیت اپنی قوم کے لئے۔

جس چیز نے گاندھی جی کو اس دور کا سب سے بڑا ہندوستانی بنایا اسی نے ان کو دنیا کا ایک بلند مرتبہ اور محبوب لیڈر اور بین الاقوامی امن اور مفاہمت کا ایک محکم ستون بھی بنا دیا۔ ان کی خاص صفات کیا تھیں؟ ان کی عالمگیر انسان دوستی جو سب انسانوں کو بغیر نسل، رنگ، مذہب، ذات پات کے بھید بھاؤ کے، دل میں جگہ دینے کو تیار تھی۔ ان کی محبت جس کی آغوش ہر مظلوم بلکہ ہر مجرم تک کے لئے کھلی تھی اور جو اپنے اثر سے دوسروں کے دل میں محبت کا چراغ روشن کر دیتی تھی، (سب کے لئے نہیں کیونکہ جن دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے ان کو تو اکثر نبی اور رشی بھی نہیں کھول سکے!) ان کی گہری، ہمدردی اور دل سوزی جو ہر کسی کے دکھ درد اور محرومی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتی تھی — یہاں تک کہ انہیں اپنی زندگی تلخ معلوم ہونے لگتی؛ اور انصاف کی لگن جس میں اپنے پرائے کی تفریق نہ تھی۔ اس کمزور، امن دوست انسان نے جس کے پاس نہ فوج تھی نہ دولت، نہ دوسرے مادی وسائل

تیس سال تک حکومت برطانیہ کی زبردست قوت کا مقابلہ کیا اور اس کے ظلم و تشدد کو جھیلا۔ لیکن اس کے دل میں انگریز قوم کی طرف سے کبھی نفرت یا برائی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ ان کی بہت سی اچھی باتوں اور قومی سیرت کی خوبیوں کو سراہتا رہا اور اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا رہا کہ وہ جس نظام حکومت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں اس میں اور انگریز قوم میں تمیز کرنا سیکھیں۔ انہوں نے ہمیشہ خلوص سے یہ دعویٰ کیا کہ میں انگریزوں کا دوست ہوں۔ لیکن ان کی نیک نیتی کو اس وقت تسلیم نہیں کیا گیا اور ان کی اس "ریاکاری" کی ہنسی اڑائی گئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ انگریزوں کے دوست بھی ہوں اور ان کی حکومت کی جڑیں بھی کھوکھلی کریں؟ اس وقت حکومت کے "دوست" وہ لوگ سمجھے جاتے تھے جن میں بے لاگ تنقید کی بجائے کہ ناگوار ہوتی ہے "جی حضوری" کی صلاحیت ہو اور جو قوم کی بجائے حاکموں کے ساتھ عہدِ وفا باندھیں لیکن بعد کے واقعات نے ان کے دعوے کی سچائی کو ثابت کر دکھایا اور جب حکومت انگریزی نے ان کی تحریک سے متاثر اور مجبور ہو کر ان کے ساتھ معاملہ کیا تو نہ صرف بدگمانی اور مخالفت بلکہ ظلم اور جبر کی یادیں بھی ایک حد تک مفاہمت میں بدل گئیں۔ ۔ اور پھر وہ وقت آیا، جو میرے خیال میں گاندھی اور ان کے اصولوں کے لئے آزمائش کا سب سے سخت موقع تھا، جب انہیں خود اپنی قوم کی زیادتیوں اور ظلموں کے خلاف جنگ کرنی پڑی۔ ان کا دھرم یہ تھا کہ جہاں کہیں برائی اور اَنیائے پائے جائیں ان کی مخالفت کریں۔ اگر ان کی قوم شرافت اور اہنسا کے راستے سے ہٹ جائے تو وہ اس کے خلاف بھی اسی بہادری اور ثابت قدمی سے آواز بلند کریں جس طرح انگریزوں کے خلاف۔ یہ بھی یاد رہے کہ کسی غیر قوم کے خلاف جنگ کرنا آسان ہے کیونکہ اس میں آزادی کا سرور اور دلولہ ہوتا ہے، عوام کی ہمدردی اور تائید حاصل ہوتی ہے اور ہر دل عزیزی کا تاج سر کی زینت بنتا ہے لیکن اپنوں کے خلاف، انہیں کی خاطر جنگ کرنے کے لئے بہت زیادہ ذہنی اور اخلاقی جرأت درکار ہے جو صرف خاصانِ خدا کے حصے میں آتی ہے۔ اس کی خاطر بڑی بدگمانیوں کو جھیلنا اور خونِ جگر پینا پڑتا ہے لیکن جو شخص اس آزمائش میں پورا اترتا ہے اور اس کسوٹی پر اپنی بزرگی کا ثبوت دیتا ہے وہ حق و باطل کی اس ابدی جنگ کا ایک تخلیقی کارکن بن جاتا

ہے جو کسی خاص جماعت یا قوم یا ملک کے خلاف نہیں ہوتی۔ جس کا جذبہ محرکہ ملک گیری یا قوت کا حصول نہیں ہوتا بلکہ وہ دراصل اجتماعی حیثیت سے خود انسان کی ادنیٰ اور اعلیٰ فطرت کے درمیان ہوتی ہے یعنی اُن قوتوں کے درمیان جن میں سے بعض اسکو بلندی کی طرف لے جاتی ہیں اور بعض پستی کی طرف کھینچنا چاہتی ہیں۔ فرد ہو یا قوم، اس کے اخلاقی شعور کا اصلی ثبوت یہی ہے کہ وہ حق اور ناحق میں تمیز کرنا اور بے لاگ طریقے پر اپنے اعمال کا احتساب کرنا سیکھے ورنہ عقل عیار کے ذریعہ اپنی بد اعمالیوں کو لباس پارسائی پہنانا اور دوسروں کو مجرم ٹھیرانا تو ایک پرانی کہانی ہے!۔

گاندھی جی نے اسی حقیقت کو ہمارے دل میں بٹھانے کی کوشش کی تھی کہ امن کی ذہنیت جنگ کی ذہنیت پر اور نیک نیتی بدنیتی پر اس وقت تک غالب نہیں آسکتی جب تک ہم انصاف کی خاطر ہر قسم کی نسلی اور وطنی "مصلحتوں" کو نظر انداز کر کے ظلم اور برائی کے خلاف جنگ نہ کریں خواہ وہ "اپنوں" میں ہوں یا "پرایوں" میں۔ جب یہ ذہنیت پیدا ہو جائے تو "اپنے" اور "پرائے" کا فرق بھی مٹ جاتا ہے اور انسانی ایکتا کا تصور حقیقت بن جاتا ہے۔ قرآن شریف میں اس اصول کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ "ساتھ دو نیکی اور پرہیزگاری کا اور ہرگز ساتھ نہ دو گناہ اور ظلم کا"، اور اس میں کہیں دور دور بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ ظلم اور زیادتی گوارا ہیں اگر "ہماری" جماعت ان کی مرتکب ہو اور نیکی اور پرہیزگاری بھی مردود ہیں اگر "دوسروں" میں پائی جائیں!

اس کتاب میں ان چند چھوٹے بڑے "چراغوں" کا ذکر ہے جنہوں نے حسب توفیق اپنی اپنی جگہ پر آندھیوں کا مقابلہ کیا اور اپنی ذات میں شریف انسانی قدروں کا جلوہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ چراغ ہیں جن کی روشنی سے میں نے اپنی بساط بھر کسب فیض کیا ہے کہ

دل چراغیست کہ نور از رُخِ دل برگیرد

اس لئے ان چراغوں کی یہ دل نواز داستان میں حالیؔ کے مندرجہ ذیل شعروں کے ساتھ گاندھی جی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں :۔

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
سرخ رو آفاق میں وہ رہ نما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملّاحوں کے بیڑے پار ہیں!

○

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

میرِ کارواں

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب تاریخ اپنی سخت گیر کسوٹی پر ان کی اور ان کے ہم عصر مشاہیر کی شخصیت اور کارناموں کو پرکھے گی۔ ہم لوگ جو پہاڑ کے دامن میں اپنی زندگی گذارتے رہے ہیں کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی بلندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا جن پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے، اس کے دل کی شورشوں کا جن میں لاوا کھولتا رہتا ہے ان طوفانوں کی یورش اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں اور جواہرات کے ان خزانوں کا جو اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں! فی الحال تو صرف ان کی عصر آفریں شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور اپنی خاص قدریں خاص اصول اور نیک و بد کے خاص سانچے ڈھالتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے جس کا تسلسل ہزاروں برس سے قائم ہے اور جس کے بنانے میں مختلف قوموں، نسلوں، زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے۔ تاریخ میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن اور ہندوستان میں ٹیگور اور گاندھی جی۔ مولانا آزاد بھی اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی۔

انھوں نے مشرقی تہذیب اور ادب اور علوم وفنون کے ماحول میں تربیت پائی اور مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح ان کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے مطالعہ کی گہرائی اور فکر کے فیض سے اس تعلیم کی حدوں کو اور وسیع کیا اور اس میں جدید علوم اور مغربی فکر کی روح کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمویا۔ انھوں نے تحریر اور تقریر کے فن میں بے نظیر کمال حاصل کیا تھا جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کی اشاعت بہت موثر اور شگفتہ انداز میں کر سکتے تھے اور کرتے رہے۔ اس اٹھان سے یہ پیشین گوئی کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ ایک جیّد عالم دین بنیں گے اور مسلمانوں کی ذہنی اور مذہبی قیادت کا فرض انجام دیں گے لیکن قدرت کو ان سے یہ کام بھی لینا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ قوم کی سیاسی راہبری بھی ان کے نصیب میں لکھی تھی۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان دو فرضوں کی انجام دہی میں بڑی حسین ہم آہنگی پیدا کی! انھوں نے مسلمانوں کو ان کی تہذیب اور مذہب کی قدروں سے آشنا کیا، ہندوستان کے ایوان مستقبل میں انہیں انکا مقام دکھایا اور ان مختلف لیکن مربوط فرائض کی تعلیم دی جو ایک مسلمان، ایک ہندوستانی اور ایک انسان کی حیثیت سے، جو دنیا کا شہری ہے، ان پر عائد ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری جماعتوں کے مفاد اور بہبود اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں جیسے گوشت سے ناخن کہ ان کا جدا ہونا ناقابل قیاس ہے۔ جب تک سارا ملک آزاد نہ ہو، اس میں سے غریبی بیماری اور جہالت کو دور نہ کیا جائے، عام لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر نہ بنایا جائے، جب تک پوری قوم کے دماغ میں علم اور عقل کے چراغ روشن نہ ہوں اور حریم قلب میں انسانیت کا گداز نہ پیدا ہو مسلمان اپنی "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد" بنا کر اپنے مسئلوں کا حل نہیں کر سکتے اپنی کشتی کو اکیلے کھے کر عافیت کے ساحل تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے خود ان کی بہتری کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور ایک بہتر سماج بنانے کی تحریک میں کھلے دل سے شریک ہوں۔

لیکن مولانا آزاد کی نظر اپنی جماعت تک محدود نہیں رہی۔ ان کا ذہنی اور جذباتی الحاق

ان کے اپنے الفاظ میں "ایک عالم گیر تصور انسانیت" کے ساتھ تھا۔ وہ ہر مسئلے کو ایک "انسانی" مسئلہ سمجھتے تھے اور خیر و شر کو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ایک ناقابل تقسیم میراث! سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب ایک مرد مومن خدا کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے تو وہ ایک ایسے سیدھے اور سچّے راستہ پر چلنے کی دعا مانگتا ہے جو تاریخ انسانی میں سچ کے سیوکوں اور پرچارکوں کا مشترک راستہ رہا ہے نہ کہ کسی خاص قوم یا گروہ یا نسل کا اور جب وہ ظلم اور برائی کے راستے سے پناہ مانگتا ہے تو وہ بھی ان تمام لوگوں کے راستے سے خواہ وہ کسی قوم یا جماعت یا نسل کے ہوں جنھوں نے سچائی سے منھ موڑا اور ظلم اور نافرمانی کی دلدل میں جا پھنسے۔ جو شخص اس بلند اور ہمہ گیر تصور کو علم بنا کر کارواں کی قیادت کرے گا اس کے دل اور دماغ کے کسی گوشے میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، ہندی اور غیر ہندی، کالے اور گورے، مشرقی اور مغربی، اونچ ذات اور نیچ ذات کا تعصب نہیں ہو سکتا وہ جغرافیہ یا نسل یا ذات پات کی بنیاد پر انسانوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا آزاد نے میر کارواں کے پورے رخت سفر سے آراستہ ہو کر قوم کی رہنمائی کی یعنی نگاہ بلند، سخن دل نواز اور جان پرسوز اور اس رخت سفر کو اس خوبی اور دل آویزی کے ساتھ زیب قامت کیا کہ دنیا کی تحریصوں اور آلائشوں اور نفس کی زنجیروں کو توڑ کر نسیم بہار کی سبک روی کے ساتھ کوہ و دریا سے گذر گئے۔ . . .

یہ محض ایک ادبی چٹخارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ ساری زندگی سیاست کی منجدھار میں گذارنے کے باوجود انھوں نے اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کے لئے کبھی اشتہار بازی سے کام نہیں لیا۔ اپنی کوئی پارٹی نہیں بنائی، سیاست کا کھیل کھیلنے والے جو گھٹیا چالیں اور ریشہ دوانیاں اس مقصد کے لئے کرتے ہیں اُن سے اپنے وقار اور عفّت کو آلودہ نہیں کیا۔ سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے عوام کے وقتی جذبات اور تعصبات کے لئے مائکروفون نہیں بنے۔ گمراہ عوام کی سطح پر نہیں اترے بلکہ کبھی ناصح مشفق کی محبّت اور سمجھ داری کے ساتھ، کبھی پیغمبرانہ جرأت اور للکار کے ساتھ انہیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ سیاست کے طوفانوں میں ان کے قدم پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ مثلاً وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے اور اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ اور خطرناک سمجھتے تھے۔ جب

مجبوری اور مصلحت کے تقاضوں سے قوم کے دوسرے بڑے نیتا اس عمل جراحی پر آمادہ ہوگئے، اس وقت بھی ان کی رائے کے ثبات میں فرق نہیں آیا۔

ان میں خیال اور عقیدے کی بے پناہ جرأت تھی اور اس کے اظہار میں کوئی خوف یا مصلحت اندیشی ان کی زبان یا قلم کو نہیں پکڑ سکتی تھی اور کیوں نہ ہوتی؟ اس سارے جہاد میں ان کی کوئی ذاتی غرض نہ تھی۔ لابھ اور موہ کا میل نہ تھا۔ نہ روپیہ کمانے کی خواہش تھی نہ قوت حاصل کرنے کی۔ بس حق دوستی اور حق پرستی کا ایک شدید جذبہ تھا کہ قوت محرکہ کا کام کرتا تھا۔ پھر وہ ڈرتے تو کس سے ڈرتے اور کیوں؟ انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ خدا کا خوف عقل کی ابتدا ہے اور قرآن کی تعلیم ہے کہ خوف الٰہی اور تمام خوفوں سے نجات دلاتا ہے۔ پہلے سرچشمہ سے انہوں نے عقل کی روشنی حاصل کی تھی اور دوسرے سے ذہنی اور اخلاقی جرأت کا چراغ روشن کیا تھا۔ جب جرأت کے ساتھ خلوص اور بے غرضی شامل ہو جائے تو انسان میں بے پناہ اخلاقی جرأت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک سپاہی کی ضرب کار سپاہ کر دکھاتی ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں مولانا کی ایسی ہی پوزیشن تھی۔ یہی بھید تھا قوم کے مشورتی ایوانوں میں ان کی آواز کی قوت کا اور اس اعتماد کا جو مختلف گروہوں کو ان کی ذات پر تھا خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی برسر پیکار ہوں۔ اقلیتیں ان پر بھروسہ کرتی تھیں اور اکثر ان کی بات ماننے پر راضی ہو جاتی تھیں کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہ ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کریں گے، ناانصافی نہ ہونے دیں گے۔

جہاں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی اسلامی اور وطنی زندگی اور فرائض میں ہم آہنگی اور وحدت کا احساس پیدا کیا وہاں انہوں نے مشرق و مغرب کی تہذیبی قدروں میں بھی کسی بنیادی تضاد کو تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے مطالعہ کی گہرائی اور فکر کے فیض سے اپنی روایتی تعلیم کی حدوں کو نئی وسعت بخشی اور اس میں جدید علوم اور مغربی فکر اور فلسفے کی روح کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمویا۔ ان کی خلاق طبیعت نے مغرب کی بہترین قدروں کو اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج بن گئی۔ اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضع داری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی۔ ذہنی جرأت۔

انسان دوستی، فعالیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس طرح ان کی ذات نے ماضی اور حال کے درمیان مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام کیا۔ وہ ایک زبردست عالم دین تھے لیکن "ملا" کی روایتی تنگ نظری سے آزاد، فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی اس کی سطحی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکے۔ ان کا مسلک گویا یہ تھا

نہ فلسفی سے نہ ملاّ سے ہے غرض مجھ کو

یہ دل کی موت وہ اندیشۂ نظر کا فساد

ان کے نزدیک مذہب فلسفہ، سائنس، سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈالے اور اس غرض کے لئے اپنی جسمانی اور روحانی قوتوں کو پورا فروغ دے۔ ان کی زندگی میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی۔ دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی یکساں کارفرمائی تھی۔ وہ ایک پختہ کار اور بیدار مغز سیاست داں تھے اور انہوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی تھی لیکن اس کے لئے کبھی گھٹیا ذریعے استعمال نہیں کئے اور سچائی اور خلوص کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور جب لوگ راستہ بھٹک گئے اور خود مولانا کی طرف سے انہوں نے روگردانی کی اس وقت بھی صبر، استقلال اور یک سوئی کے ساتھ اپنے معلمی اور ہدایت کے فرض انجام دیتے رہے۔

سیاست کے طوفان آئے، زلزلوں نے پہاڑوں کے ثبات قدم کو لڑکھڑایا۔ لیکن یہ مرد مجاہد، یہ کوہ وقار مومن اپنی جگہ پر، اپنے اصولوں پر، اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا۔ اس شان کے ساتھ کہ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا" نہ مخالفوں اور بد باطنوں کی ملامت کا خوف اور شکوہ۔ اُن کی دریدہ دہنی اور بدزبانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا تو اتنا کہا کہ "یہ کیسے عاقبت ناشناس ہیں" یعنی نہیں جانتے، نہیں سمجھتے کہ ان کی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔ ان کا پیغام قوم کے لئے یہی تھا کہ نیکی اور شرافت کا ساتھ دو اور برائی اور بے انصافی

کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی رسی کو جو حق و صداقت کی رسی ہے، جو ستیہ کا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ انہوں نے اپنی عمر بھر کبھی اس حبل المتین کو اس مضبوط رسّی کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں "اپنوں" کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی صحیح اور سچی بات میں "غیروں" سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لئے اپنے وہی تھے جو ان کے اصولوں سے متفق ہوں اور غیر وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں!

قدرت نے انہیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلہ کی گتھیوں کو سلجھا دیتے اور ان کا ناخن تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا۔ یہی حال دفتر کے کاموں میں تھا۔ ہم لوگ معاملات کی جزئیات میں الجھتے موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفس معاملہ تک پہنچ جاتی اور وہ ایک واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل اتنا فراخ تھا کہ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے اس وجہ سے جیسا میں نے کہا ان پر تمام اقلیتوں کو پورا بھروسا تھا اور وہ جانتی تھیں کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی برائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سنا کہ "فلاں چھوٹے دل اور دماغ کا آدمی ہے"۔ ان کی ترازو میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت تھی۔

مولانا آزاد فطرتاً ایک پالیٹیشین نہ تھے بلکہ ٹیگور، گاندھی اور جواہر لال نہرو کی طرح ایک معلم تھے۔ ان کی دلچسپی کا مرکز قوت کے کھیل اور سیاست کی مہرہ بازی نہ تھی بلکہ صحیح اور صالح قدروں کی اشاعت اور قومی کردار کی تشکیل۔ وہ جانتے تھے کہ جو سیاسی اقتدار اور آزادی ان قدروں کی بنیاد پر قائم نہ ہو اس کا انجام بخیر نہیں ہو سکتا اور جب تک قوم میں رواداری، جرأت، سچائی کی لگن، محنت کی عادت، ڈسپلن، مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور ایثار کی صفات نہ پیدا ہوں۔ آزادی ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔ جب انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں محسوس کیا کہ یہ تعمیری کام سیاسی آزادی حاصل کئے بغیر خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا تو وہ خانقاہ کی گوشہ نشینی ترک کر کے سیاست کے خارزار میں آئے لیکن اس تبدیلی مقام سے ان کے مقصد یا آئیڈیل میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ مقصد اب بھی وہی

تھا۔ لیکن عمل کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔

انہوں نے جنگ آزادی کے زمانہ میں اس تحریک کی سرداری کی، قید و بند کی کڑیاں جھیلیں اور سقراط کی طرح آزمائشوں کے زہراب کو شہد کا گھونٹ بنا کر پیا اور جب آزادی حاصل ہو گئی تو انہوں نے ایک حد تک گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ لیکن ان کی زبان اور ان کا قلم، ان کی رائے اور ان کا مشورہ سب اسی مقصد کے لئے وقف رہے کہ قومی زندگی صالح بنیادوں پر قائم ہو۔ جب کبھی نظری یا عملی اعتبار سے قومی زندگی میں کوئی نازک موقع یا مشکل مقام آیا جہاں اندیشہ ہو کہ شاید مصلحت کی کشمکش انصاف اور دیانت داری پر غالب آجائے تو ان کی اصول پرستی اور جرأت اور حق گوئی نے سدِّ سکندری کا کام دیا اور مصلحت پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے حق شناسوں نے ان کو "قوم کے ضمیر" کا خطاب دیا تھا یعنی اس میدان میں انہوں نے اس فرض کے بار کو اٹھایا جو گاندھی جی انجام دیتے رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے ان کی مخالفت بھی بہت شدید ہوئی۔ ان مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے جو ان سے رائے اور اصول میں اختلاف رکھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شخص کی آزادیٔ ضمیر کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ ناواقف لوگ ان کو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور دعوتوں میں نہ دیکھتے تو خیال کرتے کہ مولانا آزاد اب سیاست کے مرکز سے دور ہو گئے ہیں اور ان کا اثر کم ہو گیا ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ جب کانگریس آزادی کی جنگ کر رہی تھی، مولانا کانگریس کے ایک ممتاز رکن اور صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے۔ لیکن آزادی کے بعد انہوں نے اپنے لئے ایک دوسری شاہراہِ عمل معین کر لی جس پر چل کر وہ ملک کی سچی خدمت اور رہنمائی کر سکتے تھے۔ بے شک اب وہ ایک لحاظ سے گوشہ نشین تھے۔ لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے لیکن ان کی انگلیاں قوم کی نبض پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کرنا چاہیئے۔ اب ان کی شان یہ تھی۔

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں

شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!

فکر کی تابانی تو سب پر روشن ہے اور محفل سے جدائی کی شان بھی بہت لوگوں نے دیکھی لیکن "سب کی رفاقت"

کا کم لوگوں کو صحیح اندازہ تھا۔ اس کا ثبوت ملا جب ان کے بنانے والے نے ان کو یاد کیا اور وہ اس کا نام لیتے لیتے اس کے حضور میں پہنچ گئے۔ اس وقت نہ صرف لاکھوں دلی والوں کی بلکہ بے شمار ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت صبر اور ضبط کے بندھن توڑ کر امنڈ پڑی اور باہمی تفرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموشی اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جم غفیر میں جو ۲۲ رفروی کو ان کے مکان کے گرد جمع تھا ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سنا "ارے آزاد نے بادشاہت کی ہے بادشاہت"۔ ایک معنی میں یہ بالکل سچ ہے۔ وہ دل اور دماغ کے بادشاہ تھے۔ حکومت کی پالیسی کے بنانے اور ڈھالنے میں ان کا جو حصہ تھا اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے پیش نظر اس بوڑھے کا یہ قول بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ بادشاہ جس میں ایک طرف انتہائی خودداری اور خودی کا احساس تھا جو کبھی کسی قوت کے سامنے سر نہ جھکاتا تھا۔ ایک فقیر بھی تھا۔ فقیر اقبال کی اصطلاح میں یعنی

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اس وجہ سے اس کے ہاں فقر و شاہی کے ڈانڈے مل جاتے تھے اور دل کہتا تھا

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے — جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے!

اس فقیر کے پاس متاع دنیا میں سے بہت کم تھا، نہ مال و دولت نہ جائداد نہ سرمایہ۔ نہ خانگی زندگی کی وہ پابندیاں جو دل میں کمزوری پیدا کرتی ہیں۔ اس میں بے نیازی کی ایک خاص شان تھی اور نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کسی انجمن کسی درسگاہ کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ یونی ورسٹیوں کی اعزازی ڈگریاں قبول نہیں کیں۔ تاریخ پیدائش تک پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو منانے نہ لگیں۔ مولانا آزاد نے جہاں ایک شاہانہ شخصیت اور انداز فکر و عمل پایا تھا وہاں ان کے دل میں عام لوگوں اور غریبوں اور سماج کے ستائے ہوئے طبقوں کے لئے خاص ہمدردی اور گداز تھا جس کے افسانے زبان خلق مدتوں تک سنائیگی، لیکن اس کی ایک انوکھی جھلک اس "انتساب" میں دکھائی دیتی ہے جو انہوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنے علمی اور مذہبی شاہکار "ترجمان القرآن"

کے لئے لکھا تھا۔ اس زبردست تصنیف کو انھوں نے نہ کسی رئیس کے نام منسوب کیا نہ کسی عالم کے نہ کسی دوست کے نہ عزیز کے، بلکہ ایک غریب گمنام اجنبی کے نام جوان کے پاس ایک دوسرے دیس سے سینکڑوں میل چل کر علم اور دینی ہدایت حاصل کرنے آیا تھا:۔

"غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظربند تھا عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑکے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جناب میں بہت دور سے آیا ہوں"

"کہاں سے؟"

"سرحد پار سے"

"یہاں کب پہنچے؟"

"آج شام کو پہنچا میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے۔ انہوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"

"افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟

"اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال اور البلاغ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھیرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا کہ میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصّہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظہ نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

کیسا شان دار اور اثر آفریں اعتراف ہے، یہ طلب صادق کا، علم کی پیاس کا، مذہب کی سچی لگن کا خواہ وہ ایک بوسیدہ کمبل میں ملبوس ہو۔

اس مرد مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا؟ وجاہت ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی، دماغ کی تابانی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی، دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا ہر چیز کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حدوں کا پتہ نہ چلے، تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا اور لفظوں سے کام لیا شعلہ و شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا۔ مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں دین اور دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکر حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ یہ تھے مولانا آزاد ایسا دوسرا کہاں سے آئے گا؟ بقول حالیؔ

ملک یک سر ہوا ہے بے آئین
اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی
ڈھونڈتے کیا ہو سبب وریاں میں

لب جادو بیاں ہوا خاموش
گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں

وہ گیا جس سے بزم روشن تھی
شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات پر ایک قطعہ لکھا تھا جس کے آخری شعر میں امید کا وہ پیغام ہے جو دکھ اور مایوسی کی کیفیت میں بھی ہماری ہمت بندھاتا ہے۔

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیش کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد

آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں

اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغ ارم میں ہے آزاد

رحلت کی تاریخ تری نکلی منہ سے فغاں بن کر

دل پہ آج، ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد

۱۹۵۸ء

اتنے میں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہے

دل کی آنکھیں کھول کے دیکھ اب بھی ہم میں ہے آزاد

روح فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے

شرق و غرب میں ہے آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد

○

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

شمع محفل
(سیّد راس مسعود)

مجھے اپنی زندگی میں جن مشاہیر سے ملنے کا اتفاق ہوا ان میں سے دو نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ ایک ڈاکٹر اقبال اور دوسرے سر سید راس مسعود۔ ڈاکٹر اقبال سے مل کر انسان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کا دماغ حکمت وفراست کا ایک گہرا خزانہ ہے جس کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں یا روشنی کا ایک مینار ہے جو انسانی تقدیر اور امکانات کے چھپے ہوئے گوشوں کو منور کر دیتا ہے۔ سر سید راس مسعود سے مل کر انسان نہ صرف ان کی دماغی قابلیت سے متاثر ہوتا بلکہ ان کی سراپا دلکش شخصیت سے مسحور ہو جاتا تھا ان کی ایک ہی ملاقات کا نقش اس قدر گہرا ہوتا تھا کہ اس کو بھلانا ممکن نہ تھا۔ اس سراپا باغ وبہار شخصیت کی تصویر کشی کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے جن لوگوں کو ان کی ملاقات اور دوستی کی نعمت میسر نہیں ہوئی انہیں شاید میرے الفاظ میں مبالغہ کی جھلک نظر آئے۔ لیکن ان کے ہزاروں دوستوں اور عقیدت مندوں کو خیال ہوگا کہ یہ تصویر بے کیف و بے رنگ ہے اس جیتی جاگتی دل فریب شخصیت کے مقابلے میں جو ان کے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے۔ خود مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ میری نگاہ تخیّل کے سامنے تو مصور فطرت کا ایک رنگین شاہکار ہے اور میں گویا قلم سرمہ کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کر رہا ہوں! چاہتا ہوں کہ پہلے میں مختصر طور پر ان کی زندگی کے چند واقعات بیان کروں اور پھر اپنے ذاتی تاثرات جن میں شاید ان کی شخصیت کی ہلکی سی جھلک نظر آجائے۔

(۱)

راس مسعود سر سید اعظم کے پوتے اور جسٹس محمود کے بیٹے تھے۔ بچپن ہی سے انہیں ایک ایسا ماحول ملا جوان کی خداداد قابلیتوں اور صلاحیتوں کے لئے خاص طور پر سازگار تھا۔ انہوں نے وجاہت ظاہری اور دماغ اور سیرت کی بہت سی خوبیاں اپنے باپ دادا سے وراثت میں پائی تھیں۔ ماحول کے اثر اور جوہر ذات نے ان خوبیوں کو چار چاند لگا دیئے۔ اسکول کی تعلیم علی گڑھ میں ختم کرنے کے بعد راس مسعود انگلستان چلے گئے اور نیو کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے۔ سننے میں آیا ہے کہ ان کے استاد اور دوست اور ملاقاتی ہی نہیں بلکہ کالج کے ملازم تک ان کی شخصیت سے اس درجہ متاثر تھے کہ عمر بھر ان کی یاد نہ بھلا سکے۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے اور ان کے سب استاد ان کی جدت طبع اور وسعت تخیل کے قائل تھے۔ کھیلوں میں انہوں نے کمال بہم پہنچایا تھا۔ وہ اپنے کالج میں ٹینس اور باکسنگ کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور کپتان رہے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ مقبولیت تھی جو انہیں انگلستان کی اونچی سوسائٹی میں حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں ایسی مثالیں کم ملیں گی کہ کوئی شخص راس مسعود کی طرح انگلستان کے اونچے اور شریف خاندانوں میں اس طرح گھل مل کر رہا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات انہیں اپنے باپ اور سر تھیوڈور مارلیسن کے معزز انگریز دوستوں کی سفارش سے نصیب ہوئی۔ لیکن اگر اُن کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا جسے علم مجلسی میں یہ غیر معمولی قابلیت نہ ہوتی تو تعارف اور سفارش کے باوجود آگے نہ بڑھ سکتا۔ راس مسعود کی شخصیت میں کوئی ایسی دل کشی تھی کہ وہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ غیر معمولی ہر دلعزیزی انہوں نے اپنی انفرادی خصوصیات کھو کر حاصل نہیں کی تھی۔ ان کی تہذیبی قدریں بالکل ہندوستانی تھیں مگر اس کے ساتھ وہ حقیقی معنوں میں ایک عالمگیر تہذیب کے حامل تھے بعض لوگ غیر ملکی سوسائٹی میں مقبول ہونے کے لئے بدیشیوں کے طور طریق کی نقالی کرنے لگتے ہیں مگر راس مسعود نے کبھی اپنے اصلی رنگ کو نہیں چھوڑا۔ ان کی دل کشی اور اثر آفرینی کا راز ہی یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی وضع پر قائم رہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کے قدر شناس انگریز احباب ان کی سچی قدر کرتے تھے، محض مربیانہ شفقت نہ فرماتے تھے!

انگلستان سے واپس آنے کے بعد راس مسعود نے اپنے لئے تعلیم کا میدان منتخب کیا۔ اور اس میں بڑی اہم اور قابل قدر خدمات انجام دیں۔ وہ انڈین ایجوکیشن سروس کے ممبر تھے سب سے پہلے گورنمنٹ ہائی اسکول پٹنہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور پھر چند ہی سال میں ترقی کر کے ریونشا کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے۔ میرے خیال میں تعلیم کے کام سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت نہ تھی۔ مگر دو صفات ان میں ایسی تھیں جن کی بدولت انہوں نے معلم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ایک طرف وسعت مطالعہ اور سلامت ذوق نے ان کے ذہن کو پاکیزہ خیالات، برجستہ اشارات، برمحل حکایات اور تلمیحات کا مخزن بنا دیا تھا۔ اسی لئے ان کی گفتگو، حلقہ درس ہو یا صحبتِ احباب سننے والوں کے لئے ایک روحانی نعمت تھی۔ دوسری ان کی شخصیت کا خلوص اور دل کشی، اُن کی بے مثل ظرافت اور سچا جوش، جس میں آخر عمر تک شباب کی تازگی قائم رہی نوجوانوں کو مقناطیس کی طرح کھینچتا تھا۔ ڈسپلن قائم کرنے میں انہیں کبھی دقت نہیں ہوئی، طالب علموں سے وہ انتہائی شفقت اور محبت سے پیش آتے اور وہ بھی ان سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ بھلا کس طالب علم کا سر پھرا تھا کہ ایسے شفیق اور ہمدرد استاد سے، جو نوجوانوں کی نفسیات کا ماہر تھا اور ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں دل و جان سے شریک رہتا تھا، سرکشی اختیار کرتا؟ مگر یہ وہ اوچھی ہر دلعزیزی نہ تھی جو بعض استادوں کو اس وجہ سے حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا کوئی خاص ذہنی رنگ نہیں رکھتے بلکہ شاگردوں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ راس مسعود ادب، آرٹ شاعری، تاریخ، نفسیات غرض ہر قسم کے تہذیبی اور تمدنی مسائل سے ذوق رکھتے تھے۔ ان کی نظر مدرسہ کی چار دیواری میں مقید نہ تھی۔ کتابوں کے مطالعے، انسانوں کے ساتھ عملی لین دین اور معاملات کے تجربے نے انہیں زندگی کے وسیع تر دائرے سے آشنا اور ان کی منفرد شخصیت کو گوناگوں صفات سے مالا مال کر دیا تھا۔ قدرتاً ایسی شخصیت کا فیض نسیم بہار کی طرح ان کے طلبہ کے تھکے ہوئے دل و دماغ کو فرحت اور تازگی بخشتا تھا۔

صرف چند سال انڈین ایجوکیشن سروس میں رہنے کے بعد شاید تیس برس کی عمر میں راس مسعود

حیدرآباد کے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم مقرر ہو گئے۔ حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں ان کی وہ خدمات جوانہوں نے محکمہ کی تنظیم جدید کے سلسلے میں انجام دیں آبِ زر سے لکھی جائیں گی۔ یہاں اُن کی تفصیل کا موقع نہیں۔ البتہ شخصی اعتبار سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ حیدرآباد جیسے مقام پر جہاں ناظم تعلیم کا عہدہ مقابلتہً زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا اور جہاں وزراء اور معتمدین کے درباروں کی شان دوسرے عہدہ داروں کو مرعوب کر دیتی تھی راس تیس برس کے نوجوان ڈائرکٹر نے پوری ریاست میں اپنا سکّہ بٹھا دیا۔ چند ہی سال کے عرصہ میں راس مسعود نے وہ اثر و اقتدار حاصل کر لیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اکثر اراکین حکومت سے اُن کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے اور ان کی ذات مجلسوں کی رونق، علمی اور ذہنی زندگی کا اور خاص و عام کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اُن کی غیر معمولی ذہنی قابلیت، ان کی شخصیت، اُن کی معاملہ فہمی اور ذاتی اثر آفرینی کا کرشمہ تھا کہ حکمت عملی کی بساط پر انہوں نے بڑے بڑے شاطروں کو مات کیا اور ان کے حریفوں کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ ایسے دبنگ آدمی کا مقابلہ کرنا کھیل نہیں ہے۔ وہ دوستوں کے کھلے دوست اور دشمنوں کے کھلے دشمن تھے۔ مگر دنائت اور خباثت سے اُن کا دامن پاک تھا۔ ڈپٹ کر وار کرتے تھے اور سنبھل کر روکتے تھے لیکن ان کے مخالفوں کو بھی اُن کی عالی ظرفی کا اعتراف کرنا پڑتا تھا اور وقت پڑنے پر وہ ان کی مدد کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔

حیدرآباد میں ان کی سب سے بڑی تعلیمی خدمت عثمانیہ یونیورسٹی کی تاسیس ہے۔ یہ تجویز ان کے عزیز دوست مولوی عبدالحق کی ان تھک کوشش، سر اکبر حیدری کے تدبّر اور اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد کی توجہ سے مرتب ہوئی تھی لیکن اسے عملی جامہ پہنا کر ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا بڑی حد تک راس مسعود کا کارنامہ ہے۔ اُن کا دلی عقیدہ تھا کہ موثر اور سچی تعلیم وہی ہو سکتی ہے جو طلباء کی مادری زبان میں دی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے ہر حصے میں الگ الگ یونیورسٹیاں ہوں جو مختلف دیسی زبانوں میں تعلیم دیں۔ یہ خیال مرحوم نے مختلف موقعوں پر شد و مد سے ظاہر کیا ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس بنارس، ریونشا

کالج کٹک، اور کلکتہ کے تعلیمی ہفتے میں جو خطبے انہوں نے دیئے ہیں اُن میں اس مسئلہ پر مدلل بحث موجود ہے۔ انہوں نے اس تحریک کی تائید اس وقت کی جب ہندوستان کا بیشتر تعلیم یافتہ طبقہ اس بات کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا کہ انگریزی کو بحیثیت ذریعۂ تعلیم کے ترک کرے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام میں مدد دینے کے علاوہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی میں جہاں تک اُن سے ہو سکا، شعبۂ اُردو کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ اندور میں ہندی یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی وہ اس کے بھی ایک مستند ممبر تھے اور اس میں انہوں نے کافی دلچسپی لی۔

ماہر تعلیم اور مدبر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اُن کا ذکر کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے مالی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو ان کی کوششوں سے یونیورسٹی کو پانچ برس میں اتنے عطیات مل گئے جتنے شاید اس سے پہلے پچاس برس میں حاصل نہ ہوئے تھے۔ انتظامی حیثیت سے انہوں نے تنظیم جدید کی مہم کو، جس میں قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا تھا، نہایت کامیابی سے سر کیا۔ بہت سی انتظامی کمزوریاں جو سابق دور میں پیدا ہو گئی تھیں ان کو رفتہ رفتہ دور کیا۔ علمی اور تعلیمی اعتبار سے یونیورسٹی نے کافی ترقی کی۔ مختلف شعبوں کی اصلاح اور توسیع ہوئی۔ سائنس کا شاندار کالج قائم ہوا اور فزکس اور بیالوجی میں ریسرچ کی بنیاد پڑی اس طرح یونیورسٹی کی ساکھ پبلک اور حکومت کے دلوں میں پھر سے قائم ہو گئی اور علی گڑھ کے طلبا پھر علی گڑھ پر فخر کرنے لگے۔

مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ یونیورسٹی کی باگ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو تہذیب نفس، وسعت نظر اور رفعت خیال رکھتا ہے۔ تعلیمی معاملات کو تعلیمی نظر سے دیکھتا ہے اور اہل علم کے ساتھ اہل علم کا سا برتاؤ کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی کوئی پارٹی نہیں بنائی بلکہ اپنے امکان بھر یونیورسٹی کو ایک علمی ادارے کی شان کے ساتھ اور انصاف سے چلانے کی کوشش کی اور اپنے دشوار فرائض کو انجام دینے میں اپنی راحت اور آرام بلکہ اپنی صحت تک قربان کر دی۔

لیکن وہ علی گڑھ میں پانچ سال سے زیادہ نہیں رہ سکے۔ ایسا وائس چانسلر جو اپنے خیال اور عمل میں آزاد ہو اور یونیورسٹی کے معاملات میں بیرونی اثرات کو قبول نہ کرے ارباب غرض کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایسی حالت میں وہ یونیورسٹی کی خاطر خواہ خدمت نہیں کر سکتے تو استعفا دے کر الگ ہو گئے۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت حساس طبیعت رکھتے تھے اور پبلک نکتہ چینی کو آسانی سے برداشت نہ کر سکتے تھے جو جمہوری اداروں کو چلانے کے لئے ضروری ہے۔ مگر علی گڑھ سے انہیں جو دلی تعلق اور اس کی فلاح و بہبود سے جو شغف تھا وہ بدستور باقی رہا۔ جب یونیورسٹی کا مورخ ذاتی تعلقات اور انفرادی جذبات سے قطع نظر کر کے اس دور کے حالات پر تبصرہ کرے گا تو بڑے دل چسپ انکشافات ہوں گے، جن سے بعض لوگوں کی شہرت پر بُرا اثر پڑے گا، مگر مجھے یقین ہے کہ راس مسعود کی ذات تاریخ کی کسوٹی پر پوری اترے گی اور اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہ کر سکے گا کہ انہوں نے انتہائی جوش اور سرگرمی، خلوص اور بے نفسی سے اس درسگاہ کی خدمت کی اور چند ہی سال میں اس کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو گرداب سے نکال کر ساحل عافیت پر پہنچایا۔

(۲)

پہلی مرتبہ مجھے ۱۹۲۲ء میں ان کا نیاز حاصل ہوا۔ میں اس زمانے میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا اور وہاں سے طلبہ کے ایک وفد میں شریک ہو کر حیدر آباد گیا تھا۔ میرے اور ان کے خاندان میں تین پشتوں سے (یعنی مولانا حالی اور سرسید کے زمانے سے) خلوص اور محبت کے مراسم چلے آتے تھے۔ اس لئے ان کی خدمت میں حاضر ہونا میرا فرض تھا۔ چنانچہ میں اپنے ایک دوست خواجہ سرور حسن کے ساتھ جو اس زمانے میں حیدر آباد میں رہتے تھے ان کے ہاں پہنچا۔ ہم ان کے کتب خانہ میں جا کر بیٹھے جہاں ہزاروں کتابیں نہایت سلیقے کے ساتھ الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے اکثر کی نہایت خوشنما اور دیدہ زیب جلدیں انہوں نے اپنے خاص اہتمام سے بندھوائی تھیں۔ ان کے حسن مذاق کی یہ پہلی جھلک تھی جو میں نے دیکھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب ان سے ملنے کے زیادہ موقعے ملے تو اندازہ ہوا کہ ان کی گوناگوں دل چسپیوں کے ہر شعبہ میں، ادب میں، آرٹ میں، موسیقی میں، فن تعمیر

اور مکان کی آرائش میں، باغ کی چمن بندی میں، غرض ہر جگہ بھی حسن مذاق کار فرما تھا . . . .
چند ہی منٹ بعد ایک وجیہہ اور شاندار شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اونچا قد، سڈول جسم، گورا رنگ، انگریزوں کی طرح سرخ و سفید نہیں بلکہ ہسپانیوں کی طرح ایک زیتونی جھلک لئے ہوئے، پیشانی کشادہ جس سے دماغ کی وسعت اور فراخی ظاہر ہوتی تھی، آنکھیں بڑی اور روشن جن سے بیک وقت سنجیدگی اور ظرافت ٹپکتی تھی بشرے سے عزم اور استقلال آشکار، اور چہرہ ذہانت اور ذکاوت کا آئینہ دار . .
یہ تھے سیّد راس مسعود۔ میں اُن سے ملنے تو آیا تھا مگر دل میں جھجک تھی۔ میں ایک گمنام طالب علم اور وہ ریاست حیدر آباد کے ناظم تعلیمات اور ایک مسلّمہ شہرت کے مالک! شاید ملاقات بالکل رسمی ہو کر رہ جائے۔ شاید وہ بعض یورپ زدہ ہندوستانیوں کی طرح پوچھ بیٹھیں "میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں"۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی گفتگو یا دلچسپی کے افلاس کو چھپانے کی خاطر موسم کے بارے میں بات چیت کرنے لگتے ہیں یا بہت سے دوسرے "بڑے" آدمیوں کی طرح اپنی عظمت اور اہمیت کا سکّہ مجھ پر بٹھانا چاہیں . . . . شاید وہ . . . . لیکن میں اس وقت تک اپنے راس مسعود سے واقف نہ تھا۔ جن کے ناوک اخلاق و گفتار نے کسی صید کی جاں بخشی نہ کی تھی جیسے شاعر نے انہیں کے لئے کہا تھا

نہ ماند کس کہ بہ تیغ نگاہ ناز کشتی
مگر کہ زندہ کنی ہر یکے و باز کشتی!

چند ہی منٹ میں اُن کے خلوص اور محبّت کے برتاؤ اور گفتگو کے انداز نے میری جھجک اور احساس کمتری کو دور کر دیا اور مجھے یہ معلوم ہونے لگا کہ ایک پرانے اور شفیق دوست سے باتیں کر رہا ہوں نام سنتے ہی بولے "ارے میاں، مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہے تمہارے والد اور تمہارے خاندان سے خوب واقف ہوں۔ جس شخص کی رگوں میں حالی کا خون ہو میں اُسے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنے بچپن میں اپنے والد کو یہ کہتے سنا ہے کہ "اگر کسی انسان کی پرستش گناہ نہ ہوتی تو میں حالی کو پوجتا"۔ اور پھر مولانا حالی اور اُن کے فرزند

خواجہ سجاد حسین صاحب اور میرے والد مرحوم کا ذکر اور ان کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔ اس سلسلے میں حالی کی شاعری، اردو اور انگریزی ادب، آرٹ، علی گڑھ یونیورسٹی، قدیم مخطوطات، جدید مطبوعات اور نہ معلوم کن کن چیزوں کا ذکر آتا گیا۔ گفتگو کیا تھی ایک شفاف دریا موجیں مار رہا تھا یا ایک روشن شمع تھی کہ جس طرف مڑتی جاتی روشنی مسکرانے لگتی اور میری یہ کیفیت کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

واقعہ یہ ہے کہ ان کا سا خوش بیان آدمی میں نے ہندوستان کیا کسی ملک میں بھی نہیں دیکھا چسٹرٹن کا قول ہے کہ آرٹ مبالغہ کا نام ہے۔ چھوٹی سی بات کو زیب داستان کے لئے بڑھا کر استعمال کرنا اس مسعود کا حصّہ تھا۔ اُن کی ذات ہر محفل میں رونق محفل ہوتی تھی جس صحبت میں پہنچ جاتے نسیم بہار کی طرح دلوں کو شگفتہ کر دیتے۔ ان کے سامنے کسی دوسرے شخص کی ہوا نہ بندھتی تھی۔ ان کے پاس قصّے کہانیوں، حکایتوں اور لطیفوں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا جن کو وہ نہایت سلیقے کے ساتھ برمحل استعمال کرتے تھے۔ تقریر کی روانی کا یہ حال تھا کہ گویا ایک صاف شفاف دریا بہتا چلا جاتا ہے سننے والے مقطع بزرگ ہوں، یا بدمغ حکام، یا سر پھرے نوجوان اُن کا جادو سبھی پر چل جاتا تھا۔ تخیل کی جولانی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص مبارزانہ انداز میں کوئی عجیب وغریب قصہ سناتا یا شیخی بگھارتا تو وہ فوراً ہی ایک عجیب تر داستان تصنیف کر کے سنا دیتے۔ اُن کی ظرافت بے امان تھی لیکن اس میں دل آزاری یا تحقیر کا شائبہ نہ ہوتا تھا۔ خشک مزاج اور خرد ماغ لوگ خاص طور پر اس کا نشانہ بنتے تھے۔ یہ ظرافت بڑی دل چسپ صورتیں اختیار کرتی تھی۔ ایک دفعہ اہل ذوق کے ایک مختصر مجمع میں شعر خوانی کر رہے تھے کہ بدقسمتی سے ایک بزرگ وہاں وارد ہوئے جن کو شعر سے بالکل مس نہ تھا لیکن خود اس محرومی سے ناواقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے زیادہ بلند آہنگی سے ہر شعر کی داد دینی شروع کی۔ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا——
"خاں صاحب آپ کو معلوم ہے کہ مجھے غالب کا کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے۔ سنیئے:۔

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ — ہلتے ہیں میرے قبر کے اندر کفن میں پاؤں

اس غریب نے بے اختیار داد دینی شروع ہی کی تھی کہ انہوں نے آلیا اور شعر کے مضحک پہلو کی اس خوبصورتی سے اداکاری کی کہ حاضرین ہنسی سے بے قرار اور وہ بے چارے حیران ہو کر رہ گئے! اسی طرح ایک دفعہ ایک شامت کا مارا امریکن مخصوص خودپسندی کے انداز میں اپنے ملک کی عظمت و شان کی داستانیں بگھار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ "دنیا بھر میں سب سے لمبی سرنگ امریکہ میں ہے جس کا طول بیس میل سے بھی زیادہ ہے"۔ مسعود صاحب کو شرارت سوجھی، کہنے لگے "اس سے تو کہیں زیادہ لمبی سرنگ ہمارے ہندوستان میں ہے"۔ اس نے گھبرا کر پوچھا "کہاں" کہنے لگے "وہی سرنگ جو مغل بادشاہوں نے دہلی اور آگرہ کے بیچ میں بنائی تھی تاکہ جنگ کے زمانے میں پوشیدہ طور پر سفر کر سکیں۔ یہ سرنگ کوئی سوا سو میل لمبی ہے"۔ اس نے امریکہ کی قومی عزت اور برتری کو قائم رکھنے کی ایک آخری کوشش کی "ہمارے ہاں تو سرنگ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ آپ کے ان مغل بادشاہوں نے روشنی کا کیا انتظام کیا ہوگا"۔ اس مسعود کے دماغ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کا بنا بنایا برجستہ جواب کوندگیا بولے "اسی میں تو انہوں نے اپنا کمال دکھایا تھا۔ اس زمانہ میں بجلی تو ہوتی ہی نہ تھی اس لئے جب سرنگ بن کر تیار ہو گئی تو بادشاہ نے حکم دے دیا کہ برسات کے موسم میں تمام فوج کو جنگلوں میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ وہاں سے کروڑوں جگنو پکڑ کر سرنگ میں چھوڑ دیں۔ چنانچہ ان جگنوؤں کی چمک نے سرنگ کو بقعہ نور بنا دیا۔ اور آج تک ان کی اولاد اس سرنگ میں بستی ہے اور اس کو روشن رکھتی ہے!" بے چارہ سادہ لوح امریکن اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اور اس کو یہ شبہ نہیں گزرا کہ اس قدر سوکھا سنجیدہ منہ بنانے یہ اس پر اپنی بے اماں ظرافت آزما رہے ہیں۔ ان کے اکثر دوستوں نے ان کی عملی ستم ظریفی کی بہت سی دلچسپ مثالیں دیکھی ہیں جن کو سنانے کا موقع نہیں۔ صرف ایک قصہ سن لیجئے۔ ایک دفعہ ان کے مکان میں اردو کے ایک مشہور ادیب (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) ٹھیرے ہوئے تھے۔ ان کو نہ صرف بواسیر کی شکایت تھی بلکہ وہ ہر کس و ناکس سے موقع اور بے موقع اس موضوع پر اس قدر تفصیل سے گفتگو کرتے کہ لاچار ہو کر مخاطب کا ذہن یا قتل کی طرف مائل ہوتا یا خودکشی کی طرف! اس زمانے میں

ان کے ہاں ایک بہت باتونی فرانسیسی پروفیسر بھی مقیم تھے جو نہ صرف ہر فن ماہر تھے بلکہ کسی کے سامنے چپ نہ ہوتے تھے۔ مسعود صاحب نے اپنے ادیب دوست سے علیحدگی میں یہ کہا کہ بے چارہ فرانسیسی مدت سے بواسیر میں مبتلا ہے اور اس بارے میں آپ کے تجربات اور مجربات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور پروفیسر سے کہا کہ میرے ان دوست کو آپ سے کچھ ضروری علمی اور ادبی مشورہ کرنا ہے آپ کل انہیں اپنے ساتھ ہوا خوری کو لے جائیے۔ چنانچہ اس نے خلوص نیت سے انہیں سیر کو چلنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد آئندہ دو گھنٹے بچارے فرانسیسی پر (جس نے شاید کبھی پہلے بواسیر کا نام بھی نہ سنا تھا) جو گذری اس کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں لیکن اس کا اندازہ آپ خوب کر سکتے ہیں۔ البتہ دونوں کے دیکھنے والے یہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ ادیب کی شکل دیکھ کر پروفیسر کو پسینہ آجاتا تھا۔

اُن سے میری دوسری ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی جب وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے۔ استادوں اور طالب علموں کا ایک جم غفیر ان کے خیر مقدم کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا میں بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ لیکن اس وقت ان سے ملنے کا ارادہ نہ تھا۔ کیونکہ سوچتا تھا کہ سات سال پہلے کی ایک ملاقات کے بعد وہ اس ہجوم میں کیا پہچانیں گے۔ لیکن انھوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور خود بڑھ کر بڑے تپاک اور محبت سے ملے . . . . واقعہ یہ ہے کہ اُن کا حافظہ بلا کا تھا جو چہرہ ایک دفعہ دیکھ لیتے، جو نام ایک دفعہ سن لیتے وہ ان کی یاد میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جاتا۔ میں نے کئی مرتبہ اپنی آنکھ سے اُن کے حافظہ کا کمال دیکھا کہ ایسے لوگوں کو جن سے وہ صرف ایک مرتبہ پچیس تیس سال پہلے ملے تھے ان کو نہ صرف پہچان لیتے تھے بلکہ بعض دفعہ اس ملاقات کا وقت اور موقع اور ان کے لباس کی تفصیل تک بیان کر دیتے تھے! اس غیر معمولی حافظہ کی بدولت انہیں بیشتر طلبہ کے نام اور چہرے یاد رہتے تھے وہ ہر طالب العلم سے خلوص اور خصوصیت کے ساتھ ملتے تھے اور طلبہ بھی پروانوں کی طرح ان کے گرد رہتے، اور ہمارے محبوب وائس چانسلر کے نام سے ان کا ذکر کرتے۔ علی گڑھ میں کوئی وائس چانسلر طلبہ میں اتنا ہر دلعزیز نہیں ہوا۔ اس کی وجہ محض ان کی خوش کلامی نہ تھی بلکہ یہ ان کے خلوص اور محبّت اور اخلاق کا کرشمہ تھا۔ وہ باوجود اعلیٰ مغربی تعلیم پا کے اپنے میل جول میں قدیم شرافت اور وضع داری کے اصولوں

کے قائل اور ان کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ ان کے دربار میں چھوٹے بڑے امیر غریب سب کے ساتھ ایک برتاؤ ہوتا۔ وہ اپنے پرانے نوکروں سے بھی اس خلوص اور بے تکلفی سے ملتے تھے جس طرح اپنے عزیز اور معزز دوستوں سے بلکہ ان کے ہاں بقول حالی کے

خاکساروں سے خاکساری تھی　　　سربلندوں سے انکسار نہ تھا

ایک دفعہ حکومت ہند کے کمانڈر انچیف یونیورسٹی دیکھنے آئے۔ مسعود صاحب انہیں یونیورسٹی کے مختلف شعبے اور عمارتیں دکھا رہے تھے۔ جس وقت یونیورسٹی لائبریری سے باہر نکلے سامنے سے فارسی کے ایک معلم آرہے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مع معزز مہمان اور دوسرے عمائدین کے سامنے سے آرہے ہیں تو وہ پلٹ کر جانے لگے۔ مسعود صاحب کی نظر اُن پر پڑی اور فوراً خیال ہوا کہ شاید مولوی صاحب اس وجہ سے لوٹ گئے ہیں کہ یونیورسٹی کا ایک معمولی، کم تنخواہ پانے والا معلم کمانڈر انچیف سے ملنے کے قابل نہیں! فوراً ان کو پکار کر واپس بلایا اور بہت اہتمام کے ساتھ مہمان سے ملایا کہ اردو فارسی کے بہت اچھے عالم ہیں اور یونیورسٹی کے لئے عزت کا باعث ہیں۔ بات بظاہر چھوٹی سی ہے لیکن اگر صحیح قدروں کی ترازو میں تولی جائے تو بہت بڑی ہے۔ کس قدر اہمیت ہے ایک علمی درسگاہ میں اس انداز نظر کی جو علم کو دولت اور منصب سے بلند سمجھے!

سر راس مسعود کو ہر قسم کی تنگ دلی، تعصب اور غرور سے نفرت تھی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، ہندوستانی، انگریز، فرانسیسی، جاپانی ہر نسل اور مذہب اور حیثیت کے لوگ ان کے دوستوں میں شامل تھے اور ان کا دل اتنا بڑا تھا کہ اس میں دوستوں، عزیزوں، نوکروں، ملاقاتیوں بلکہ مخالفوں کے دکھ درد کے لئے بھی جگہ تھی۔ علی گڑھ میں کئی سال تک میرا ان کا ساتھ رہا اور میں نے انہیں جلوت اور خلوت دونوں میں دیکھا اور ہمیشہ یہ پایا کہ اس شریف اور دل والے انسان نے کبھی روپے، پیسے، وقت، سفارش، ہمدردی کے معاملہ میں بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا دل ضرورت سے زیادہ نازک اور حساس واقع ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مخالفوں کی

مخالفت کا گھاؤ ان پر بہت گہرا لگتا تھا۔ اور ان کی طبیعت جمہوری ارادوں میں جہاں ہر قسم کی مخالفت جھیلنی ہوتی ہے کام کرنے کے لئے زیادہ موزوں نہ تھی۔ جب انہوں نے بعض حالات سے مجبور ہو کر علی گڑھ چھوڑا تو ملک کے تقریباً سب ہی مشاہیر نے ان کو اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ راضی نہیں ہوئے۔ میں نے بھی ایک روز ہمت کر کے پوچھا کہ آخر آپ اپنی عادت کے خلاف اس معاملہ میں اس قدر ضد اور اصرار کیوں کرتے ہیں تو انہوں نے حسرت کے لہجے میں جواب دیا۔ اور مجھے ان کا لہجہ اور الفاظ اب تک یاد ہیں "سیدین تم نہیں جانتے۔ میرا دل شیشے کی طرح ہے۔ جب ٹوٹ گیا تو ٹوٹ گیا اب اس کو کاغذ اور گوند لگا کر نہیں چپکایا جا سکتا"!

بھوپال جانے کے بعد وہ جب کبھی علی گڑھ آتے ان کی شگفتہ اور دلچسپ صحبت کی نعمت میسر ہوتی اور چند روز کے لئے ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک تھکا ہوا مسافر کچھ دن کے لئے نخلستان میں پہنچ گیا ہو۔ بھوپال میں بھی چند روز ان کے ساتھ ٹھیرنے کا شرف نصیب ہوا۔ میں عمر بھر اس میزبان عزیز کی مہمان نوازی کے لطف اور خلوص و محبت کے سلوک کو نہ بھولوں گا اس زمانے میں ان کا اور لیڈی مسعود کا قیام ریاض منزل میں تھا یہ وہ مکان ہے جس کے دل کش پر فضا منظر اور ماحول نے اقبال کے تغزل کو باوجود ان کی علالت کے از سر نو بیدار کر دیا تھا۔ جہاں انہوں نے یہ اشعار لکھے تھے۔

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی	یہ بحر، یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماری شب میں	طلوعِ مہر و سکوت سپہر مینائی!

سر راس مسعود اور لیڈی مسعود کی شفقت بھری میزبانی اب ایک حسین خواب معلوم ہوتی ہے۔ وہ مہمان کی پذیرائی میں حد درجہ اہتمام کرتے تھے۔ یہ زمانہ بعض لحاظ سے ان کی مجلسی اور خانگی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ ذاتی افکار سے بہت حد تک نجات پا کر ان کا دماغ بھوپال اور اہل بھوپال کی بہتری کی تدبیریں سوچنے میں مصروف رہتا تھا۔ اپنی علمی اور ادبی دلچسپیوں کی طرف بھی وہ زیادہ توجہ کر سکتے تھے۔ ایک روز صبح کے وقت کوئی کتاب لینے کے لئے میں نے

ان کے کتب خانے کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ آٹھ دس پنڈت بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ان کے گرد بیٹھے ہیں۔ میں نے دریافت کیا۔ سید صاحب یہ کیا ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کی نگرانی میں سنسکرت کی بعض مستند کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جا رہا ہے۔ آٹھویں دن یہ سب وِدوان اپنے اپنے ترجمے کر کے لاتے ہیں اور مسعود صاحب ان سب کو پڑھوا کر سنتے اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی علمی اور ادبی دلچسپیاں غیر معمولی طور پر وسیع تھیں۔ حافظ، میر، انیس، حالی، اقبال کا بہت سا کلام انہیں حفظ تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی کے ہزاروں اچھے اچھے شعر ان کی زبان پر تھے انیس کے بعض مرثیوں کا ترجمہ انہوں نے انگریزی نظم میں اس قابلیت سے کیا تھا کہ اہل زبان اس کی داد دیتے تھے، ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک خاص شگفتگی اور جدت تھی۔ موسیقی اور مصوری دونوں میں بہت عمدہ مذاق رکھتے تھے اور مشرق اور مغرب کی آرٹ کی تحریکوں سے باخبر تھے۔

ان آخری بے تکلفی کی ملاقاتوں میں اُن سے گھنٹوں باتیں ہوئیں۔ ان کے دل میں کیا کیا منصوبے تھے۔ کتنے بڑے بڑے علمی ادبی کام کرنے کی امنگ تھی۔ خیالات میں کتنی بلندی اور وسعت تھی۔ دل میں ملک اور قوم کا کتنا درد تھا۔ لوگوں سے کام لینے کی کتنی اچھی صلاحیت تھی۔ ان سے گفتگو کر کے دل شیر ہو جاتا تھا۔ جس قوم میں ایسے انسان موجود ہیں اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ . . . ان پر کبھی کبھی اپنے ملک اور قوم کے حالات کو سوچ کر یاس کی کیفیت طاری ہوتی تھی لیکن وہ ایک عارضی کیفیت تھی جو آرٹسٹ مزاج لوگوں پر گاہے گاہے ہوتی ہے۔ اسی موضوع پر گفتگو کے دوران میں انہوں نے ایک دفعہ مجھے اپنی کتاب "جاپان کا تعلیمی نظم و نسق" میں سے مندرجہ ذیل عبارت سنائی تھی جس سے اس گہری محبت کا اندازہ ہوتا ہے جو انہیں اپنے وطن سے تھی۔

"ایک مرتبہ جاپان کے ایک جنگل میں کہ عہد گزشتہ کی یادگاروں سے بھرا ہوا تھا میرے کانوں میں بزرگان قدیم کی صدائیں سرسرانے لگیں۔ یہ صدائیں مجھ سے کہتی تھیں۔ اے وہ کہ ہماری سرزمین میں ایک نو وارد ہے اپنے مضطرب دل کو صبر و سکون دے۔ وہ اذیتیں جو آج تیرے حق

ہیں سوہان روح ہیں بہت دن ہیں بھی تڑپا چکی ہیں فراموش نہ کر کہ صبر مشرق کا ایک بزرگ ورثہ ہے اور صبر اور پرخلوص عمل ہی میں وہ طاقت پنہاں ہے جس کے ذریعے تیرے ہم قوم وہ چیز پیدا کریں گے جس کے پیدا کرنے کے وہ متمنی ہیں۔ یہ نسخہ اکسیر ہمیں تیرے ہم وطن بودھ نے سکھایا تھا۔ وہی ہم تجھے یاد دلاتے ہیں کیونکہ تیری قوم نے بظاہر اسے بھلا دیا ہے"۔ صدائیں رک گئیں میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں مغرب کی طرف تکنے لگا جہاں میرا وطن واقع تھا اور جدھر آفتاب کندنی غبار میں آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا"۔

لیکن ان کی مخصوص صفت جس میں ان کی ہردل عزیزی کا راز پنہاں ہے ان کے دل اور نظر کی وسعت تھی۔ ذہنی حیثیت سے وہ تہذیب اور تمدن کے ہر شعبے اور مسئلے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کا حساس دل بحر زندگی کی ہر لہر سے متاثر ہوتا تھا۔ جذبات کے لحاظ سے ان کی کشادہ دلی کی کوئی حد نہ تھی۔ حیات انسانی کی مختلف کیفیتیں، رنج و نشاط، خوش دلی اور ظرافت، محبت اور دوستی اُن کے لئے انتہائی کشش رکھتی تھیں۔ اُن کی ذات شرافت کا سچا نمونہ تھی۔ اُن کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے اور اس سے بڑھ کر انسان کی اور کوئی تعریف نہیں ہوسکتی کہ (جیسا میں کہہ چکا ہوں) اُن کے دل میں دوسروں کے رنج و راحت کے لئے جگہ تھی۔ وہ اُن کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے۔

راس مسعود کو مقابلتہً کم عمری میں کھو کر ہندوستان نے ایک بڑی دولت کھو دی۔ اس دل و دماغ کے لوگ کسی ملک میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی دل کش، شاندار اور شریف شخصیت ان کے دوستوں اور قدردانوں کے دل میں ایک عزیز ترین سرمائے کے طور پر محفوظ رہے گی۔

○

سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

دانائے راز

ڈاکٹر اقبال

اقبال سے آشنائی تو ان کے کلام کے ذریعہ اس وقت تھی جب اس کو پوری طرح سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا شعور تک نہ تھا لیکن جب تھوڑا بہت ادبی ذوق اور ان کے کلام کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو بہت جلد یہ شناسائی عقیدت میں تبدیل ہو گئی۔ پھر کئی مرتبہ جب کبھی لاہور جانا ہوا، ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت ملی، کچھ خط و کتابت بھی رہی، ایک مرتبہ علی گڑھ میں ان کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا جب وہ یونیورسٹی کی دعوت پر "اسلامی فکر کی تعمیرِ نو" پر اپنے خطبات دینے وہاں تشریف لائے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ بھوپال میں سر راس مسعود کے ہاں مقیم تھے ان کے ساتھ چند روز گذارنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کتنی مختصر تھیں یہ ملاقاتیں جن سے ایک طرف حافظہ اب تک روشن اور لطف اندوز ہے اور دوسری طرف اس محرومی کی خلش کھٹکتی ہے کہ سمندر کی ہم عصری نصیب ہوئی اور چن پائے چند خزف ریزے! لیکن پھر سوچتا ہوں کہ شخصیت، علم و فضل، عظمت و کمال کے سرچشموں سے نیازمندی ایسی چیز نہیں جن کو وقت کے گز سے ناپا جائے۔ اس لئے ذاتی صحبت اور ملاقات میں کسب فیض کے جو موقعے ملے اس کے لئے شکر کرنا چاہیئے پھر ان کے فکر و کلام کی دولت، جو زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے، گزشتہ چالیس سال سے میرے مطالعہ میں رہی ہے اور جوں جوں اس پر غور کیا اس کی معنویت اور اس کے حیات بخش پیغام کا نقش میرے دل پر زیادہ گہرا ہوتا گیا ہے۔

شعر اور فلسفہ کا میل کوئی آسان چیز نہیں۔ بعض شاعروں کا فلسفیانہ رجحان ہوتا ہے لیکن ان کی شاعری ان کے فلسفے کی سیل کو نہیں تھام سکتی، فلسفہ سے مرعوب ہو کر رہ جاتی ہے! بعض شاعر محض زبان کی تراش وخراش اور لطف پر بس کرتے ہیں۔ اُن کا کلام یا تو معنی کے لحاظ سے کھوکھلا ہوتا ہے یا ان کے شعروں میں صرف ہنگامی جذبات اور تاثرات کی عکاسی ہوتی ہے اور بس۔ اقبال کا کلام معنی اور بیان دونوں کے اعتبار سے ایک حسین اور فکر انگیز شاہکار ہے جس میں لطف بیان اور معنی آفرینی کا ایک نادر امتزاج پایا جاتا ہے۔ اگر شاعری محض "معنی منظوم" ہو تو اس میں کشش نہیں ہوتی۔ اگر صرف لفظوں کا کھیل ہو تو دماغ کو اسیر نہیں کر سکتی۔ اقبال کے کلام کو پڑھتے ساری عمر بیت گئی۔ لیکن اس کی شگفتگی، اس کی نشاط انگیزی، اس کی معنی آفرینی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اس کے نئے نئے پہلو ذہن کے سامنے آتے رہتے ہیں اور اس کی روشنی زندگی کے نئے گوشوں کو منور کرتی ہے۔ ان کا دماغ ایک متحرک فوارہ نور تھا۔ جس طرف مڑ جاتا جوت جگا دیتا۔ اُن کے خیالات میں جدت اور روشنی تھی اور اظہار خیال میں ایک خاص شگفتگی۔ وہ جس مسئلے کو بیان کرتے، جس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے اس میں اُن کا معنی آفریں دماغ انوکھے نکتے پیدا کرتا۔ ان کی لطیف ظرافت خشک سے خشک عالمانہ بحثوں میں بھی دل چسپی کی ایک لہر دوڑا دیتی۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے لیکن برخلاف عام شعرائے کرام کے، جو خود کو براہ راست خدا کا شاگرد سمجھتے ہیں اور مطالعہ اور غور و فکر کو اپنی شان کے خلاف جانتے ہیں، انہوں نے ساری عمر سنجیدہ مطالعہ کا شغل جاری رکھا اور اس مطالعہ اور فکر خلاق کی بدولت ان کا علم اور عرفان زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا گیا اور ان کی شاعری محض سرمایہ تفریح ہونے کی بجائے ہدایت اور معرفت کا سرچشمہ بن گئی۔ ان کے کلام اور فلسفے میں ان کی زندگی کی طرح ایک عالم گیر وسعت اور رواداری تھی۔ اس میں جبرئیل اور ابلیس، رومی اور نیتشے، غالب اور گوئٹے، رام اور بھرتری ہری، فاطمہ زہرا اور قرۃ العین سب کے لئے گنجائش تھی کیونکہ یہ تمام شخصیتیں حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے کشمیر کے

خطبات میں بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے کہ اقبال میں یہ فکری رواداری کس قدر کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور انہوں نے کس عقیدت اور محبت کے ساتھ مثلاً ہندو فلسفیوں، مفکروں اور مذہبی رہنماؤں کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے فکر کا مرکز یقیناً اسلام کی تعلیم تھی اور اس کی مبصرانہ تفسیر۔ لیکن انہوں نے کبھی عام مولویوں اور تنگ نظر عالمانِ دین کی طرح دوسرے مذہبوں کی تعلیم یا جدید علوم اور تجربوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ہر طرف سے روشنی لی اور اس سے اپنے مرکزی مقصد کو منور کیا۔

اقبال کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کوئی نئی بات کہنا آسان نہیں۔ لیکن ہر شخص کا اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے جس سے وہ افراد اور واقعات اور فکری تحریکوں کو جانچتا اور پرکھتا ہے اور شاید اس طرح غیر شعوری طور پر خود کو بے نقاب کرتا ہے۔ اقبال کی سیرت اور فکر کے بہت سے پہلو ہیں جن میں سے صرف دو کے ذکر پر بس کروں گا۔ ایک تو اقبال کی بارگاہ کی شان جس میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے ان کے کلام کی انسان دوستی اور عالم گیریت جو میرے نزدیک ان کی فکر کی سب سے بڑی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

(۲)

اقبال کا ایک شعر ہے:

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اقبال کی صحبت میں ایسی ہی ایک بارگاہ کی شان نظر آتی تھی۔ ان کا دربار امیروں اور رئیسوں کے دربار سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نہ پاسبان کی اجازت تھی، نہ اجازت طلبی کی ضرورت، نہ چھوٹے بڑے، گمنام نامور، دیسی بدیسی، جاہل عالم، غریب امیر، ہندو مسلمان، سکھ عیسائی کی کوئی تمیز۔ ان کے گھر کی طرح ان کے دل کے دروازے بھی تمام انسانوں کے لئے کھلے ہوتے تھے مگر اس میں مختلف لوگوں کے لئے الگ الگ خانے نہ تھے۔ ہر طرح کے

لوگ ان کے پاس آتے اور اس چشمۂ فیض سے اپنے ظرف کے مطابق سیراب ہو کر جاتے۔ بعض علمی، سیاسی، فلسفی، مذہبی مسئلوں پر گفتگو کرنے آتے۔ بعض مقامی معاملات کے بارے میں مشورہ کرنے۔ بعض ان کی گفتگو سے لطف اٹھانے اور ان کے شوخ لطیفوں اور قصّوں کو سننے، بعض محض گپ کرنے اور حقہ پینے اور بعض شوق زیارت میں۔ کئی مرتبہ یہ تماشا دیکھا کہ وہ اپنے برآمدے میں ایک نیم شکستہ مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور ہر طرح کے لوگ، طالب علم، پروفیسر، مغرب کے اربابِ علم وادب، سوسائٹی کی مشاہیر نواز خواتین، گاؤں کے جاہل لیکن عقیدت مند ملاقاتی، اُن کے پاس آتے اور وہ سب سے ان کی عقل اور دلچسپی کے مطابق تپاک کے ساتھ باتیں کرتے اور ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے۔ نہ کسی کی جہالت اور آدابِ مجلس سے ناواقفیت پر جبیں بہ جبیں ہوتے نہ کسی کی قابلیت اور وجاہت سے مرعوب۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ کسی مشہور غیر ملکی مفکر سے فلسفہ یا ادب کی گہری حقیقتوں پر گفتگو کر رہے ہیں اور بیچ بیچ میں اُن کے نیم جاہل ملاقاتی، جن کو اس گفتگو کی سمجھ ہوتی، نہ اس میں دلچسپی، حقے کی نے کو ان کی طرف موڑتے اور سلسلۂ کلام کو بے تکلفی سے توڑ کر کہتے۔ 'ڈاکٹر صاحب تم حقہ پیونا' اور ڈاکٹر صاحب فلسفے کو ملتوی کر کے ان سے ایک دو باتیں کرتے یا ایک آدھ فقرہ چست کرتے اور پھر اپنی سنجیدہ علمی گفتگو میں مشغول ہو جاتے! اس وقت اُن کا دماغ کبھی علم وادب کے خزانے لٹاتا۔ کبھی تاریخ اور فلسفے کے رازوں کو بے نقاب کرتا۔ کبھی ایک تیز نشتر کی طرح زندگی پر تنقید کرتا اور سماجی ناسوروں سے فاسد مادے کو خارج کرتا۔ کبھی اہل سیاست کے بلند آہنگ دعووں اور ریاکاریوں کا پول کھولتا۔ لیکن اس تنقید میں نہ مردم بیزاری تھی نہ مردم آزاری۔ ہاں شوخی اور ظرافت ہوتی، برتر فکر اور بہتر زندگی کی ترجمانی ہوتی اور گدازِ قلب کی دھڑکن۔ اور یہی جذبہ ان کی شاعری میں جاری وساری ہے۔ جب کوئی صاحبِ ذوق یا باعلم شخص ان کی صحبت سے اٹھتا اسے محسوس ہوتا کہ اس کے ذہن اور زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔

ان کی طبیعت میں فقر اور بے نیازی کا ایک خاص انداز تھا جو صرف انہیں لوگوں کے

حصے میں آتا ہے جو دراصل بڑے ہوتے ہیں۔ انہیں کبھی یہ فکر نہ ہوئی کہ دوسروں پر اپنی عظمت کا نقش قائم کریں۔ اور فکر کیوں ہوتی؟ ہمالہ پہاڑ کبھی خود اپنی بلندی کا اعلان نہیں کرتا! ان کو نہ سربلندوں سے انکسار تھا۔ نہ خاکساروں سے سربلندی۔ ہر شخص انسان ہونے کی حیثیت سے انسانی سلوک کا مستحق تھا۔ بلکہ میں نے کبھی کبھی یہ دیکھا کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ گرم جوشی اور آمادگی سے ملتے اور جن لوگوں کو دولت اور منصب کی وجہ سے دنیا بڑا سمجھتی ہے ان سے ملنے میں تامل کرتے۔ انتقال سے کوئی دو سال پہلے جب وہ بھوپال میں مقیم تھے سر راس مسعود کے مقامی دوست اور بیرونی عمائدین برابر ان کے ہاں آتے رہتے تھے اور جب آتے قدرتاً اقبال سے ملنے کی خواہش کرتے اقبال اکثر یہ کہتے "کیوں بھئی مسعود کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کو کسی طرح ٹال دو!" برخلاف اس کے جب وہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو اکثر وہاں سے معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور باتیں کرتے۔ یہ وہی اقبال تھے جنھوں نے کہا ہے:

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام　　　دیدہ ام صدق و صفا اندر عوام

دراصل اقبال کو جو زبردست شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی وہ ان کی غیر معمولی قابلیت اور شاعرانہ کمال کا اعتراف ہے جو خلافِ معمول انہیں اپنی زندگی ہی میں حاصل ہوا۔ ورنہ دنیا میں نام حاصل کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے اُن سے وہ بیگانہ تھے۔ دنیاوی ترقی مصلحت پسندی چاہتی ہے اور ان کا اصول تھا

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　　نہ ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

دنیاوی ترقی کا مطالبہ یہ ہے کہ جو صاحبانِ قوت اور اختیار ہیں ان کی ہم نوائی کرو، اور ان کے خوانِ کرم سے جو ریزے گریں ان کو شکریئے کے ساتھ قبول کرو لیکن یہاں حق گوئی اور بے باکی کی بدولت اپنوں اور بیگانوں سب کو ناراض کرنے کا حوصلہ تھا اور زہر ہلاہل کو قند کہنے سے انکار۔ انہوں نے کبھی مصلحت اندیشی کے خیال سے اپنی سچی اور بے امان تنقید کی تلوار کو

میاں نہیں کیا اور کس کس پر تنقید نہیں کی؛ حکومت برطانیہ، حکومت ہند اور حکومت پنجاب پر، ہندؤں اور مسلمانوں پر، غلامی کی ذہنیت اور آزادی کی بے راہ روی پر، مشرقی تصوف اور مغربی تہذیب پر، سرمایہ داری اور سوشلزم پر، جمہوریت اور فاشزم پر، شاعری پر جو افیون کی طرح خواب آور ہو، عقل پر جس کی مہار عشق کے ہاتھ نہ ہو، یعنی ان تمام بتوں پر جو افراد اور جماعتوں نے اپنے دل و دماغ میں بٹھا رکھے ہیں اور جن کی پوجا میں وہ اکثر بنیادی صداقتوں کو بھول جاتے ہیں

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں　　　مجھے ہے حکمِ اذاں، لاالہ الا اللہ!

اگر وہ زبان نثر میں یہ سب باتیں کہتے تو حکومت کو ان کی زبان بندی لازم ہو جاتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ حکومتوں میں ادبی ذوق اور شعر سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی!

مگر بت شکنی کتنی ہی ضروری ہو وہ بت شکن کو ہر دل عزیز نہیں بناتی۔ یہ اقبال کی شاعری کا اعجاز ہے کہ باوجود عمر بھر اس ناگوار فرض کو انجام دینے کے انہوں نے، ان کے فکر نے، اُن کے کلام نے، ہماری نسل کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور وہ ہماری ذہنی، جذباتی اور روحانی میراث کا ایک جزو عزیز بن گئی ہے۔

آخری عمر میں ان کا فقر اور بے نیازی کا انداز اور بڑھ گیا تھا جس نے ان کو دنیا کی اوچھی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بے نیاز کر دیا تھا اور خود شناسی اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچا دیا تھا جب وہ خلوص کے ساتھ کہہ سکتے تھے

میرا نشیمن نہیں درگہہ میر و وزیر　　　میرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو!

اس شانِ فقر کے ایک دو دلچسپ واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ سر راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبال کو آخری عمر میں اطمینان کے ساتھ ادبی اور علمی کام کرنے کا موقع ملے اور کسی طرح فکرِ معاش سے آزادی حاصل ہو جائے۔ ان کے توجہ دلانے سے نواب صاحب بھوپال اور ایک دوسرے دولت مند رئیس نے یہ سعادت حاصل کرنی چاہی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ اقبال بمشکل بھوپال کی کم تر رقم کو اس سے دو چند رقم کے مقابلے میں قبول کرنے پر راضی ہوئے اور وجہ

یہ بیان کی کہ اول تو اتنی رقم میری ضروریات کے لئے کافی ہے میں زیادہ کیوں لوں۔ دوسرے جب تک میرے دل میں کسی شخص کی کوئی خاص وقعت نہ ہو اسکی امداد قبول نہیں کر سکتا! یہ تھا غیرتِ فقر کا تقاضا، ایک ایسے زمانے میں جب روپے کے بازار میں تقریباً ہر شخص کی قیمت لگائی جا سکتی ہے اور بڑے بڑے مشاہیر منصب وجاہ و دولت کی خاطر ہر قسم کا "ایثار" کرنے کو تیار ہیں! اسی قسم کا ایک اور واقعہ انہیں سر اکبر حیدری کے ساتھ پیش آیا۔ واقعہ جانا بوجھا لیکن قابل ذکر ہے انہوں نے یوم اقبال پر "توشہ خانہ حضور نظام" کی طرف سے ایک ہزار روپے کی خطیر رقم بطور "تواضع" کے پیش کی۔ جب وہ چیک اس تمہید کے ساتھ اس قلندر کے پاس پہنچا تو اس نے اسے ان اشعار کے ساتھ واپس کر دیا جو بعد میں ارمغانِ حجاز میں شائع ہوئے:۔

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش — کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات!

اقبال میں بہت سی غیر معمولی ذاتی خوبیاں تھیں لیکن میرے دل میں بڑی عقیدت ہے اس شان فقر کے لئے جس کی تفسیر انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کی تھی۔ لیکن اس کا خطاب دراصل عصر حاضر کے تمام نوجوانوں سے ہے:

ہمت ہے اگر تو ڈھونڈھ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شان بے نیازی
حاصل اس کا شکوہ محمود — فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
یہ فقر غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری!

اقبال نے اس فقیری کو اللہ سے مانگا تھا اور اس کی بدولت وہ ایمان کی دولت سے

مالا مال تھے!

(۳)

اقبال کی فکر روشن کے بہت سے پہلو ہیں اور ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن موجودہ زمانے کی روش کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سب سے اہم پہلو اس کی انسانیت اور انسان دوستی ہے اور اسی پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اقبال اس بارے میں نہ صرف اسلام کی تعلیم کی علم برداری کرتا ہے بلکہ انسانی ضمیر کا ترجمان بھی ہے۔

ہماری بدنصیب نسل جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئی یا اس میں جوان ہوئی تاریخ کے ایک ایسے نامبارک دور میں سے گزر رہی ہے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ سائنس اور انسان کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے ملکوں اور قوموں کو ایسے رشتوں میں جکڑ دیا ہے کہ ہمارا مرنا اور جینا ہمارا دکھ اور سکھ ہماری خوش حالی اور بدحالی سب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں، اور دوسری طرف دلوں اور دماغوں میں ایسی گتھیاں پڑ گئی ہیں کہ مشترک انسانیت کا احساس کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور ہماری بہترین ذہانت تباہی اور ہلاکت کے لئے استعمال ہو رہی ہے۔ شیطان نے اٹیم بم اور اس کی ذریات کے جو تحفے انسان کو دئیے ہیں ان کی بدولت اس کے ہاتھ میں ایک ایسی قوت آگئی ہے کہ اگر وہ نسلی خودکشی پر آمادہ ہو تو آسانی سے دنیا کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ میں تو سائنس داں نہیں ہوں۔ لیکن ایک ماہر سائنس داں کا بیان ہے کہ ایک ہائڈروجن بم نوے لاکھ انسانوں کو عذاب کی بے پناہ گھاٹی کے راستے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اور جس جگہ یہ بم گرایا جائے وہاں کا ٹمپریچر دس لاکھ ڈگری تک پہنچ سکتا ہے۔ اس حرارت کا تصور شاید آپ کو اس بات سے ہو سکے کہ سورج کے ٹمپریچر کا اندازہ چھ لاکھ ڈگری کیا گیا ہے اگویا اب روز قیامت اور سورج کو سوا نیزے پر لانے کے لئے مشیت الٰہی کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کام اختیار میں آگیا ہے۔ انسان کے اقبال نے اسی حالت کی پیش بینی کر کے تیس بتیس سال پہلے کہا تھا

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونی میں تیغ کارزاری ہے

اس نازک وقت میں جب انسانیت موت اور زندگی کے فیصلہ کن دوراہے پر کھڑی ہے ایسی قدروں کی یاد تازہ کرنا جو انسانی ایکتا اور امن، شرافت اور رواداری کا پیغام سناتی ہیں، صرف دلوں ہی میں ٹھنڈک پیدا نہیں کرتا صرف دماغوں کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کو نہیں بجھاتا بلکہ انسان کی نجات کے لئے لازم ہو گیا ہے!

اقبال اسی قسم کے ایک بلند پایہ اور روشن دماغ پیامبر تھے۔ ان کی ذات اور شاعری دونوں میں ان قدروں کی جوت نظر آتی ہے۔ دیر و حرم اور کفر و دین کے جھگڑوں نے ہمیشہ زندگی کو تلخ اور ذلیل کیا ہے اور اہل دل اور اہل نظر نے ان کے اختلاف پر احتجاج کیا ہے۔ اس احتجاج میں بہت سے شاعر بھی شامل ہیں۔ لیکن ان میں اور اقبال میں ایک خاص فرق ہے۔ اکثر شاعروں نے اس جذبے کو آرائش محفل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کا کوئی خاص مذہبی عقیدہ نہیں ہوتا۔ ان میں یقین کی تپش نہیں ہوتی۔ وہ نہ رسوم دیر سے واقف ہیں نہ آداب حرم سے، نہ کفر کی چاشنی سے نہ دینداری کے کیف سے۔ اس لئے وہ بغیر کسی خاص سنجیدگی فکر کے دونوں سے بے تعلقی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ لیکن اقبال شاعر بھی ہے اور فلسفی بھی۔ اس نے مذہب کے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور اسلام کے بنیادی اصولوں میں نظر پیدا کی۔ وہ کسی خیال یا جذبے کو محض گرمیٔ سخن یا کلام کی سجاوٹ کے لئے استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کے تصورِ حیات میں ہر ایک کا ایک خاص مقام ہے۔ اس لئے اس کا پیغام ایک فرد کی ذاتی رائے نہیں بلکہ ایک ملت کا ایک تہذیب کا پیغام بھی ہے۔ اس پیغام کو بارہا خود اس مذہب اور ملت کے افراد نے بھی بھلایا ہے اور وہ بتائے ہوئے راستے سے دور بھٹک گئے ہیں۔ لیکن جب تک وہ اس کو مانتے اور پہچانتے ہیں اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرتے ہیں اور اس آدرش کی طرف بڑھنے کی آرزو رکھتے ہیں، امید کا چراغ نہیں بجھ سکتا۔

میں اقبال کے پیغام کی اس امید آفرینی کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جو صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ سب انسانوں کے لئے قابل احترام ہے۔

اقبال کے "تصور انسانیت" کی نقاب کشائی کے لئے اس کے مندرجہ ذیل شعروں پر غور کیجئے جو مجھے بہت محبوب ہیں اور جن میں اس نے بڑی سادگی اور صفائی سے "آدمیت" کا مطلب سمجھایا ہے۔ اس کے نزدیک آدمیت کی صرف ایک کسوٹی ہے: آدمی کی عزت کرنا، ہر آدمی کی، بلا لحاظ نسل و ملت، کیونکہ اس میں نور الٰہی کا جلوہ ہے خواہ وہ کتنا ہی مدھم کیوں نہ ہو۔ جو عشق کا بندہ ہوتا ہے وہ خدا کے راستے پر چلتا ہے اور کفر و دین کا فرق بھلا کر کافر اور مومن کے لئے اپنے دل کے دروازے یکساں طور پر کھول دیتا ہے۔

دیں سراپا سوختن اندر طلب — انتہائش عشق و آغازش ادب

حرف بد را بر لب آوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلق خداست

آدمیت ، احترام آدمی — باخبر شو از مقام آدمی

بندہ عشق از خدا گیرد طریق — می شود بر کافر و مومن شفیق

کفر و دیں را گیر در پہنائے دل — دل اگر بگریزد از دل وائے دل!

کفر و دین کے ضمن میں ایک دلچسپ نکتہ قابل ذکر ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "مومن" سے مراد ہے مسلمان اور "کافر" سے غیر مسلم۔ اس غلط فہمی میں غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بہت سے مسلمان بھی شریک ہیں جن کی خوش فہمی ان کی مذہبی بصیرت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اقبال نے اس بارے میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ اس کے نزدیک کافر اور مسلمان کا اصلی فرق رسمی عقائد کا نہیں بلکہ دل و دماغ کی ساخت کا ہے، زندگی کے بنیادی تصور اور آدرش کا ہے، ان سہاروں کا ہے جن کے بل بوتے وہ زندگی کو بنانا اور سنوارنا چاہتے ہیں۔ اقبال کی دنیا میں مسلمان کافر ہو سکتا ہے اور کافر مسلمان! فرق لیبل کا نہیں بلکہ اس شراب کا ہے جو ان کے ساغر دل میں چھلکتی ہے۔

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری　　مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا　　مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جب کبھی میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو گاندھی جی کی زندگی نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے)

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

ایمان کی کسوٹی عشق ہے اور اس کی پہچان خدا سے لو لگانا اور اس کے بندوں کی محبت اور خدمت کا دم بھرنا۔ جس نے دل میں عشق کی شمع روشن کرنے کی بجائے، اس میں نفرت کے دھوئیں کو جگہ دی اور خدا کے سوا ماسوا سے امید باندھی وہ مومن نہیں کافر ہے، چاہے وہ خود کو کسی نام سے پکارے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

اور: بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی　　مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

یہاں کوئی بیچ کا راستہ نہیں ہے۔ انسان خدا کا بندہ بن سکتا ہے یا ابن الوقت۔ دونوں طرف پانسا پھینکنا، چھ دن شیطان کی بندگی اور ساتویں دن خدا کی رضاجوئی خود کو دھوکا دینا ہے۔

اقبال دل و دماغ کی گہرائیوں سے مسلمان ہے اور باوجود اس کے نہیں بلکہ اسی وجہ سے وہ بار بار انسانوں کی مشترک قدروں پر، ان کے اٹوٹ رشتوں پر ان کی فطری اخوت اور محبت پر زور دیتا ہے۔ اس کی نظر میں سچی انسانیت اور سچے اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ لوگ اپنے دلوں اور دماغوں کو تنگ نظری کی لعنت سے پاک کریں اور سب انسانوں کے لئے محبت کے جذبے کو بیدار کریں اور اسی کی روشنی میں زندگی کے کٹھن راستے کو پار کریں۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی　　اخوت کی جہانگیری، محبت کی جہاں بانی

بتان رنگ و بو کو چھوڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

اور ایک دوسری جگہ اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے:

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

اقبال کی شاعری اور فلسفے کا ایک مرکزی خیال یہ ہے کہ قوم، نسل، رنگ، ذات پات اور ملک کے تصور نے انسانوں کے درمیان مخالفت کی دیواریں کھڑی کر کے زندگی کے حسین نقشے کو بگاڑ دیا ہے۔ اس کا کلام ان تمام بتان بے فیض کے خلاف ایک مسلسل جہاد ہے۔ جیسے رنگ، نسل، کلیسا جن کو ابتدا میں تاریخ کی تحریکوں نے تراشا اور بعد میں قوت اور اختیار کے ناپاک پجاریوں نے اپنے ذلیل مقصدوں کے لئے استعمال کیا۔ اس نے اپنی مثنوی اسرار خودی کے دیباچے میں صاف صاف کہدیا تھا کہ "میری فارسی مثنویوں کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں۔ میں در اصل ایک بہتر انسانی سماج کی تلاش میں دل چسپی رکھتا ہوں۔ لیکن اس تلاش میں ایک ایسے سماجی نظام کو کیسے نظر انداز کروں جس کا خاص مقصد ہی یہ ہے کہ وہ نسل، ذات، پات اور رنگ کے فرق کو یک قلم مٹا دے۔"

اقبال نے بڑے دل کش پیرائے میں جا بجا اس دل و دماغ کے انسان کی تصویر کشی کی ہے جو ان مصنوعی اختلافات کو رد کر کے انسانی وحدت کی حقیقت کو دیکھ اور سمجھ سکتا ہے — ان شعروں میں بظاہر شاعر نے اپنے مزاج کی تصویر کھینچی ہے لیکن در اصل ان میں ہر شریف، روادار، فراخ دل، انسان دوست کے خدوخال نظر آتے ہیں۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد — میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

فقیہہِ شہر کی تحقیر، کیا مجال مری — مگر یہ بات کہ میں چاہتا ہوں دل کی کشاد

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو — یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے — کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

اقبال قلندری کو، جو تصوف کی مہر پرور نگاہ سے سارے عالم کو دیکھتی ہے، مدرسے اور خانقاہ کے اس روایتی فکر پر ترجیح دیتا ہے جو عقل یا مذہب کی سطحی پابندیوں میں اسیر ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ

باوجود فکر کی عظمت کا قائل ہونے کے، باوجود سائنس کی اہمیت تسلیم کرنے کے، دل کی دولت کو ہر قسم کی دولت سے برتر جانتا ہے اور عشق کے جادو کو عقل کی تلوار پر ترجیح دیتا ہے۔ صرف علم کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر انسان اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا، جہاں زندگی سچی مسرت، اطمینان اور شرافت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ وہ راستہ تو اسے ہیروشیما اور ناگاساکی کی دوزخ تک بھی پہنچا سکتا ہے!

اقبال کے انگریزی خطبات میں ایک چھوٹا سا معنی خیز جملہ ہے جو اس بارے میں اس کی بنیادی پوزیشن کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے اور افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کے لئے ایک صحیح بنیاد اور ایک صالح اصول کا تعین کرتا ہے ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خودی کو قائم رکھنے کے لئے ہم جو کام بھی کریں اس میں ایک اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے یعنی ہم اپنی خودی کا بھی احترام کریں اور دوسروں کی خودی کا بھی "اپنی خودی کا احترام" یہ ایک ایسا سُر ہے جو اقبال کے کلام میں شروع سے آخر تک سُنائی دیتا ہے۔ اس عقیدے کی روشنی میں اقبال نے انسان کے بلند مقام کو پہچانا، اسے ایک امید پرور اور حوصلہ آفریں پیغام دیا اور ان راستوں کی جھلک دکھائی جو اس کو ہم دوش ثریا کر سکتے ہیں۔ جس وقت فرشتوں نے آدم، یعنی اس انسان خاکی کو جس کے اندر خیر و شر کے امکانات کا ایک اتھاہ سمندر پوشیدہ ہے جنت سے رخصت کیا تو ان کا الوداعی گیت اقبال کے لفظوں میں یہ تھا:

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی ۔۔۔ خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی!

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن ۔۔۔ تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!

گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی ۔۔۔ اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی!

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے ۔۔۔ ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی!

اس دولت بے بہا کو دامن میں لئے انسان اس دنیا میں آیا لیکن اس نے اپنی بے بصری اور بدذوقی سے، اپنے لوبھ اور انیائے سے اپنی تنگ نظری اور خودغرضی سے اسے دکھ اور محرومی سے بھر دیا۔ ہزاروں برس تک عالم بالا سے اس المیہ کا تماشا کرنے کے بعد فرشتے اپنا تبصرہ بارگاہ خداوندی میں پیش

کرتے ہیں۔ اس تبصرے میں ایک ہلکا سا مودبانہ طنز بھی پنہاں ہے کہ اے انسان کے خالق، تو نے اس انسان کو ہم پر ترجیح دے کر دنیا میں بھیجا تھا کہ وہ اسے عدل، صبر اور حُسن سے بھر دے لیکن ذرا دیکھ تو سہی!

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند مقام ابھی

جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

اور یہ المیہ کیوں وجود میں آیا؟ اس لئے کہ ایک صالح زندگی کی تعمیر کے لئے اقبال نے جو دوسری شرط قرار دی تھی اس کو ہم نے نہیں اپنایا، یعنی دوسروں کی خودی کا احترام جب تک ہم دوسروں کی خودی کا سچا احترام کرنا نہ سیکھیں گے، ان کے لئے خیالات، عقائد اور اعمال کی (خواہ وہ ہم سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں)، وہی آزادی نہیں چاہیں گے جو اپنے لئے چاہتے ہیں، جب تک ہم رواداری کو اپنی کشتی کا بادبان نہیں بنائیں گے۔ ہماری اپنی خودی بھی پھل پھول نہیں سکتی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ایک اوچھی اور بے معنی سی رواداری نہ ہو جو عقیدے کی کمزوری یا تشکیک یا محض بے اعتنائی سے پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ سچی اور گہری رواداری ہو جو میں اور تو کے فرق کو بھلا کر دوسروں کے لئے بھی زندگی کی وہی اچھی چیزیں چاہتی ہے جو اپنے لئے، جو اختلاف کے بجائے ایکتا کی تلاش کرتی ہے، جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتی ہے۔ جب انسان میں ایک طرف دل و دماغ کی یہ فراخی پیدا ہو جائے اور دوسری طرف وہ اپنی خودی کا احترام کرنا سیکھ لے، جس سے مراد جھوٹا غرور اور انانیت نہیں بلکہ یہ جذبہ اور عقیدہ کہ خودی ایک ایسی دولت، ایسی امانت ہے جسے کسی داموں بیچا نہیں جا سکتا یعنی:

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

جب یہ دونوں چیزیں کسی فرد میں جمع ہو جائیں تو اس میں خودداری، صداقت، دیانتداری، اور جرأت کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور وہ جماعت کے رکن کی حیثیت سے ہمدردی، رواداری اور فراخ دلی سے کام لینا سیکھتا ہے۔ یہ چند پیش پا افتادہ روزمرہ کی بول چال کے لفظ ہیں لیکن درحقیقت انہیں میں اچھی زندگی کا بھید پوشیدہ ہے۔ آج کی دنیا میں جس کے اوپر بیتی کے بادل منڈلا رہے ہیں اور جس کی بیخ کنی کیلیئے اس کے قابل ترین دماغ اس طرح جدوجہد کر رہے ہیں جیسے خودکشی زندگی کی سب سے اعلیٰ قدر ہو، کوئی سبق، کوئی پیغام، فکر کی کوئی یاترا، مذہب کا کوئی اصول اس قدر اہم نہیں جتنا یہ سیدھا سادا، پہاڑوں جیسا پرانا، سمندر جیسا گہرا، سورج جیسا روشن، گلاب جیسا شگفتہ پیغام کہ اپنے دل اور دماغ کے دروازوں کو کھول دو تاکہ تعصب اور تنگ نظری اور نسلی حسد کے جالے صاف ہو جائیں، تاکہ انسان انسان کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکے، تاکہ محبت کی دھیمی روشنی اور ٹھنڈی ہوا بند غنچوں کو پھول بنا دے، تاکہ انسان ایک دوسرے کا خون پینے کی بجائے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بننا سیکھیں، تاکہ علم اور سائنس کی فتح مندیوں نے انسان کو جو بے اندازہ قوت بخشی ہے وہ انسان کی سیوا کے لئے، تخلیقی جدوجہد کے لئے، زندگی کی گود کو فراغت اور خوش حالی اور اطمینان سے بھرنے کے لئے استعمال ہو سکے۔۔۔ اور یہی اقبال کا مرکزی پیغام ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ بہت سے الجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے مشرق و مغرب پر، مسلم اور غیر مسلم پر، علم کی عیاری اور قوت کی خطرناکی پر تنقید کی ہے۔ لیکن محبت اور رواداری اور انسان دوستی کا سُر اس کی ساری شاعری میں اس طرح گھلا ملا ہے جس طرح دل کی دھڑکن زندگی کے اندر بسی ہوئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ہر انسان ایک "بندۂ مومن" بن جائے۔ بندۂ مومن جس کی تصویر اس نے ان دل کش الفاظ میں کھینچی ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ   غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اقبال کا یہ پیغام نیا نہیں ہے انوکھا نہیں ہے۔ خدا کے ہر نیک بندے نے، ہر نبی اور ولی نے، ہر رشی اور منی نے، ہر مصلح اور فلسفی نے اپنے اپنے انداز میں اسے دہرایا ہے۔ مہاتما بدھ نے ہزاروں برس ہوئے کہا تھا "تم دشمنی کو کبھی دشمنی کے ذریعہ زیر نہیں کر سکتے۔ صرف محبت اور دوستی کے ذریعہ اسے فتح کر سکتے ہو"۔ یہ ایک ابدی قانون ہے۔ مسیح علیہ السلام نے سکھایا تھا کہ "اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے بھی محبت کرو اور برائی کا بدلہ نیکی سے دو"۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا کہ "اگر خدا کی محبت کا دعوی کرتے ہو تو اس کے بندوں کی خدمت کر کے دکھاؤ"۔ تو پیغام نیا نہیں، انوکھا نہیں، صرف سچا ہے اور ضروری اور اس قابل ہے کہ اسے نشر و اشاعت کے تمام ذریعوں سے عام کیا جائے۔ انہیں ذریعوں میں ایک شاعری ہے۔ کسی خلاق، فن کار کی شاعری، جو لفظوں میں جادو پھونک سکتی ہے اور معنی کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑا سکتی ہے!

اقبال کو دنیا کے سامنے اس انسانی پیغام کے علم بردار کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس دل و دماغ کے انسان، اس کمال کے شاعر، اس بصیرت کے فلسفی آئے دن پیدا نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ملک اور زمانے کے لئے ایک برکت ہوتے ہیں لیکن اپنے ملک اور زمانے کی ملکیت نہیں ہوتے۔ جس طرح طلوع آفتاب کا جمال اور غروب آفتاب کا جلال، چاند کی روپہلی روشنی اور کہکشاں کا حسن، بہتے پانی کا ترانہ اور سر بفلک پہاڑوں کی عظمت ہر انسان کی دولت ہے جو ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اسی طرح گوئٹے اور شیکسپیر، کالی داس اور حافظ، ٹیگور اور اقبال، افلاطون اور سقراط، لنکن اور مہاتما گاندھی ان سب کی ملکیت ہیں جن کے دل کے تار ان کی حکمت یا شاعری کے زیر و بم کے ساتھ لرزش کرتے ہیں۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں اور انسان کا دل ان کا ابدی نشیمن ہے۔

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی | گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند!

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق | میں ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش | میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

پُرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار | آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرّم | کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

یہ ہے اقبال جس کو ہندوستان اور پاکستان دونوں اپنا شاعر مانتے ہیں، جو ان کا یقیناً ہے لیکن صرف ان کا نہیں۔ اس کا پیام محبت تو ساری دنیا کے لئے ہے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے | دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

کاش اس پیام کی گرمی اور گداز ان دونوں دیسوں میں دوستی اور محبت کا اٹوٹ رشتہ قائم کر دے اور دلوں کے کھوٹ کپٹ اس طرح دور ہو جائیں جس طرح اجالے کے سامنے اندھیرا بھاگ جاتا ہے!

○

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

مردِ درویش

خواجہ غلام الثقلین

"لوگ مرتے ہیں اور پیدا ہوتے ہیں مگر سچے بے ریا آدمی مثل لعل کے کمیاب ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی ملاقات سے آدمی کے دل میں دنیا کی طرف سے نفرت اور تلخی کے خیالات کم ہوجاتے ہیں۔ مگر بقول یونانی مثل کے، اچھے آدمیوں سے دیوتا محبت کرتے ہیں اس لئے ان کو جلد اٹھا لیتے ہیں۔"

(خواجہ غلام الثقلین، مولوی بہادر علی کی موت پر)

دنیا میں ہر چیز کی قیمت لگائی جاسکتی ہو نہیں لگائی جاسکتی تو انسانی شخصیت کی، کسی شریف، سچے، بہادر، پاکباز، بے غرض انسان کی، جس نے زندگی کی بہترین قدروں کو اپنایا ہو، ان کو تجربے کی آگ میں تپا کر دیکھا ہو، اپنی ساری عمر ان کی سیوا میں اور اپنے ہم جنسوں کی سیوا میں بسر کی ہو اور پھر نہ ستائش کی تمنا ہو نہ صلے کی پروا، بلکہ اس جنون کی دھن میں ہر قسم کی مخالفت اور بدگمانی اور اعتراضوں کو جرأت اور خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلا ہو۔ . . . خواجہ غلام الثقلین اسی قسم کے ایک انسان تھے!

سطحی نظر سے دیکھیے تو ان کی زندگی میں کوئی ایسے غیر معمولی نظر کو خیرہ کرنے والے ہنگامے نہیں ملتے جو ان کے نام کو ان کی زندگی میں اخباروں کا سرعنوان بناتے اور مرنے کے بعد اس کو تاریخ کے سینے پر ثبت کرتے۔ وہ ایک شریف متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ لکھنے پڑھنے اور تقریر کرنے میں ایک امتیاز حاصل کیا۔ چند سال ملازمت کرنے

کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اصلاح تمدن کی تحریک جاری کی اور اس کی اشاعت کے لئے ایک رسالہ "عصر جدید" نکالا چند کتابیں اور بہت سے مضامین لکھے۔ یو۔پی کونسل کے ممبر چنے گئے جہاں علاوہ اور جہیزوں کے قانون کا مسودہ پیش کیا، اسلامی ممالک کی سیاحت کی اور وہاں کے سیاسی تمدنی اور اخلاقی حالات کا گہرا مطالعہ کیا اور ایک مصروف و پاکباز زندگی بسر کر کے بیالیس سال کی مختصر عمر میں خدا کو پیارے ہوئے! ہندوستان میں بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جن کی زندگی کے خارجی خدوخال اس سے ملتے جلتے ہوں گے۔ خود علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی نے سینکڑوں وکیل، مصنف ایڈیٹر، مقرر اور قومی کام کرنے والے پیدا کئے جنھوں نے نیک نامی کے ساتھ اپنی زندگی گزاری۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو شہرت، وجاہت اور دنیاوی یا سیاسی کارناموں کے لحاظ سے یا ادبی اور ممکن ہے لیکن یقین نہیں، علمی قابلیت میں ان سے افضل رہے ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی غلام الثقلین نہ بن سکا! قدرت نے ان کو جس سانچے میں ڈھالا تھا شاید اس سانچے کو عام کرنا اس کو منظور نہ تھا۔ علی گڑھ کی وسیع برادری میں (اور اس سے باہر بھی) بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کی سیرت میں بے باک صداقت پرستی، مجاہدانہ عزم و جرأت، خلوص اور بے غرضی، ذہنی جودت اور انسانی خدمت کے بے پناہ جذبے کا وہ حسین اور متوازن امتزاج پایا جائے جو ان کی سیرت کے آئینہ میں نظر آتا ہے۔ وہ یقیناً علی گڑھ کی پیداوار تھے اور انہوں نے وہاں کی تعلیم و تربیت اور ماحول سے بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن ان کی انفرادیت ایک مخصوص شان رکھتی تھی جس پر ان کے ماحول کی چھاپ غالب نہ تھی۔ بلکہ اس ماحول سے انہوں نے اپنی فطرت کے تقاضوں اور اپنی قدروں کے پیمانے کے مطابق "صفا" کو لیا تھا اور "کدر" کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنے گرد و پیش کی قدروں اور روایتوں اور انداز فکر و عمل کو بغیر تنقید کے قبول کر لیتے ہیں اور اس طرح محض اپنے دور کی ذہنی آب و ہوا کی عکاسی کرتے ہیں اس لئے اُن کو علی گڑھ کی "سکہ چھاپ" پیداوار نہیں کہا جا سکتا۔ علی گڑھ تحریک کی تاریخ میں ان کی مخصوص اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے ذہنی دیانت اور جرأت کے ساتھ ان قدروں

کو پرکھا جو ان کے ہم عصروں میں قبول عام حاصل کر چکی تھیں اور ملک کے سامنے ان قدروں کو مضبوطی کے ساتھ پیش کیا جن کو وہ قومی حیات کے لئے مفید اور ناگزیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ بہت دشوار گذار اور صبر آزما تھا۔ کیونکہ اس میں کانٹے ہی کانٹے تھے، پھول نہ تھے۔ عام لوگ اکثر اپنی عقیدت اور تعریف اور عزت ان لوگوں کے لئے وقف کرتے ہیں جو ان کی ہاں میں ملا کر ان کی بے جا ناز برداری کر کے ان کے تعصبات اور توہمات کا خیر مقدم کر کے ان کے نفس کو موٹا کرتے ہیں لیکن جو شخص حق گوئی اور تنقید کا ناگوار فرض ادا کرتا ہے، جو لوگوں کی جھوٹی خوشامد نہیں کرتا بلکہ سچائی کے آئینہ میں ان کو ان کی زشت روئی کا عکس دکھاتا ہے اس کے نصیب میں بالعموم صرف لعن طعن، بدگوئی اور بدگمانی کی دولت آتی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین نے سستی ہر دل عزیزی اور لیڈری کا مقام حاصل کرنے کی بجائے تمام جماعتوں کی مخالفت اور نکتہ چینی کو ہمت اور عالی ظرفی کے ساتھ برداشت کیا۔ انہوں نے کبھی مصلحت کی خاطر سچائی کے علم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ کبھی قوت اور اختیار کے مالکوں سے نباہنے کی خاطر اپنی آزادی رائے کو ملوث نہیں کیا۔ اس کشمکش میں انہیں جن مخالفتوں اور بدگمانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی مختصر سی داستان خود ان کے لفظوں میں سن لیجئے۔ دسمبر ۱۹۰۷ء میں، جب کراچی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو ان کی زبردست تقریر اس لطیف انداز میں شروع ہوئی تھی:-

"زمانہ جاہلیت میں ہم نے قدیم یونانیوں کے یہاں ایک عجیب جانور کا ذکر پڑھا تھا جس کا چہرہ آدمی کا، دھڑ شیر کا، نیچے کا جسم مچھلی کا، کھال گینڈے کی اور کان ہاتھی کے تھے۔ عقل نے پہلے اس بے ہنگم مجموعے کو ایک محال اور فرضی گھڑت سمجھا مگر جب بعد میں فلسفے اور الہیات کے موقع کا مطالعہ ہوا تو یہ بات کھل گئی کہ اس جانور میں کوئی بات دشوار اور محال نہیں۔ قدرت خدا سے کیا بعید ہے کہ وہ جدا جدا اعضا مختلف حیوانوں کے ایک جانور میں جمع کر دے۔ مگر جہاں فلسفے نے ممکن کو سمجھایا وہاں محال کی تعریف بھی کر دی۔ یعنی دو متناقص چیزیں ایک وقت میں ایک جگہ اور ایک مرکز پر موجود نہیں ہو سکتیں۔ ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ سپید، موجود

اور معدوم، انسان اور غیر انسان نہیں ہوتی۔ اسی کلیہ پر تمام دنیا کے علوم کا دارومدار ہے۔ بغیر اس کے تمام عمل محال اور دنیا کا وجود ناممکن ہے!

"مگر چند سال سے اس بدیہی قاعدے کی خلاف ورزی نے اخباری دنیا کو پریشان کر رکھا تھا ہمارے اخبارات اور رسالے (جو عام طور پر اکلِ حلال اور صدق مقال کی نہایت پاکیزہ مثال پبلک کے سامنے پیش کرتے ہیں!) اس دیار ہند میں ایک ایسے حیوان کا پتہ دے رہے ہیں جو بالکل متضاد عقلی صفات رکھتا ہے۔ یعنی جاہل اور کتاب کا کیڑا۔ ضدی اور متلوّن مزاج، مغرور اور مکار۔ لیڈری کا شائق۔ ایک مکار رافضی، ایک متعصب سنی، ایک شریر نیچری، ایک دہریہ ایک مذہبی دیوانہ، تقدس کا ادعا کرنے والا، روزے نماز سے منکر، ایک خود پرست انسان، ایک ریفارمر، پیغمبر کا دشمن۔ اسلام کا سچا فدائی، نیک نفس، ابوجہل اور شیطان کو بدی میں سبق دینے والا وغیرہ وغیرہ سب متفق تھے کہ مصداق ان صفات کا ایک شخص ضرور ہے مگر عقل باور نہ کرتی تھی کہ یہ محال جانور کہیں موجود ہو سکتا ہے۔ مگر بات معتبر تھی۔ بھلا کتابوں اور اخباروں میں کبھی جھوٹ بات بھی کہی جاتی ہے! اخبار والوں سے پوچھا، ملاؤں اور سیاست دانوں سے دریافت کیا۔ ٹھیک پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ آخر کار ایک ماہر نجومی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا وہ شخص ۲۶ دسمبر ۱۹۰۷ء کو ہندوستان کے مغرب میں مسلمانوں کے ایک جلسے میں ٹھیک نو بجے شب کو تقریر کرے گا۔ کمال اشتیاق ہوا۔ نہ اس لئے کہ وہ کوئی اچھی باتیں کرے گا بلکہ اس وجہ سے کہ ایسے عجیب الخلقت شخص کی شکل نظر آئے گی۔ جب وقت ہوا تو اس جلسے کے ایک عہدہ دار نے ایک "حقیقت" شخص کو آواز دی۔ اس وقت یکایک بہت سے حقائق منکشف ہو گئے اور اس مطلوب میں عجیب خدوخال نظر آنے لگے اور

من تو شدم تو من شدی	من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں	من دیگرم تو دیگری

کی کیفیت پیدا ہو گئی!"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی باتیں تھیں جن کی وجہ سے، بقول ان کے "منطق کے کلئے غلط اور عقل کا نظام مختل ہو گیا اور ایک شخص مجموعہ رذائل متضاد بن گیا؟" انہوں نے اس لکچر میں ان باتوں کو گنایا ہے جن پر انہوں نے عمر بھر زور دیا اور جن کی مخالفت بہت سی جماعتوں اور مفاد مخصوص نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کی۔ ان میں سے بنیادی باتیں یہ تھیں :۔

۱۔ خوف خدا کو معاشرت میں اپنا راہ نما بناؤ۔

۲۔ کسی مذہب کے بزرگوں پر بدتہذیبی سے حملہ نہ کرو اور نہ لوگوں میں اشتعال پیدا کرو۔

۳۔ جائز ذرائع سے معاش پیدا کرنے کو عین دین سمجھو۔

۴۔ دولت امانت الہٰی ہے اس کے خرچ کرنے اور حاصل کرنے میں خدا کی مرضی اور اخلاق کے اصولوں کا خیال رکھو۔ اس کو بُری طرح نہ لٹاؤ۔ شادی غمی کی رسموں اور دعوتوں وغیرہ میں اعتدال برتو۔

۵۔ محنت اور کام انسانی فرض اور سعادت ہے اور کسی شخص کو حتی الامکان اپنا بار دوسروں پر نہیں ڈالنا چاہیئے۔

۶۔ خیرات معذور اور مستحق لوگوں کو دو۔ ہٹے کٹے لوگوں کو، جو کام کر سکتے ہیں، نہ دو خواہ کسی بھیس میں بھیک مانگیں۔

۷۔ تجارت اور زراعت کے پیشوں کو عزت کی نظر سے دیکھو اور سرکاری ملازمت پر لوٹا کر نہ گرو۔

۸۔ اپنی اولاد کو جہاں تک ہو سکے اچھی تعلیم دینے کی کوشش کرو مگر نئی تہذیب کی فضول خرچی اور اوچھے پن سے بچاؤ۔

۹۔ مذہبی طبقے کو دعوائے تقدس کے ذریعہ نہیں بلکہ اپنی خدمات کے ذریعہ محترم بننا چاہیئے ان کا خاص فرض یہ ہے کہ لوگوں میں انصاف، خدا ترسی اور کفایت کے خیالات پھیلائیں۔

۱۰۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ مغرب کی تہذیب سے خیرہ یا سراسیمہ نہ ہوں، بلکہ ناموس الہٰی اور تقوٰی کے ماتحت اس کی پیروی کریں۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ انہوں نے ایک "شریف اور مجاہدانہ" زندگی بسر کی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی کی امتیازی خصوصیت یہی "جہاد پسندی" تھی اور قومی زندگی کو ایک بہتر اور خوب تر سانچے میں ڈھالنے کی تڑپ جس کے تقاضے نے نہ ان کو آرام اور چین کی زندگی بسر کرنے دی اور نہ انہوں نے دوسروں کو، جو غفلت یا بے حسی یا عیش و عشرت میں مبتلا تھے، آرام لینے دیا! ان کو اپنے چاروں طرف زوال پسندی، اسراف اور ناعاقبت شناسی کا دور دورہ نظر آرہا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح لوگوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کریں، جو دل قومی احساس سے عاری تھے ان میں قومی درد کی جوت جگائیں۔ جو لوگ اپنی دولت اور قوتوں کو بے دریغ ضائع کر رہے تھے انہیں کفایت شعاری کے اصول سکھائیں۔ بے کاروں کو افراد کاسبہ بنائیں۔ مذہب کو تنگ نظری اور "لفظ پرستی" کی بندش سے آزاد کر کے مذہبیت کی حقیقی روح کو ابھاریں۔ مغربیت کی اندھی تقلید کی مخالفت کریں، لیکن مغرب کی اچھی باتوں کا استقبال کریں۔ یہ کام بہت مشکل تھا اور اس کے لئے بہت سے ارباب غرض اور مفاد مخصوص کی مخالفت مول لینی ناگزیر تھی۔ ان کی نظر مستقبل پر تھی جس کے سمجھنے والے کم ہوتے ہیں، عام لوگ اپنی تنگ نظری اور اپنے حقیقی فائدے کو نہ پہچاننے کی وجہ سے "اہالیان مستقبل کے لئے آگ یا تلوار یا آرہ یا خنجر یا دار یا کم سے کم تہمت اور لعن طعن تیار رکھتے ہیں۔" اگر ان میں عزم جہاد نہ ہوتا تو وہ اس کھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ اگر ان میں مصلحت شناسی اور دنیا سازی کی عقل ہوتی تو وہ ان سب قوتوں کے خلاف ایک دم جنگ نہ کرتے بلکہ ایک ہوشیار اور شاطر فوجی جرنیل کی طرح ان سے ایک ایک کر کے نبرد آزما ہوتے اور انہیں فرداً فرداً زیر کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ پانی کے ساتھ بہنا اور ہوا کے رخ اڑنا نہ جانتے تھے یا شاید یہ کہنا چاہیئے کہ نہ چاہتے تھے۔ انہیں فکر صرف یہ تھی کہ سچی بات کہیں اور سچا کام کریں۔ یہ خواہش نہ تھی کہ اہل قوت و اختیار کو خوش رکھیں یا جس حد تک ممکن ہو سکے ان کو ساتھ لے کر چلیں۔ یہی ان کی عظمت کی دلیل اور یہی ان کی مقابلتہً محدود کامیابی کا باعث ہے لیکن انہوں نے یہ کٹھن راستہ جان بوجھ کر، دیکھ بھال کر اختیار کیا اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی مگر وہ اس ناکامی

کو سستی کامیابیوں پر ہزار درجہ ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ خود اس قسم کا کام کرنے والوں کی مخالفت کا نفسیاتی تجزیہ کیا تھا جو آج کے حالات پر بھی اتنا ہی صادق آتا ہے۔

"جو لوگ کسی خاص گروہ یا طبقہ کا جامہ پہن لیتے ہیں وہ گروہ ان کا حامی اور محافظ ہو جاتا ہے مگر اس کی تائید کی بھاری قیمت ان کو دینی پڑتی ہے یعنی اس گروہ کی ہر جا و بیجا بات کا ساتھ دینا یا خاموشی برتنا۔ چونکہ بے جا باتیں کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہر طبقہ میں ہوتی ہیں اس لئے ایسا شخص ایک فریق کا وکیل ہوتا ہے۔ صداقت کا شاہد نہیں ہوتا! مگر جو شخص دین کی حمایت پر زور دے اور ساتھ ہی دیندار طبقے کے رہبروں کو ان کے فرائض سے غافل ظاہر کرے تو وہ لوگ اس کے نظریے سے خوش مگر عملی اعتراض سے نالاں ہوں گے۔ جو شخص ترقّی اور حریت میں جدید فرقے کے خیالات کا حامی ہو لیکن اس بات پر اصرار کرے کہ وہ یقین باﷲ اور تصدیق رسالت میں استوار رہیں اور اپنے فرائض عبودیت ادا کرتے رہیں اس سے روشن خیال کیوں خوش رہیں گے؟ جو شخص انگریزی تعلیم کو لازمی سمجھتا ہو مگر بغیر عملی نتائج حاصل کئے اس کو ناقص جانتا ہو اور دینی تعلیم کو حصول معاش سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا ہو لیکن جس طریقہ سے وہ دی جاتی ہے کہ دماغی جمود بڑھاتی ہے اس کو مضر اور مہلک سمجھتا ہو اس سے ظاہر ہے دونوں فریق متنفّر رہیں گے!"

اس کے بعد وہ ایک اور پتے کی بات کہتے ہیں جو دُنیادار مصلحت اندیشوں کو نشتر کی طرح چبھے گی:۔

"اگر کوئی شخص محض علمی اور اخلاقی بحث کرے اور اس میں اس وطیرے کو اختیار کرے جو خوف کی وجہ سے سلطنتِ بنو امیہ کے وقت سے بہت سے اتقیا اور صلحا نے اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ پبلک میں آکر اپنے خیالات پر زور نہ دیتے تھے ــــــ اچھی باتیں صرف اپنے گھروں تک محدود رکھتے تھے اور عمل پر زیادہ اصرار نہ کرتے تھے تو عوام و خواص تعریف کا شور بلند کریں گے لیکن جو بدنصیب لوگ اپنے اصول پر اس درجہ یقین رکھتے ہیں کہ محض لکھنے پر بس نہیں کرتے بلکہ عمل کی نگرانی بھی اپنے فرائض میں داخل سمجھتے ہیں اور اپنے خیالات کو قوم میں پھیلانے کے لئے حقوق، اعزاز اور

زمین سے سوا سیر غلہ پیدا کرے گا یا دس کے بجائے بارہ آدمیوں کو باکار بنائے گا وہی سب سے بڑا مصلح اور قومی ہمدرد ہے۔" آج چالیس سال کے بعد نظری طور پر یہ باتیں پیش پا افتادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ اس بنیادی پہلو پر اس وقت زور دے رہے تھے، جب مسلمانوں، بلکہ تمام ہندوستانیوں کی سیاست زیادہ تر نوکریوں کے لئے جدوجہد اور چھین جھپٹ تک محدود تھی، جب کالج کی تعلیم خواص کا اجارہ تھی، جب طلبہ خوش پوشی فیشن اور کھیل کود کے ذریعہ امتیاز اور حکام تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ جب استاد اور قوم کے راہبر حکام دوستی اور حکومت نوازی کے طفیل عزت پاتے تھے۔ لیکن ان کا اصول اس وقت بھی یہ تھا کہ

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں پابندگی رسم و رہ عام بہت ہے!

اس وقت ملک کے اور علی گڑھ کے بہت سے "خواص" اُن بنیادی چیزوں کی طرف سے بے پروا تھے یا ان پر ناک بھوں چڑھاتے تھے جو اس مفکر کے نزدیک باعزت قومی زندگی کے لئے ناگزیر تھیں جب وہ اس ٹھوس اور عملی پروگرام کو قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے تو انہیں خوب اندازہ تھا کہ یہ باتیں خواص کے ذہنی دربار میں بار نہ پائیں گی۔

"جو باتیں میں نے عرض کی ہیں ان کی قدر ایسے لوگوں کے دل میں نہیں ہو سکتی جن کے پاس کھانے کو موجود ہے یا جن کی روح غیر قوموں کی غلامی قبول کر چکی ہے اور اس لئے اسلامی اصولوں پر عامل ہو کر وہ ترقی کی امید نہیں رکھتے۔ ان باتوں کی قدر ان سے بھی نہ پوچھنی چاہیئے۔۔ جو باپ دادا کے طریقے اور رواج کو اسلام سمجھتے ہیں، محنت، کفایت شعاری، ایثار، اتفاق، کا جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ بے کاروں، گداگروں، امیروں، فیشن ایبل نوجوانوں، ظاہر پرست علما، انگریزی روش کے اندھے مقلدوں، ایشیائی سکون کے ماتوں کو ایک کھلی بدعت معلوم ہوگی اور وہ خیال کریں گے کہ یہ ایک خبط ہے یا بالکل معمولی اور اوپری باتیں ہیں جو سب جانتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ معزز حضرات، جو خود کو قوم سمجھتے ہیں در اصل اس جھاگ کی مانند ہیں جو اوپر نظر آتا ہے۔ اس جھاگ کے نیچے جو پانی ہے وہی قوم کی اصلی زندگی ہے اور مجھے امید ہے کہ ان میں سے بہت

سے لوگ اس تحریک کے فوائد کو سمجھیں گے اور اس کی مدد کریں گے۔"

واقعہ یہ ہے کہ بہت کم ارباب اقتدار نے اس اصلاحی تحریک میں، جو گہرے معنی میں سیاسی تھی، ان کا ساتھ دیا۔ گروہ ملامت کرنے والوں کی ملامت اور ہنسی اڑانے والوں کی ہنسی کا خیال کئے بغیر اپنی دھن میں لگے رہے اور اگر عمل میں نہیں تو کم سے کم فکر کی دنیا میں ایک خاص حلقے کے اندر ایک صحت مند انقلاب کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوئے جس طرح انہوں نے اپنا قومی اور سیاسی کام سیاست کی مسلمہ چالبازیوں سے بچ کر انجام دیا اسی طرح انہوں نے دوسرے میدانوں میں بھی بغیر کسی آڑ کا سہارا یا کسی مضبوط چھتری کی عافیت تلاش کئے اپنا فرض پورا کر کے دکھایا۔

عام طور پر آدمی اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے بااثر اور زبردست ساتھیوں کی تلاش کرتا ہے اور ان کے بل بوتے آگے بڑھتا ہے لیکن جیسا انہوں نے لکھا ہے ایسا کرنے میں اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اسے ان کی حمایت اور تائید کی قیمت ادا کرنے کے لئے شاید اپنے اصولوں میں آمیزش کرنی پڑے۔ خواجہ غلام الثقلین یہ قیمت ادا کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے قومی کام بہت نوعمری میں شروع کر دیا تھا۔ اس لئے تقریباً بیس سال کی مسلسل کوشش کے بعد انہوں نے مختلف میدانوں میں اپنے ہم خیال لوگوں کی ایک اچھی خاصی جماعت پیدا کر لی تھی لیکن یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ان کے عام روش سے ہٹے ہوئے خیالات کے ساتھ اتفاق رکھتے تھے۔ ان میں سربرآوردہ لوگ اور اہل دولت کم تھے اور اہل دل زیادہ! لیکن چونکہ ان کو دھن یہ تھی کہ قومی مزاج اور انداز فکر میں بنیادی انقلاب پیدا کریں اس لئے ان کو تعداد کی کمی کا خیال نہ تھا، خلوص اور بے غرضی کی تلاش تھی۔ ان کو قرآن شریف کی یہ آیت بہت مرغوب تھی جس کو وہ اکثر اپنی تقریروں اور تحریروں میں دہرایا کرتے تھے:-

" اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور انہیں اچھے کام کرنے کی ترغیب دے اور بُرے کاموں سے روکے۔"

ان کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ وہ ایسی جماعت تیار کریں جو مسلمانوں اور ہو سکے تو تمام ہندوستانی

قوم کے لئے ایک فعال اور حساس ضمیر کا کام دے۔ انہیں اس مقصد کی ایسی لگن تھی کہ طالب علمی
کے زمانے میں، جب نوجوانوں کو صرف امتحان پاس کرنے یا کھیل کود یا خوش پوشی اور خوش باشی کی
فکر ہوتی ہے، انہوں نے علی گڑھ میں ایک "انجمن اخوان الصفا" قائم کی تھی جس کا مقصد تھا کہ
طلبہ میں پاکیزہ زندگی عملی مذاق اور باہمی اخوت اور محبّت کی صفات پیدا کرنا۔ چنانچہ جب تک
وہ کالج میں رہے انہوں نے اس کے مباحثوں اور مشاغل میں بڑا سرگرم حصہ لیا۔ ان میں اور ان
کے بہت سے ہم عصروں میں جو قومی زندگی میں پیش پیش تھے، ایک بنیادی اختلاف یہ تھا کہ یہ
سیرت کی پختگی اور اخلاقی قدروں کے احترام کو زندگی میں سب سے اونچی جگہ دیتے تھے اور سمجھتے
تھے کہ اگر یہ چیز حاصل ہو جائے تو دنیا کی اور تمام اچھّی چیزیں خود بخود مل جائیں گی۔ برخلاف اس کے
اُن لوگوں کا خیال تھا کہ اصلی چیز دولت یا سیاسی اقتدار یا ملازمت یا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے اور
قوم کو اپنی کوشش ان کے لئے وقف کر دینی چاہیئے۔ یہ لوگ بھی زبان سے اخلاق اور مذہب کی
قدروں کو سراہتے تھے لیکن وہ نہ زبان سے اتر کر ان کے دل میں گھر کرتی تھیں نہ ان کی پالیسی
پر اثر ڈالتی تھیں۔ خواجہ غلام الثقلین کا ذہن اس معاملہ میں بالکل صاف تھا۔ وہ بنیادی اخلاقی قدروں
اور سیرت کی پاکیزگی کے مقابلہ میں دنیا کی تمام دولت اور حکومت کو ہیچ سمجھتے تھے جس چیز کو اقبال نے
"نصاب زر و سیم" کہا ہے اس کے لئے ان کے نظام اقدار میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ان کی تعلیم اور خیالات
اور روزمرّہ کی زندگی میں ایک خاص شان درویشی تھی جو ان کے دل اور دماغ کے ہر گوشے میں
بسی ہوئی تھی۔ ان کے کام کا پورا اندازہ محسوس نتائج کی ترازو میں تول کر نہیں ہو سکتا۔ اس کے
لئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ انہوں نے قومی زندگی میں کن قدروں کو رائج کرنے کی کوشش
کی اور وہ قدریں کس حد تک حیات بخش ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین کے عملی اور اخلاقی مزاج کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کے
بچپن اور نوجوانی کے ماحول پر نظر ڈالیں اور ان اثرات کا تجزیہ کریں جنہوں نے ان کی سیرت بنانے
میں حصہ لیا۔ انہوں نے ایک گہرے مذہبی اور اخلاقی ماحول میں تربیت پائی تھی جس نے بچپن

ہی سے ان کی طبیعت میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کے بیج بوئے جو رفتہ رفتہ شاہ بلوط کی شان کے ساتھ ان کی زندگی اور تحریروں اور تقریروں میں نمایاں ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا ماحول ایک علمی اور ادبی ماحول تھا جس نے ابتدا ہی سے ان میں علمی اور ادبی ذوق اور مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔ اگر ان پر صرف گھر کا مذہبی اثر پڑا ہوتا اور انہوں نے مذہبی تعلیم ہی پائی ہوتی تو وہ غالباً ایک متدین عالم ہوتے اور ایک نیک، شریف اور پاکباز زندگی بسر کرتے اور بس۔ اگر انہوں نے صرف علمی اور ادبی سرچشموں سے استفادہ کیا ہوتا تو وہ اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر یقیناً علمی دنیا میں نام پیدا کرتے لیکن اس صورت میں ان کی طبیعت میں دین اور دنیا کی بہترین قدروں کا وہ نادر امتزاج نہ ہوتا جس نے ان کو ایک غیر معمولی انفرادیت بخشی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے خاص طور پر مسلمانوں کے سامنے اور عام طور پر تمام ہندوستانیوں کے سامنے فکر و عمل کا ایک ایسا مکمل اور مرتب اور مربوط نظام رکھا جس میں "مغربی حریت اور مشرقی للّٰہیت، عربی سادگی اور عجمی تہذیب، تاریخ فہمی اور فلسفیانہ غور و فکر نے ایک منفرد شان پیدا کر دی تھی۔" انہوں نے ابتدائی تربیت اپنے خاندان کی سخت مذہبی فضا اور دہلی اور پانی پت کی فکری وضع داریوں کے ماحول میں پائی اور اس کے بعد علی گڑھ کالج میں مغربی تعلیم کے اثرات کو جذب کیا جن کے تقاضے بالکل مختلف تھے۔ یہ تجربہ تو ان کی نسل کے بہت سے نوجوانوں کو پیش آیا تھا۔ لیکن ان میں سے اکثر نے ایک اثر کو قبول کیا اور دوسرے کو مسترد یا بعض نے دونوں کی معنویت اور اختلافات کو سمجھے اور پرکھے بغیر ان کا ایک سطحی مرکب تیار کر لیا اور اسی کو عمر بھر برتتے رہے۔ خواجہ صاحب کا رویہ اس بارے میں بالکل جدا تھا۔ انہوں نے مشرق و مغرب۔ مذہب و سیاست کے تمام تقاضوں اور مطالبوں کو تولا اور پرکھا اور ان کو تنقید کی بھٹی میں پکا کر ایک ایسا کیمیائی مرکب تیار کیا جس میں ان کے بہترین اور صحت مند عناصر ضم ہو گئے تھے۔ وہ کسی معاملے میں اوچھی اور عام پسند رائے قائم کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ ایک اچھی انسانی اور اسلامی زندگی کے جو بنیادی اصول انہوں نے قبول کئے تھے ان کی روشنی میں وہ ہر پرانی روایت اور نئے تقاضے کو پرکھتے تھے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

"ان کے زمانے میں، جہاں اصلاحوں پر زور تھا وہ اسی حیثیت سے تھا کہ مذہب ایک لغو چیز ہے، دنیاوی ترقی پر توجہ کرنی چاہیے۔ جہاں مذہب پر زور تھا وہ اس نظر سے تھا کہ پرانی عادات اور رسوم کو قائم رکھو ورنہ نئی تہذیب اور تعلیم تمہیں جہنم میں لے جائے گی جہاں بعض جزوی رسوم اور فضولیات کی مخالفت تھی کہ سلف صالح میں یہ باتیں رائج نہ تھیں، یہ بدعت اور ضلالت ہیں مگر جس عقلی اور مذہبی نظر سے "عصر جدید" نے ان سب معاملات میں فلسفہ اعتدال کا اعلان کیا۔ وہ طریقہ نیا تھا۔ اس لئے تعلیم یافتہ اور جدید خیال کے لوگوں کو حیرت ناک معلوم ہوتا تھا اور پرانے ملّا اس میں اپنے زوال کا نظارہ دور ہی سے دیکھ رہے تھے۔"

انہوں نے ۱۹۰۸ء میں "عصر جدید" سلسلہ اول کو بند کرتے ہوئے ایک مضمون "کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں اپنی ذہنی نشوونما اور خیالات پر ایک دلچسپ اور سبق آموز تبصرہ کیا تھا۔ اس سے ہمیں ان کی سیرت کی ساخت سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کون کون سے مختلف لیکن مربوط اثرات تھے جن کے فیض سے ان کے فکر و عمل میں "عدل" کی ایک نادر شان ظاہر ہوئی اور باوجود نہایت گہری اور پرخلوص مذہبیت کے ان کے دل و دماغ میں کسی قسم کی بے جا عصبیت راہ نہ پا سکی۔ وہ ان غیر معمولی لوگوں میں سے تھے جو باوجود طبعاً "مجاہد" ہونے کے ہر قسم کی ذہنی اور جذباتی تنگی سے پاک رہے اور جن کو دوسروں کے جذبات اور خیالات کا بھی اتنا ہی سچا احترام تھا جس قدر اپنے عقائد پر یقین۔ فلاسفہ یونان اور اسلام کے معلمین اخلاق کے نزدیک ایک اچھی زندگی کی بنیاد، خواہ وہ فرد کی ہو یا جماعت کی، ایک ہی چیز ہو سکتی ہے اور وہ "عدل" ہے یہ صفت، ایک طرف تو ان کی اپنی سیرت اور مزاج میں جلوہ گر تھی اور دوسری طرف وہ تمام عمر قوم کے سامنے اس کی تبلیغ اور اشاعت کرتے رہے کیونکہ ان کے نزدیک اس کے بغیر کوئی قوم نہ دینی فلاح حاصل کر سکتی ہے نہ دنیاوی فلاح ۔ ۔ ۔ ۔ اس مضمون میں انہوں نے تین خاص اثرات کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے ان کی سیرت کا ڈھانچہ تیار کرنے میں حصہ لیا۔

ان میں سے پہلا ان کے والد خواجہ غلام عباس کا مذہبی اثر تھا۔ ان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں (اور میں ان الفاظ کو اس لئے نقل کرتا ہوں کہ ان سے خود ان کے مزاج اور قدروں پر روشنی پڑتی ہے) "میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کو اسلام اور اس کے عقائد پر اس سے زیادہ وثوق تھا جو اپنے مکان یا زمین یا اولاد کے موجود ہونے کا تھا۔ اس یقین کا اعلان تو سب ہی کرتے ہیں (اور آج تو اعلان بھی نہیں کرتے!) لیکن حقیقی طور پر بہت کم لوگوں میں ایسا یقین ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت میں خوف خدا اور راست بازی کی محبت اور آنحضرت اور ان کی عترت طاہرہ کی الفت حد کمال کو پہنچ گئی تھی . . . . اس کے ساتھ ہی ان کی دوسری خصلت یہ تھی کہ دنیا سازی، مکر اور خود غرضی سے، جو شرفا اور امرا میں طبیعت ثانیہ بن گئی ہے، ان کو از حد نفرت تھی اور غریبوں سے (جن کی بابت سیدنا مسیحؑ کا یہ مقولہ ہے کہ "مبارک ہیں مسکین، کیونکہ انھیں کے نصیب میں آسمانی بادشاہت ہے") انہیں خاص انس تھا اور وہ ان کی امداد اور دوستی کو خود پرست اور موٹے آدمیوں سے ملنے پر ہمیشہ ترجیح دیتے تھے اور ان لوگوں کی خوشامد میں کبھی کوئی لفظ کہنا گوارا نہ کرتے تھے . . .
تیسری خصلت مرحوم کی یہ تھی کہ ان کے دل میں انسانوں کا خوف بالکل نہ تھا۔ ان کی جرأت اور دلیری پر مخالفین کا زور اور اجتماع کبھی غالب نہ آیا۔ ان کی جیسی حق گوئی اور جرأت کی مثال بہت کم نظر آئے گی کیونکہ اس نسل میں "عاقبت اندیشی" کا مادّہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اگر میں نے اپنی عملی اور قومی زندگی میں جرأت یا غربا سے ہمدردی یا صداقت اور مذہب کے اصولوں کو مصلحت اندیشی سے بالا سمجھنے کا کچھ بھی ثبوت دیا ہے یا ان خیالات کو بڑھانے کی کوشش کی ہے تو اسے والد مرحوم اور کئی پشت کے دلیر طبیعت بزرگوں کا اثر سمجھنا چاہیئے۔" واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی نے بہ یک وقت مذہب کے ساتھ عقیدت، ذہنی اور اخلاقی جرأت اور غریب اور محروم طبقوں کے ساتھ عملی ہمدردی کا ان سے بڑھ کر ثبوت دیا ہو۔
دوسرا زبردست اثر ان کی طبیعت پر ان کے نانا میر محمد حسین کا پڑا جن میں دو نمایاں خصوصیتیں تھیں۔ ایک مطالعہ کا شوق۔ دوسرے روپیہ پیدا کرنے کے معاملہ میں بے پروائی۔ خواجہ صاحب

میں بھی یہ باتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ روپیہ پیدا کرنے کی طرف انہیں کبھی توجہ نہیں ہوئی۔ روپیہ کی محبت کے لئے ان کے دل کے دروازے بالکل بند تھے۔ وہ وکالت کرتے تھے لیکن ایک آزاد منش مزدور کی طرح۔ اگر مہینہ کے پہلے چند روز میں ماہوار خرچ کے لائق فیس انہیں مل جاتی تو وہ باقی سارا وقت اپنے قومی اور علمی کاموں میں لگا دیتے اور عدالت میں دوکان لگا کر نہ بیٹھتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ان کے پاس گاؤں سے مقدمہ والے آتے اور انہیں وکیل کرنا چاہتے لیکن اکثر وہ ان غریبوں سے روپیہ لینا جائز نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ دونوں فریقوں کو بلا لیتے۔ انہیں مقدمہ بازی کے خطروں سے آگاہ کرتے اور ان کا اعتماد حاصل کر کے خود ہی بغیر ایک پیسہ لئے جھگڑے کا فیصلہ کر دیتے اور انہیں خوش و خرم اپنے گھر واپس بھیج دیتے۔ جو موکل فیس ادا نہ کرتے ان پر حتی الامکان تقاضہ نہ کرتے بلکہ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ان کے منشی نے کسی ایسے شخص پر تقاضہ کیا ہے جو رقم ادا نہیں کر سکتا تو انہیں سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے روک دیتے۔ اسی شان فقر کا فیض تھا کہ جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنے خاندان کے لئے کوئی دولت یا قابل ذکر جائداد نہ چھوڑی، سوائے نیک نامی اور شرافت کی دولت کے، بلند خیالات اور بلند کردار کی دولت کے۔ خدا ترسی اور خدمت خلق کے جذبے کی دولت کے . . . . اور میں نہیں سمجھتا کہ اس سودے میں ان کے خاندان والے کچھ گھاٹے میں رہے ہوں!

میر محمد حسین کا علمی اثر ان کی طبیعت میں ایسے برگ و بار لایا جس کی وجہ سے ان کا شمار اپنے زمانے کے سب سے زیادہ سنجیدہ طلبہ اور عالموں میں ہو سکتا ہے۔ کالج کے زمانے سے ان کا معمول تھا کہ تقریباً ہر روز اردو یا انگریزی یا فارسی کی ایک کتاب ختم کر دیتے تھے اور اس شغف میں اکثر کھانا تک بھول جاتے تھے! جب وہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے تو مولانا شبلی کالج کے لائبریرین تھے وہ دیکھتے کہ ایک نوجوان طالب علم ہر روز آتا ہے، لائبریری سے ایک کتاب لیتا ہے اور اگلے دن اسے واپس کر دیتا ہے۔ انہیں خیال ہوا کہ شاید یہ نوجوان خوامخواہ کتابیں لے جاتا ہے۔ پڑھتا وڑھتا نہیں۔ پوچھا تو اس نے کہا۔ جی نہیں میں تو ہر کتاب پڑھ کر

واپس کرتا ہوں۔ مولانا کو بہت تعجب ہوا اور انہوں نے چند کتابوں کے بارے میں سوال پوچھے تو اندازہ ہوا کہ اس نوجوان کا یہ خلاف قیاس بیان بالکل صحیح ہے۔ اس وقت سے مولانا شبلی ان پر خاص طور پر مہربان ہو گئے تھے اور یہ خلوص کا رشتہ ان کے انتقال تک قائم رہا . . . .

مطالعے کا یہ شوق، اسی قدر شدت کے ساتھ انہیں آخر عمر تک رہا۔ اس میں اس قدر تنوع اور ہمہ گیری تھی اور وہ بہت سے مختلف مضامین میں اس درجہ دلچسپی اور گہری نظر رکھتے تھے کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ اسی وجہ سے ان کے خیالات اور ان کی تحریروں اور تقریروں میں وہ ذہنی پختگی اور گہرائی پائی جاتی ہے جو کسی "غیر مرتب" دماغ کے حصے میں نہیں آتی بلکہ ایک ایسے شخص کے سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کے اعلیٰ ترین مصنفوں اور رہبران فکر کے خیالات کو اپنایا ہو اور ان کی روشنی میں اپنے زمانے کے زندہ اور نزاعی مسائل کا بے لاگ مطالعہ کیا ہو۔ مطالعہ کی وسعت اور تنوع کا انہوں نے خود ایک مضمون میں ذکر کیا ہے اور اس کی داخلی شہادت ان کی تمام تصانیف میں ملتی ہے۔ موجودہ زمانے میں جب "اختصاص" کی تحریک ہماری علمی اور ادبی زندگی اور مذاق کو تیزی کے ساتھ مفلس بنا رہی ہے۔ ان کے علمی مذاق کا پھیلاؤ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا. . . .

"ایک طرف سقراط، افلاطون، گبن، میکالے، کارلائل، تھیکرے، ڈکنز، ڈوما، مارلے، لیکی، فروڈ، ہلٹن، شیکسپیر، امرسن، تیبز، شلٹ، ہیگل، ہربرٹ سپنسر، فریڈرک ہیریسن، ڈریپر۔ دوسری طرف سعدی، خیام، محمد ابن یعقوب کلینی، جامع کافی، جامع مشکوٰۃ، غزالی، شمس تبریز، نواب غلام حسین، ابن اثیر، ابن خلدون، ابن حزم، قاضی نور اللہ شستری، شیخ مفید وغیرہ۔ تیسری طرف قرآن شریف، احادیث کا بڑا حصہ، خطبات امیر المومنین علیؑ، اور کنفیوشس، اور دوسرے بانیان مذہب کے خیالات وغیرہ، چوتھی طرف تقریباً تمام مشہور لوگوں کی سوانح عمریاں تقریباً تمام دائرہ مناظرہ و کلام جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں شیعوں اور سنیوں میں ہوتا رہا ہے۔ پانچویں طرف، موجودہ اُردو

لٹریچر جس کی بنا میر امن نے ڈالی اور جس کو اب ہمارے ناول نویس وغیرہ
چلا رہے ہیں۔ چھٹی طرف، وہ لٹریچر جس کی بنا سرسید نے ڈالی اور جس کی
تکمیل اب مولانا شبلی کر رہے ہیں۔"

اسی وسیع اور سلجھے ہوئے سنجیدہ مطالعہ کا اثر تھا کہ جب وہ لکھنے بیٹھتے تو خیالات اور مضامین اور حوالوں کا ایک ہجوم صف بستہ ان کے سامنے موجود ہوتا۔ انھیں کسی مضمون کے لئے خاص کر کے تیاری کرنی نہ ہوتی تھی کیونکہ ان کی تمام عمر ایک طرح تصنیف و تالیف کے لئے تیاری میں صرف ہوئی تھی۔ اسی وسیع معلومات اور مربوط اور سنجیدہ فکر کا فیض تھا کہ وہ ہر قسم کے موضوع پر، خواہ وہ حدوث مادّہ جیسا دقیق مضمون ہو یا "اردو اہل قلم پر ایک نظر" یا "توحید صوفیا کی نظر میں" یا "اسلامی اور موجودہ تہذیب کا تقابل" قلم برداشتہ لکھ سکتے تھے اور تقریر کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی تقریر و تحریر میں کہیں محض عبارت آرائی یا ٹھونس ٹھانس نہیں ملتی۔ جو کہنا تھا وہ ان کے دماغ میں بالکل صاف تھا۔ اس کے دلائل صف بہ صف آراستہ تھے اور وہ اس کو بغیر کسی ذہنی جھجک یا معذرت کے بیان کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت پر غالب رنگ سنجیدگی کا تھا لیکن گفتگو اور تحریر و تقریر میں ایک خاص قسم کی متانت آمیز ظرافت پائی جاتی تھی۔ بعض لوگ جو ان سے بخوبی واقف نہ تھے وہ ظرافت کی بات کو سنجیدہ سمجھ کر دھوکا کھا جاتے تھے۔

اس میدان میں ابتدا ہی سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی بہت سی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ کالج کے زمانے میں انھوں نے سرسید کے رسالہ "غلامی" پر ایک مفصل ۴۶ صفحے کا ریویو لکھا جس میں انھوں نے رسم غلامی کی سخت مخالفت کی اور سرسید کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ سرسید نے اس ریویو کی اس قدر عالی ظرفی کے ساتھ قدر دانی کی کہ اپنے رسالہ کی جلد تڑوا کر ریویو کو اس کے ساتھ مجلد کرا لیا! بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد کوئی سوا سال تک انہیں نواب محسن الملک کے ساتھ ان کے سکرٹیری کی حیثیت سے رہنے کا موقع ملا۔ نواب صاحب بڑے عالی دماغ اور علم دوست شخص تھے اور مختلف علوم سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن انگریزی

نہ جانتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اس عرصہ میں ان کے لئے فلسفے، اخلاقیات اور مذہب کی کئی مستند انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا اور اس طرح اِن کی صحبت میں ان کے علمی ذوق کو جِلا ملی۔ کوئی ۲۲ سال کی عمر میں انہوں نے انگریزوں اور ترکوں کے سیاسی تعلقات پر ایک مضمون لکھا جس کا انگلستان میں خاصا شہرہ ہوا اور پندرہ اشرفیاں معاوضہ ملیں جو اس زمانے میں ایک بہت بڑی رقم تھی۔ انگریزی مضامین اور کلمات کا ایک مجموعہ ESSAYS AND-APOTHEGMS کے نام سے شائع ہوا اور اس کے کچھ حصّے انگلستان کے ایک موقر رسالہ GREAT THOUGHTS میں بھی چھپے اس رسالہ کا ذکر کرتے ہوئے جس میں انہوں نے تہذیب نفس، اکابر عالم، افلاس، موت وغیرہ کے دقیق مسائل پر عالمانہ اور سنجیدہ بحث کی ہے۔ اپنے مخصوص اور خشک ظرافت کے انداز میں لکھتے ہیں۔

"عام طور پر ہندوستانیوں کی انگریزی تصانیف میں اس رسالے کا درجہ زبان اور خیالات کے لحاظ سے کچھ بہت بُرا نہیں لیکن یہ مطلق مقبول نہیں ہوا۔ شاید اس وجہ سے کہ فلسفی اور تمدنی مسائل پر غور کرنے والے کم ہیں اور کسی نے اس کو غور سے پڑھنے کی زحمت نہیں اٹھائی! نواب عماد الملک کو میں نے اس کی ایک جلد دی تو اس کی یہ داد ملی کہ" میری رائے میں آپ کو یہ کتاب شائع نہ کرنی چاہیئے تھی"۔ کیا انگریزی عبارت ناقص ہے؟ "نہیں" زبان میں کوئی بات قابل اعتراض ہے؟ "نہیں۔ مگر خیالات ایسے بلند ہیں کہ ایک نوجوان شخص کو زیب نہیں دیتے!"

اسی طرح ایک بار مسلم ایجوکیشن کانفرنس کی تقریر پر ایک بزرگ نے فرمایا تھا۔

"تقریر بہت اچھی تھی لیکن سرسید یا مہدی علی خاں کو زیب دیتی!" لیکن ان کی قابلیت کے سب لوگ قائل تھے اور کالج کے پرنسپل سر تھیوڈور بک نے ان کے کالج چھوڑتے وقت لکھا تھا کہ" علمی لحاظ سے ہمارے طلبہ میں کوئی طالب علم

غلام الثقلین جیسا نہیں ہوا"

ان کے انداز تحریر کے بارے میں بعض باتیں قابل ذکر ہیں۔ وہ بہت تیزی اور روانی کے ساتھ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ ان کو فکر صرف یہ ہوتی تھی کہ اپنے خیالات کو جو سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح اندر سے ابلتے تھے صفائی اور قوت کے ساتھ پیش کر دیں۔ لفظی تراش خراش اور ادبی صناعی کی طرف انہیں بہت کم توجہ ہوتی تھی۔ ان کے بڑے بھائی مولوی خواجہ غلام الحسنین مرحوم بھی ایک نامور مصنف تھے لیکن دونوں بھائیوں کے انداز تحریر میں بڑا فرق تھا۔ خواجہ غلام الحسنین جب کوئی چیز لکھتے تو لفظوں کا انتخاب بڑی احتیاط سے کرتے۔ عبارت کو زیادہ سے زیادہ رواں اور واضح بنانے کی کوشش کرتے جس سے مطلب اتنا صاف ہو جاتا جیسے ستھرے ہوئے پانی کی جھیل۔ اس پر بار بار نظر ڈالتے اور انہیں اس وقت تک اطمینان نہ ہوتا جب تک اس کو ایک چابک دست آرٹسٹ کی طرح نہ سنوار لیں۔ برخلاف اس کے خواجہ غلام الثقلین کو سخن آرائی سے سروکار نہ تھا۔ وہ جو کچھ ایک دفعہ لکھ لیتے اس پر بہت کم نظر ثانی کرتے۔ اس لئے ان کی اکثر تحریروں میں لفظوں کے انتخاب یا عبارت آرائی کا کوئی خاص کمال نہیں ملتا۔ ان میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ خیالات کی گہرائی اور وضاحت اور ان کے ذہنی خلوص، صداقت اور جوش کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے ایک دردمند اور صاف باطن انسان کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے، ایک روشن دماغ کی کارفرمائی نظر آتی ہے، ایک بہادر سپاہی کی تلوار کی چوٹ ہے مگر کسی ماہر جوہر تراش یا سنار کی صناعی اور عرق ریزی کا ثبوت نہیں ملتا۔

یہ بات محض اتفاقی نہیں بلکہ ان کی سیرت کے ایک اہم پہلو کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ وہ ہر معاملے میں زندگی کے ہر پہلو میں معنی کو صورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ کام کے قائل تھے۔ باتوں کے اور باتیں بنانے کے شوقین نہ تھے۔ ان کا مقصد اعلیٰ قومی اخلاق اور سیرت میں انقلاب پیدا کرنا تھا۔ اور اس جہاد کے لئے ان کے پاس سب سے موثر ہتھیار تحریر و تقریر کا تھا۔ الفاظ ان کی نظر میں اس مقصد کے حصول کے لئے آلہ کار کی حیثیت

رکھتے تھے اور بس۔ اس لئے وہ انہیں ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے تھے مقصود بالذات نہ بناتے تھے۔ ان کے علمی اور ادبی مذاق کو دیکھتے ہوئے اور ان کی بعض تحریروں کو پڑھ کر، جو شاید ذرا فرصت اور اطمینان کے ساتھ لکھی گئی ہیں خیال ہوتا ہے اگر وہ کسی اور زمانے میں پیدا ہوتے یا انہوں نے ایک مختلف طبیعت پائی ہوتی اور وہ اپنے لئے ادب کا میدان پسند کرتے تو وہ فنی لحاظ سے بھی ایک عمدہ انشا پرداز بن سکتے تھے لیکن انہیں نہ اس کی مہلت تھی نہ دماغ۔ ان کو ملک میں اک آگ لگی دکھائی دیتی تھی جو قوم کے بیش بہا سرمایہ کو تیزی کے ساتھ جلا رہی تھی، ایسے وقت میں ایک حساس اور درد آشنا شخص ہر ممکن طریقے سے آگ بجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ لوگوں کو بیدار اور متنبہ کرنے میں ردیف قافیہ اور عبارت کے لف و نشر کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا!

اپنی ادبی دلچسپیوں اور علمی شغف کا ذکر کرنے کے بعد وہ ایک انوکھے اور اثر آفریں انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اس جلوہ صد رنگ سے معمور دنیا کو چھوڑ کر وہ قومی اور معاشرتی جھگڑوں اور کاموں میں کیوں شریک ہوئے اور انہوں نے یہ دشوار گزار راستہ کیوں پسند کیا۔

"باوجود اس علمی دلچسپی اور کوشش کے، میرا بار بار ایسی باتوں پر زور دینا کہ شادی بیاہ میں فضول خرچی نہ کرو یا بری میں ہانڈیاں کم لے جاؤ یا کوٹ کی سلائی پانچ روپیہ کی بجائے ایک روپیہ دو یا عبادات کو محض مستحب نہیں فرض جانو یا پالیٹکس اور کالج اور کانفرنسوں کے جھگڑوں میں شامل ہونا اور اپنی سمجھ کے مطابق جو ٹھیک رائے ہو اس پر، باوجود سب کی مخالفت کے زور دینا یہ سب کم سے کم اس غرض سے تو نہیں سمجھا جا سکتا کہ اس شخص کو اور کوئی کام یا دلچسپی یا مشغولیت ناموری حاصل کرنے کے سوا نہیں ہے۔ نہیں، یہ نتیجہ ہے اس یقین کا جس کو شیخ سعدی نے مندرجہ ذیل اشعار میں ظاہر کیا ہے جو میں اکثر علی گڑھ کے لکچروں میں دہرایا کرتا تھا:۔

صاحب دلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ   بشکست عہد صحبتِ اہلِ طریق را

گفتم میانِ عالم و عابد چہ فرق بود   تا اختیار کردی ازاں ایں طریق را
گفت آں گلیم خویش بروں می بزور موج   ایں جہد می کند کہ برآرد غریق را

ان کی طبیعت کو قومی کام کی طرف مائل کرنے میں سب سے زبردست اثر مولانا حالی کا تھا۔ انہوں نے گیارہ اور سولہ برس کے بیچ کا اثر پذیر زمانہ حالی کی انسان ساز صحبت اور تربیت میں بسر کیا اور اس سرچشمۂ فیض اور قلب صافی سے صحیح قدروں کی وہ دولت حاصل کی جو ان کی زندگی کے لئے بادبان کا کام کرتی رہی۔ وہ لکھتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ والد مرحوم کا اثر محض ایک نڈر ملّا یا خدا ترس شخص بنانے کیلئے کافی تھا اور میر محمد حسین کا اثر ایک کتاب کا کیڑا اور لٹریچر کا شایق بنانے والا تھا۔ مگر ان دونوں باتوں کے ساتھ قومی خدمت کا شوق، قومی ہمدردی کا ملکہ اور قوم کو اپنی ذات یا قصبے یا گروہ تک محدود نہ کرنا اور کسی فرقے کے تعصبات کی پروا نہ کرنا، یہ صرف مولانا حالی کا اثر تھا . . . اس کے علاوہ مولانا کی صحبت کا اثر اس معنی میں بہت زیادہ ہوا کہ پرانے اور نئے زمانے کے خیالات کا امتزاج ہو گیا اور طبیعت میں تنگ دلی اور تعصب کا اثر جو ایک حد تک ہر انسان اور خاص کر قصباتی شرفا کے لئے لازمی ہے زائل ہو گیا اور خود غرضی اور محض ذاتی ترقی اور تمول کی خواہش (جس کا شائبہ بھی مولانا حالی کی زندگی میں نہ ملے گا) بالکل دب گئی۔ مگر ساتھ ہی مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ جو بے غرضی اور ذاتی نام و نمود سے بے پروائی مولانا کی ذات میں ہے اس تک میرا یا کسی کا پہنچنا بھی کارے دارد۔ نیز مذہب کے معاملے میں جو فراخی اور وسعت مولانا کے خیالات میں ہے وہ عقلاً تو مجھ میں کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔ لیکن فطرتاً اور طبعاً اس درجہ تک نہیں ہے۔"

یہ تھے وہ اثرات جن کے تانے بانے سے ان کی سیرت نے اپنی منفرد شکل اختیار کی جو شخص بچپن اور نوجوانی میں ایک ایسے ماحول سے گزرا ہو۔ اور ان قدروں سے مسلح ہو کر زندگی کی جدو جہد میں داخل ہو اس کی ایک عجیب پوزیشن ہو جاتی ہے۔ جہاں اسے بزرگوں اور خاندانی روایتوں کے سرچشمہ سے اخلاقی اور ذہنی دولت کا ایک بیش بہا سرمایہ ہاتھ آتا ہے۔ وہاں دنیا کی دوڑ میں عملی اعتبار سے اس کی مشکلیں بڑھ جاتی ہیں۔ کیونکہ دنیاوی کامیابی اور اثر و رسوخ پیدا

کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ان سے محروم رہ جاتا ہے یعنی دنیاداری، مصلحت شناسی، قوت و اختیار کے سامنے جھکنے پر آمادگی، صداقت اور ریاکاری کے درمیان دانش مندی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی قابلیت۔ اسی وجہ سے خواجہ غلام الثقلین کو دنیاوی اور سیاسی اعتبار سے وہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی جو ان کے بعض ہم عصروں اور بعد میں آنے والوں کو ملی۔ حالانکہ ان میں سے اکثر ان جیسی سیرت اور ذہنی قابلیت کے مالک نہ تھے۔ انہیں خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ سیاست کے میدان میں جس کو انہوں نے حالات کے تقاضے سے اپنایا تھا انہیں نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں "آپ بیتی" کے سلسلے میں انہوں نے لکھا تھا:

"ایک مذہبی طبیعت کا آدمی، جو جھوٹ اور خوشامد سے متنفر کیا جارہا ہو ایک گوشہ نشین کتاب کا کیڑا جس نے قومی خدمت اور خیر خواہی کو اپنا منتہائے نظر قرار دیا ہو، اگر دنیا کی زرطلبی اور رسوخ طلبی کی گھوڑ دوڑ میں داخل ہوگا تو بودے اور کمزور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر! اور ظاہر ہے کہ وہ اکثر جگہ شکست کھائے گا اور پوری کامیابی کے ساتھ کام انجام نہ دے سکے گا۔ مسلمانوں میں اور وہ بھی ہندوستان کے "شریف" مسلمانوں میں (جو سینکڑوں برس سے خود غرض اور خود پرست انسانوں کے سامنے سر جھکانے میں مصروف رہے ہیں) کس طرح کوئی شخص بغیر حکومت یا روپیہ پیدا کئے یا بغیر سازش اور چال بازی کے ایسا رسوخ حاصل کر سکتا ہے کہ ان لوگوں کو راہ راست پر چلنے کے لئے آمادہ کر سکے؟ غلامانہ اور ناتربیت یافتہ طبیعتیں جسمانی ہتھیاروں کو یا ظاہری ٹیپ ٹاپ کو سمجھ سکتی ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ ایک گہری عقلی، اخلاقی اور روحانی تحریک بغیر گیروے کپڑے پہنے اور فقیری کا سانگ بنائے بھی چلائی جا سکتی ہے۔"

انہوں نے اس تحریک کو اسی انداز سے چلانے کی کوشش کی لیکن اس میں ان کو

محدود کامیابی ہوئی۔ کیونکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ان میں بعض وہ صفات نہ تھیں جو کامیاب لیڈری کے لئے ضروری ہیں لیکن بے غرض اور بے لاگ خدمت کرنے کے لئے (اگر وہ سچی لیڈری سے کوئی جداگانہ چیز ہے!) سب سے اہم صفت ہے اخلاقی جرأت جو ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ جو قومی لیڈر اور کارکن اپنے فرائض کو ایمان داری کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے وہ ایک محتسب کے انداز میں ان سے باز پرس کرتے تھے لیکن اس میں کبھی نفسانیت کا شائبہ نہ ہوتا تھا۔ ممکن ہے بعض مصلحت پرست لوگ کہیں کہ ان کی یہ خصوصیت خوبی کی حد سے گزر کر ایک عیب بن گئی تھی۔ کیونکہ وہ بغیر نتیجہ کا خیال کئے سچی بات کہتے اور ہر قومی اور جماعتی کمزوری پر بے امان تنقید کرتے تھے لیکن در اصل ان کی کمزوریاں بھی ان کی خوبیوں اور اصول پرستی کا نتیجہ تھیں۔ وہ اس بارے میں بعض اوقات اعتدال اور مصلحت اندیشی سے آگے بڑھ جاتے تھے اور قومی خدمت اور اصلاح کے شوق میں یہ نہ سوچ پاتے تھے کہ ان کی تنقید کا اثر دوسروں پر کیا ہوگا۔ وہ ہر معاملے میں حق پر بہت سختی کے ساتھ زور دیتے تھے اور وقتی مصلحتوں کی بجائے اپنے ضمیر کے تقاضے پر عمل کرتے تھے اور انہیں بڑی سادگی اور معصومیت کے ساتھ اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ لوگ سچی بات کا بُرا کیوں مانتے ہیں! اس بارے میں حکم لگانے سے پہلے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب تنقید کمیاب تھی اور (الا ماشاء اللہ) خوشامد، مصلحت پسندی اور جاہ پرستی کا دور دورہ تھا (اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دور اب ختم ہو چکا؟ بھلا غلامی کی کمائی اتنی جلد کیسے زائل ہو سکتی ہے!) حالت یہ تھی کہ لوگ قوت اور اختیار کے ہر مرکز کے سامنے جھکتے تھے اور ہر ایسے گروہ اور جماعت سے اختلاف کرتے ڈرتے تھے جو ممکن ہے انہیں کسی طرح نقصان پہنچا سکے یا جس سے انہیں کسی فائدہ کی توقع ہو اُن کی موافقت اور مخالفت کا انحصار زیادہ تر ذاتی اغراض پر تھا۔ موافقت کرتے تو اپنی غرض نکالنے کی خاطر، مخالفت کرتے تو ذاتی رنجش یا کدورت کی بنا پر۔ نہ تنقید خالصتہً لوجہ اللہ ہوتی نہ تائید۔ ابن الوقتی کی ایسی آب و ہوا میں راست گوئی اور ذہنی اور اخلاقی جرأت کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے! خواجہ غلام الثقلین عمر بھر کسی بار سوخ

شخص یا بااثر جماعت سے، کسی مفاد مخصوص سے مرعوب نہیں ہوئے۔ انہیں جب کبھی ضرورت ہوئی کھلم کھلا اور بعض اوقات نام بنام امرا اور رؤسا کی فضول خرچی اور عاقبت ناشناسی پر، حکام کی بے حسی پر، مذہبی اجارہ داروں کی ریاکاری پر، مغرب زدہ گروہ کی سطحیت اور مذہب سے ناواقفیت پر سختی کے ساتھ تنقید کی اور ان نیک دوستوں کے مشورے کو بہ ادب نامنظور کیا جو انہیں دانش مندانہ دنیا داری سکھانا چاہتے تھے۔ جب ۱۹۰۳ء میں انہوں نے رسالہ عصر جدید جاری کیا تو اس بارے میں رسالے کی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا تھا:

"ہم یہ وعدہ نہیں کرتے کہ ذاتیات سے بالکل بچیں گے یا قوم اور پبلک کو شیریں حکایات اور خوش آیند مضامین سنا کر لبھائیں گے جب کہ بقول مسیحؑ بھائی کو بھائی سے اور باپ کو بیٹے سے جدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ۔ ۔ پھر بھی ہم اپنے فرض کو تہذیب اور اعتدال سے ادا کریں گے اور جہاں تک ہو سکے گا دوستوں اور غیروں پر نکتہ چینی میں بے تمیزی کو کام میں نہیں لائیں گے۔"

انہوں نے اپنی زندگی کے باقی بارہ[12] سال میں اس تنبیہ اور وعدے دونوں کا حق پوری طرح ادا کیا۔ ارادتاً کسی کی دل آزاری نہیں کی، کسی کی ذات پر بدتمیزی کے ساتھ حملہ نہیں کیا۔ شخصی اعتراض بھی وہ اس صورت میں کرتے تھے جب قومی مفاد کیلئے ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کی بے جا مخالفت اور دریدہ دہنی کا ذکر کرتے وقت اکثر قرآن شریف کی یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ "اور جب تم کسی لغو چیز کے پاس سے گذرو تو کرامت کے ساتھ گذر جاؤ۔" یعنی غلاظت میں اینٹ نہ پھینکو بلکہ اپنی سنجیدگی اور شرافت کو قائم رکھو، سچی بات کہو، سچ پر سختی کے ساتھ قائم رہو لیکن بدزبانی سے پرہیز کرو۔ ان کی نکتہ چینی کی خاص صفت یہ تھی کہ وہ بالکل بے لاگ ہوتی تھی۔ وہ اپنوں اور غیروں کے لئے تنقید کی ایک ہی ترازو استعمال کرتے تھے اور دشمن اور مخالف کی اچھی بات کا اعتراف بھی اسی آمادگی کے ساتھ کرتے

جس طرح اپنی اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی غلطیوں پر تنقید کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مثلاً انہیں نواب محسن الملک سے بہت گہرا اور دلی تعلق تھا لیکن ان کی "بلا کی ذہانت" اور دوسری تمام خوبیوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے صاف صاف یہ بھی لکھا تھا کہ "ان کے کیرکٹر میں کسی ایسی چٹان کا ملنا مشکل تھا جہاں جا کر یہ کہنا ممکن ہو کہ وہ اس سے نہ ہٹیں گے۔ ان کی اور (بہت سے) دوسرے ایشیائی مدبرین کی یہ ایک عام کمزوری ہے اور اسی وجہ سے باوجود دلی محبت کے ان کی اور میری رائے میں عموماً اختلاف رہا۔" انہیں اپنی فطرت دیانت اور سادگی کی وجہ سے اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ لوگ بات کو بات کی حیثیت سے کیوں نہیں پرکھتے۔ رائے قائم کرنے میں کہنے والے کی ذات اور اپنے تعلقات کو کیوں دخل دیتے ہیں۔

"اکثر لوگ یہ غور نہیں کرتے کہ جو خیالات اور باتیں پیش کی جا رہی ہیں وہ اچھی ہیں یا بری صرف یہ بحث کرتے ہیں کہ کہنے والا ہمارا ذاتی مخالف ہے یا مداح! بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ہم نہایت ادب کے ساتھ ان علمائے دین کا ذکر کریں جن کو ہم اپنے یقین میں قوم سے غافل سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ہم نہایت ادب سے ان بزرگان قوم اور لیڈروں کے سامنے سر اطاعت خم کریں جن کی نسبت ہمارا یقین ہے کہ ہمارے خیالات اور اصول اصلاح کا چمکارا ان کے قلب تک پہنچا۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ہم محض اصلاح تمدن سے کام رکھیں۔ علماء اور لیڈروں کے اقوال و افعال سے بحث نہ کریں۔ بعض دوست چاہتے ہیں کہ ہمارے رسالے میں نہ مذہب کا نام ہو نہ "جدید خیالات" کی مخالفت! اس بارے میں ایک نازک بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسان کو کہاں تک نیک مقاصد حاصل کرنے کے لئے آزادی رائے اور تقیہ میں مصالحت کرنی چاہیئے۔ دوسری بحث یہ ہوگی کہ در اصل مصالحت اور دل خوش گفتگو سے صحیح خیالات کی ترقی بھی ممکن ہے یا نہیں۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ شاید سیاسی میدان میں مصالحت اور چال ضروری ہو، لیکن جو تحریک خالص تمدنی اور مذہبی نوعیت کی ہو اس کے لئے ڈپلومیسی (مصلحت طرازی) روحانی انحطاط کی طرف لے جائے گی۔ کامیابی صرف راست بازی سے ممکن ہے۔ میٹھی میٹھی

چکنی چپڑی باتوں سے کام نہیں چلتا۔ نزاع اور اعتراض کے بغیر، صحیح اور سچے اصولوں کو لوگوں کے دماغ میں ڈالنا محال ہے۔"

ہر خلاّق دماغ کو، جو زندگی میں راہیں نکالنا اور اس میں نئی قدروں اور اصولوں کو راہ دینا چاہتا ہے، اکثر اس روح فرسا تنہائی کا احساس ہوتا ہے جو اس کے نصیب میں آتی ہے۔ انہیں اس کا احساس ابتدا سے تھا۔ لیکن وہ اس کو اصول پرستی اور آزادی رائے کی قیمت سمجھ کر قبول کرنے کو تیار تھے۔ "عصر جدید" کی جو تحریک اصلاح انہوں نے چلائی تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے خود لکھا تھا:

"ہماری حالت یہ ہے کہ امیروں کا گروہ ہم سے جدا ہے اور جدا رہے گا کیونکہ ہمارے خیالات آزادی اور مساوات کے حامی ہیں۔ علمائے دین کا گروہ ہم سے جدا ہے اور جدا رہے گا کیونکہ ہم ان کی محدود لغت میں گفتگو نہیں کرتے، نہ ان کی طرف سے سند لے کر کام کرتے ہیں۔ نئی روشنی کے شوقین نوجوان اور پرانے فیشن کے رنگیلے نوجوان ہم سے سخت ناراض ہیں کہ ہم ان کے "لطف زندگی" میں مخل ہوتے ہیں (اور زندگی کا ایک مختلف تصور پیش کرتے ہیں) سنی ابھی ناراض نہیں لیکن ممکن ہے ناراض کر دیے جائیں کہ ہم شیعہ ہیں (یہ پیشین گوئی بھی آگے چل کر پوری ہوئی!) شیعہ ناراض ہیں کہ ہم سنیوں سے بدتر اور زیادہ سخت نکتہ چین ہیں پرانے خیال کے مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہم "نیچری" ہیں اور انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے کسی خفیہ الحاد کی تائید کرتے ہیں . . . . اگر اس تحریک میں ذرا بھی جھوٹ ہوتا تو اس قدر (با اثر) گروہوں کی مخالفت یا سرد مہری کے سامنے یہ ہرگز نہ چلتی۔ لیکن چونکہ ہمیں زید و عمر کی رضامندی منظور نہیں بلکہ قوم کی خاص کر غربا اور بگڑے ہوئے لوگوں کی بہبود مقصود ہے۔ چونکہ ہمیں دنیاوی

وجاہت یا شہرت سے غرض نہیں بلکہ منشائے الہٰی پر چلنے کی آرزو اور کوشش ہے، اس لئے باوجود ان تمام مخالفتوں کے ہمیں پورا یقین اور اطمینان ہے کہ ہماری تحریک مسلمانوں میں زور پکڑے گی۔" اور میری کوئی تائید نہیں مگر خدا کے ساتھ اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اُسی کی طرف پلٹتا ہوں"۔

شاید اس قسم کے الفاظ اگر کوئی دوسرا شخص کہتا تو ان میں انانیت کی جھلک نظر آتی لیکن جو لوگ ان کی افتاد اور مزاج کی خاکساری سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کو کسی قسم کی انانیت چھو کر نہیں گئی تھی اور ان کے بیانوں اور تحریروں میں جو اعتماد اور ادّعا پایا جاتا ہے وہ ان خیالات اور عقائد کے بارے میں ہے جو وہ قوم کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے اور جن کی صداقت پر انہیں پورا ایمان اور جن کی اہمیت کا انہیں پورا احساس تھا۔ وہ اپنی ذات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ اس کو اپنے تصور زندگی اور نظام فکر و عمل کی اشاعت کا ایک معمولی اور ناچیز آلۂ کار سمجھتے تھے اسی طرح ان میں ذہنی خودداری اور اعتماد اور ذاتی انکسار اور بے نفسی کا ایک غیر معمولی امتزاج تھا اور دوسروں پر تنقید کے ساتھ ساتھ احتساب نفس کا مادّہ بھی تھا جو پبلک لیڈروں میں ایک کمیاب چیز ہے۔ انہیں علی الاعلان اپنے رسالہ میں خود پر تنقید کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ چنانچہ عصر جدید کو بند کرتے وقت آخری نمبر میں لکھا تھا:۔

"میں نے اس رسالے میں بڑی بڑی طاقتوں پر جنھوں نے روشن خیالی یا دین داری کے نام سے پبلک پر قبضہ کر رکھا ہے حملہ کیا ہے اور بہت سے دشمن پیدا کئے ہیں۔ بعض جگہ میرے الفاظ بھی سخت ہو گئے ہیں مگر حق کی عدالت میں جو سختی ضروری تھی اس سے کچھ کم ہی سختی برتی ہے . . . . البتہ کہیں کہیں مسامحت اور دنیا لگتی کہنے کی وجہ سے خوشامد بھی اس رسالے میں پائی جائے گی اس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن کوئلوں کی کوٹھری میں کپڑوں کو کلونس سے بچانا بہت مشکل ہے . . . . . یہ کہنا کہ یہ سب

کام محض خالصۃً لوجہ اللہ کیا گیا ہے بے جا خود ستائی ہے۔ یہ کہنا کہ اس کام میں اول اول بسا اوقات محض دوسری قوموں کی تقلید اور شہرت طلبی نہ تھی جھوٹ ہے۔ یہ کہنا کہ اس کام میں پوری طاقت صرف کی گئی بے مزہ مبالغہ ہے۔ یہ کہنا کہ نکتہ چینی اور اعتراض کرنے میں نفسانیت اور ذاتی وجوہ کو میں نے کبھی دخل نہیں دیا فرشتہ صفت ہونے کا دعوی کرنا ہے۔ یہ کہنا کہ مجھ میں خلقی اور خُلقی عیوب نہیں جو اس کام اور ہر بڑے کام میں حارج ہو سکتے ہیں ایک بدیہی بات سے انکار کرنا ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کوئی سطر ایسی نہیں لکھی، کوئی فقرہ نہیں کہا جس کا پڑھنا یا سننا میرے نزدیک ہر زمانے کے لئے مفید نہ ہو۔ اس بات کا مجھ کو یقین ہے کہ میرے خیالات ٹھیک طور پر مستقبل ہی سمجھ سکتا ہے اور اس بات کا مجھ کو دعوی ہے کہ میں نے ان کاموں میں برخلاف اکثر ابنائے زماں کے، اور خاص کر مسلمانوں کے، اب تک اپنی صحت اور اپنے کو مٹا دینے میں بخل نہیں کیا۔"

یہ احساس انہیں ہمیشہ بہت شدت سے رہا کہ ان کا اصلی کام قوم کے پس ماندہ طبقوں کو اٹھانا اور ابھارنا ہے اور اس کام میں انہیں صاحبان ثروت و اختیار کا پورا تعاون حاصل نہ ہو سکے گا۔ بعض اس کی مخالفت کریں گے کیونکہ یہ ان کے اغراض مخصوصہ پر ایک چوٹ ہے۔ بعض اس کی طرف شعوری طور پر بے پروائی برتیں گے بعض زبان سے تائید کریں گے۔ دل اور ہاتھ پاؤں سے ساتھ نہ دیں گے۔ چونکہ مسلمانوں کی سیاست کا عام دھارا اس زمانے میں دوسری طرف بہہ رہا تھا اس لئے انہیں اپنے بہت سے دوستوں سے جن کے ہاتھ میں قیادت کی باگ ڈور تھی بعض امور میں بنیادی اختلاف رہا۔ جس کو وہ ہمیشہ صفائی اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے رہے۔

ملک میں جو عام ذہنی آب و ہوا اس وقت پھیلی ہوئی تھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے تقریباً پچاس سال پہلے اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ قوم میں راست گوئی اور حق پرستی کی جرأت کا فقدان ہے اور لوگ مصلحت اور قوت اور ذاتی اغراض کی ناز برداری کرتے ہیں جو قومی مستقبل کے لئے نہایت سنجیدہ خطرہ ہے۔

"اگر آپ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں ہوتے تو ان کے مفسد ہونے کا فتوے اس وجہ سے دیتے یا نہ دیتے کہ وہ بڑے بڑے علما اور رؤسا کی ہجو کرتے تھے؟ آپ اپنے اصول کے مطابق ایتھنز کے دارالعوام میں سقراط کے قتل کی رائے دیتے یا نہ دیتے؟ آپ ربذہ میں ابوذر غفاری کو جلاوطن کرتے یا نہ کرتے؟ اور اگر آپ ان بزرگوں کی تائید کرتے تو اس اصول کے مطابق ان ناچیز شخصوں کو کیوں مطعون قرار دیتے ہیں جو بڑی قوتوں اور غلط رو لیڈروں، عالموں اور رئیسوں پر اعتراض کرتے ہیں؟ آپ ٹھنڈے دل سے غور کر کے فیصلہ کیجئے کہ آپ واقعاً کس گروہ کا ساتھ دیتے۔ کیا آپ کثرت رائے کا ساتھ نہ دیتے؟ مظلوموں کی اکثریت نہیں بلکہ قابو یافتہ جماعت اور ظالموں کی کثرت رائے کا۔ ہم پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم ارزاں طریقے سے، بغیر کچھ کئے بغیر کچھ دیئے قوم کے لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ اگر قول حق کے کہنے سے آدمی کی بات میں کچھ وقعت اور قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اسی قوت کا نام لیڈری ہے تو یقیناً ہماری کوشش ہے کہ مسلمان پبلک ہماری رائے توجہ اور غور سے سنے اگر یہ کوئی گناہ ہے تو ہم اعتراف گناہ کر کے یہ کہتے ہوئے گذر جائیں گے کہ

مجھ میں ایک عیب بڑا ہے، کہ وفادار ہوں میں
تم میں دو وصف ہیں، بدخو ہو، دل آزار بھی ہو!

میرا خیال ہے کہ ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ روشن اور موثر پہلو ان کی یہی اخلاقی جرأت تھی جس کا انہوں نے بار بار اور مختلف موقعوں پر اظہار کیا۔ اس کی تصدیق ان کے بعض قریبی دوستوں کے تعزیتی مضامین سے ہوتی ہے۔ چنانچہ سید کلب عباس نے اپنے مضمون میں لکھا تھا:

"خواجہ صاحب مرحوم اپنی رائے کے بے حد پکے تھے۔ اس کے ساتھ اخلاقی جرأت

بھی انتہا درجے کی رکھتے تھے ۔ دل میں کبھی بات دبا کر نہ رکھ سکتے تھے ۔ جو کچھ کہنا ہوتا ڈنکے کی چوٹ کہتے تھے، سختی سے کہتے تھے، صفائی سے کہتے تھے ۔ کسی گروہ کے خواہ وہ بے اثر ہو یا با اثر بُرا ماننے کی یا چیں بجبیں ہونے کی پروا نہ کرتے تھے ۔ چونکہ فرض شناسی کا مادہ ان میں بہت تھا اس لئے قوم یا قوم کا کوئی طبقہ اگر اپنے فرائض پورے طور پر انجام نہیں دیتا تھا تو ان کا دل جلتا تھا اور وہ اس کی نکتہ چینی کرتے تھے اور بعض اوقات پوست کندہ حالات ضبط تحریر میں لا کر ان کو اشاعت دیتے تھے ۔ چونکہ زمانہ ظاہرداری اور دنیا سازی کا عادی ہے اس لئے خواجہ صاحب کی نکتہ چینی، جو بلا شک نیک نیتی اور دردِ دل پر مبنی تھی، اس کو کھلتی تھی ۔"

کچھ اسی قسم کا اظہار خیال ان کے ایک دوست سید جالب دہلوی نے کیا تھا ۔

" وہ درحقیقت صداقت کے اظہار میں بے حد بے باک تھے اور کسی مصلحت کے خیال کو اس میں مانع نہ آنے دیتے تھے ۔ ان کی نیت نیک تھی، دل میں قوم کا سچا درد تھا، مظلوموں کی حمایت وہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے اور قوانین شرع و اخلاق کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بہت کم ہمدردی کا مستحق جانتے تھے ۔ انہوں نے اصلاح کے جوش میں عمومیت سے گذر کر خصوصیت پر آ جانے میں تامل نہیں کیا اور نام لے کر یا صریح اشارے کر کے ایسے لوگوں کو لتاڑا جن سے تمدنی پہلو میں کوئی قصور سرزد ہوا تھا ۔ میں نے کئی بار کہا ۔ خواجہ صاحب اپنا لہجہ نرم رکھئے لوگوں کو آہستہ آہستہ راہ راست پر لائیے اور اپنی خیرخواہی پہلے لوگوں کے ذہن نشین کیجئے ۔ لیکن وہاں بے غرضی اور حق کوشی کا جوش تھا .... وہ جن خرابیوں کا استیصال کرنا چاہتے تھے وہ قریباً تمام لوگوں میں موجود تھیں اور ہر ایک خود کو ان کی ملامت کا مورد سمجھتا تھا اور ان کی طرف سے بدمزہ ہو جاتا تھا . . . . . یہ بات برسوں ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ ناصح کی نصیحت اگرچہ خیرخواہی پر مبنی ہوتی ہے لیکن لوگ اُسے بُرا مان جاتے ہیں ۔"

بے شک وہ کبھی کبھی مصلحت کو پس پشت ڈال کر قوم اور ارباب اقتدار کی اخلاقی کمزوریوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے مگر اس کی تہہ میں کسی قسم کی نفس پرستی نہ تھی بلکہ قومی درد اور دل سوزی

کی خلش تھی جوان کو چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی ۔ وہ جس طرح "غیروں" پر تبصرہ اور تنقید کرتے تھے اس سے زیادہ سختی کے ساتھ اپنے نفس پر، اپنے دوستوں پر، اپنی جماعت اور مذہب کے لوگوں پر تنقید کرتے تھے کیونکہ ان کی ذہنی ساخت میں جنبہ داری کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی ۔

اس ضمن میں ان کے بارے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رائے بھی قابل ذکر ہے ۔

"... وہ اس قدر راست باز اور بے لاگ تھے کہ سچ بات کے کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اور اس لئے بعض لوگ اُن سے خوش نہیں رہتے تھے مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے ۔ خود سر سیّد مرحوم اُنہیں محض اُن کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے ۔ مگر اختلاف کرنے میں وہ اُن سے بھی نہ چوکتے تھے ۔ حالانکہ اُن کے سامنے بڑوں بڑوں کے پر جلتے تھے ۔ علی گڑھ کالج میں اُن سے اور غالباً اُن کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات اتنی وسیع ہوں اور جو کام کرنے میں ایسا انتھک ہو ۔ وہ پرلے درجے کے ذہین اور ذکی تھے ۔ وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے اور پالیٹکس اور خصوصاً انگلستان کی سیاسیات سے انہیں ابتدا سے بے انتہا دلچسپی تھی اور جس قدر انھیں اس سے واقفیت تھی ہماری قوم میں شاید ہی کوئی اس قدر واقف ہو ۔ وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے ۔"

انھوں نے کئی سال تک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صیغۂ اصلاح تمدن کے سکرٹیری کی حیثیت سے کام کیا لیکن ۱۹۰۸ء میں جب ان کی عمر مشکل سے ۳۳ سال کی تھی انھوں نے اس عہدے سے استعفےٰ دے دیا ۔ جس کا سبب اپنی مصروفیت اور لوگوں کی بے توجہی سے زیادہ اس بات کا روز افزوں احساس تھا کہ ان میں اور کانفرنس کے سربرآوردہ ممبروں میں بعض ایسے اختلافات ہیں جن کی موجودگی میں وہ ان کی صحیح نیابت نہیں کر سکتے ۔ چنانچہ اس کے بارے میں انھوں نے عصر جدید میں ایک اثر انگیز نوٹ لکھ کر اپنے ارادے کا اعلان کیا تھا ۔

"گذشتہ سال سے میرے خیالات میں ایک انقلاب واقع ہو گیا ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ آپ میں سے ایک گروہ میرے خیال سے متفق نہ ہو، میرا

عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا خوف اور روحانی ترقی تمدنی ترقی اور دنیاوی عروج سے کہیں بالاتر ہیں، اور وہ قوم اور وہ افراد انجام کار تباہی کی طرف جاتے ہیں جو اپنی سعی محض دنیا کے لئے محدود کرتے ہیں۔ اس اصول کی وجہ سے شاید میں نئی روشنی کے اکثر اصحاب کے دائرے سے باہر سمجھا جاؤں گا۔

دوسری طرف ظاہری مذہبیت اور باطنی شقاوت، ریاکاری اور تقویٰ اعمال غیر صالحہ اور ادعائے ایمان کا مرکب نمونہ جو ہمارا مذہبی گروہ عموماً پیش کرتا ہے اس سے بھی مجھے اسی قدر دوری اور اختلاف ہے اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ میرے یہ خیالات، غلط یا صحیح جو کچھ بھی ہیں، وہ میری ہر تقریر یا تحریر میں ظاہر نہ ہوں۔ پس مجھ جیسے داعی کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک دنیادار جماعت کا جو "دیندار" گروہ کو بھی راضی رکھنا چاہتی ہے نمائندہ بنے! (یعنی) ہمدردیاں مختلف خیالات مختلف، غایت نظر مختلف، امیدیں جدا، راستے الگ، ایک طرف تو یہ مفروضہ کہ اس حیات کے بعد کوئی منزل مقصود ہی نہیں، دوسری طرف یہ یقین کہ دنیاوی ترقی بھی قرب الٰہی کے واسطے ہی قابل طلب ہے۔ ایسی صورت میں موافقت کیسے ہو سکتی ہے"

اس نوٹ کا خاتمہ اس نوجوان نے ایک ایسی دعا پر کیا ہے جو اس کی فطرت کی گہرائیوں کو بے نقاب کرتی ہے اور زندگی کے اس تصور پر روشنی ڈالتی ہے جو اس کے حریم قلب میں فروزاں تھا:

"بارالٰہا مجھے مسکینوں کی سی زندگی بسر کرنے کی توفیق دے اور مسکینوں کی سی موت عطا کر اور روز قیامت میرا شمار مسکینوں کے زمرے میں کر"

یہ بات قابل غور ہے کہ جس قوم کے اکثر ارباب قوت و اختیار اور لیڈر دنیاوی عزت وجاہت، دولت اور خطابوں کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور اپنی پبلک حیثیت قائم کرنے کے لئے حکام اور اہل دولت و ثروت کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی فکر میں تھے، جب ہر انجمن کی سرپرستی اور

کانفرنس کی صدارت اور وفد کی قیادت روپیہ کی بڑی بڑی تھیلیوں کو منصبی حیثیت سے نذر کی جاتی تھی، اس وقت اس مرد درویش کے دل کی پکار یہ تھی کہ خدا زندگی اور موت میں اس کا ساتھ مسکینوں کے ساتھ کرے، وہ مسکین جو حضرت مسیح کے الفاظ میں آخرت کی بادشاہت کے حق دار ہیں!

اب تک میں نے ان کی شخصیت اور خیالات کا جو ذکر کیا ہے اور ان کے بنانے میں جن اثرات کی کارفرمائی دکھائی ہے ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی زندگی میں قوت محرکہ مذہب کی تھی۔ اسی پر انہوں نے اپنے تصور حیات کی بنیاد رکھی تھی اور اسی کے سرچشمۂ الہام سے ان مخصوص قدروں کا احترام سیکھا تھا جن کی انھوں نے عمر بھر علم برداری کی۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ان کی سب سے بڑی قومی خدمت کیا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ حالی یا گاندھی یا دوسرے بڑے معلموں اور راہبروں کی طرح انھوں نے اس بات کی مسلسل اور پُرخلوص کوشش کی کہ لوگوں کی توجہ کو غلط اور سطحی قدروں، غلط اصولوں، غلط آدرشوں سے ہٹاکر، خواہ وہ ظاہر میں کتنے ہی دل کش کیوں نہ ہوں ایسے اصولوں اور قدروں کی طرف مائل کریں جو گہری اور پائیدار ہیں اور جن کی مضبوط اور اٹل بنیاد پر انفرادی اور قومی سیرت کی عمارت تیار ہوتی ہے۔ یہ زمانہ ملک بھر میں، اور ایک حد تک علی گڑھ کالج میں بھی، مذہبی تشکیک یا مذہب کی طرف سے بے پروائی کا تھا۔ مغربی تعلیم مسلمانوں میں آہستہ پھیلتی جا رہی تھی اور اس کا ایک اثر یہ ہوتا تھا کہ نئے تعلیم یافتہ نوجوان، جو پہلی دفعہ انگریزی لباس پہنتے، انگریزی کتابیں پڑھتے اور (غلط یا صحیح!) انگریزی میں بات چیت کرنا سیکھتے، وہ ایک طرف تو عوام سے بے تعلق ہو جاتے تھے اور دوسری طرف مذہب اور اہل مذہب سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا تھا "مہذب سوسائٹی" اور جلسوں اور انجمنوں میں مذہب کا ذکر کرنا یا اپنے فکر کا رشتہ مذہب کے ساتھ جوڑنا اور اس کے سوتوں میں آب حیات کی تلاش کرنا بے کار، خلاف شان اور زمانے کے تقاضوں کے خلاف سمجھا جاتا تھا اور سوائے ایک محدود جماعت کے جو اپنی ابتدائی تربیت اور ماحول یا افتاد طبیعت یا صحبت اہل صفا کے فیض کی وجہ سے مذہب سے وابستہ رہی، نئے تعلیم یافتہ طبقے کو بالعموم اس کے ساتھ عقیدت پیدا نہ ہو سکی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ سوٹ بوٹ

اور جبہ و دستار میں، مغربی تعلیم اور مشرقی تہذیب کی پرانی علامتوں اور روایات میں، کلب کی زندگی اور نماز روزے میں ایک ایسا فصل پیدا ہو گیا جو نہ صرف فکر کی سطحیت کا پتہ دیتا تھا بلکہ قوم کی متوازن ترقی کے لئے خطرے کا باعث تھا۔ اس میں قصور صرف نئے تعلیم یافتہ طبقے کا ہی نہ تھا بلکہ قوم میں دوسری طرف وہ لوگ تھے جو روایات اور سطحی مذہبی علامتوں کے پھندے میں گرفتار تھے اور پرانی ڈگر سے ایک قدم بھی ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ وہ مغربی تعلیم و تہذیب اور جدید خیالات میں کسی قسم کی خوبی نہ دیکھ سکتے تھے اور ہر تبدیلی اور فکر کی نئی موج سے خائف تھے۔ خواجہ غلام الثقلین نے اس خلیج کے اوپر، جو بڑھتی جاتی تھی، ایک پل بنانے کی کوشش کی اور اس حقیقت پر زور دیا کہ دین اور دنیا کا، تمدنی اور روحانی ترقی کا جو گہرا رشتہ ہے اس کو سمجھنا قومی ترقی اور فلاح کے لئے ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں انھیں دونوں فریقوں سے اختلاف کرنا پڑا اور وہ کسی جماعت یا حلقے کے ساتھ وابستہ نہ ہو سکے۔ فرداً فرداً بہت سے لوگوں کو ان سے اتفاق تھا اور وہ بھی اپنے اپنے طور پر ان میں سے بعض کی تائید کرتے تھے لیکن انھوں نے جس مربوط اور منظم انداز سے ان خیالات کو ایک مکمل نظام حیات کا جزو بنا کر پیش کیا وہ ایک انوکھی چیز تھی۔ یہ ان کی نظر کی گہرائی اور فکر کی روشنی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے دو چار عام پسند اور "چلتے" خیالات کی تجارت نہیں کی بلکہ "من قماش فروشِ دل صد پارہ خویشم" کہہ کر وہ گراں مایہ اور بسا اوقات نامقبول جنس بیچی، کہ جس کی خریداری کے لئے قوم کا مزاج پوری طرح آمادہ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کو شبہ اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے جو لیڈری کی دکان کو تجارت کے سستے اصولوں پر چلاتے ہیں اور وقتی کامیابی کو اس باسعادت ناکامی پر ترجیح دیتے ہیں جو اصول پرستی کی وجہ سے اٹھانی پڑے شاید اسی لئے ان کو یہ قرآنی آیت بہت محبوب تھی کہ "سمندر کی سطح پر جو جھاگ پیدا ہوتا ہے وہ بہت جلد ضائع ہو جاتا ہے لیکن جو چیزیں انسان کے لئے دراصل نفع بخش ہوتی ہیں وہ قائم اور دائم رہتی ہیں"۔

وہ کون سے اصول تھے جو ان کی نظر میں قومی اور انفرادی زندگی کی سعادت کے لئے لازمی تھے اور جن کی انھوں نے عمر بھر علم برداری کی؟ ۱۹۰۵ء کی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں انھوں نے

ایک زبردست لکچر دیا تھا جس کا عنوان تھا " اسلام کی ضرورت دنیا کو کیا ہے ؟" جس میں انھوں نے ان اصولوں کی تفسیر کی تھی۔ لکچر کے شروع میں انھوں نے زندگی کے تین مختلف نظریوں کی تشریح کی ہے اور اپنا مطلب ایک سرائے کی دل نشین تمثیل دے کر واضح کیا ہے :

" ہم میں ایک گروہ ہے جو اپنی زبان سے ایمان کا دعوی کرتا ہے اور خود کو شریعت کا پیرو ظاہر کرتا ہے مگر اپنی دنیاوی زندگی میں فساد خرابی اور غلط راہ روی میں مصروف ہے۔ وہ اس سرائے میں قیام کرنا چاہتا ہے لیکن کرایہ دے کر نہیں، محنت کر کے نہیں، مالک کے قواعد پر عمل کر کے نہیں۔ بلکہ محض شر اور فساد کے ذریعے سے! نتیجہ یہ ہے کہ جو کچھ گھر سے لایا تھا وہ کھو بیٹھا۔ مالک کو ناراض کیا اور اگلی منزل کھوٹی کر لی۔

دوسرا گروہ اس سرائے کو لغو اور ہیچ سمجھ کر اس کی بیخ کنی میں مصروف ہے اور اصول معاشرت کے خلاف کام کر رہا ہے۔ وہ بھی سرائے میں رہنا، کرایہ دینا، قواعد کی پابندی کرنا نہیں چاہتا۔ اس نے صرف یہ سن رکھا ہے کہ " دنیا ایک پل ہے اس پر مکان نہ بناؤ" مگر وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس سرائے میں رہ کر وہ قوت پیدا ہوگی اور وہ سامان مہیا ہوگا جو آئندہ سفر کے لئے ضروری ہے۔ یہ گروہ بھی دنیا کو خراب اور خود کو ہلاک کرتا ہے۔

تیسرا گروہ سمجھتا ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ برا ہے مگر وہ ان کو راہ راست پر لانے کی سعی نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ بھی ان کے ساتھ تباہ ہوتا ہے کیونکہ جب ساری قوم کی تباہی آتی ہے تو کوئی فرد یا جماعت بچ کر نہیں نکل سکتی۔ آگ ایک وسیع دائرہ بنا کر چیزوں کو جلاتی جاتی ہے۔ اس کے پتنگے خاص خاص نقطوں تک محدود نہیں رہتے۔" اس طرح انھوں نے ان تینوں نظریوں کو مسترد کیا جو بدقسمتی سے عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ یعنی مذہب اور اخلاق کی طرف سے بے اعتنائی، رہبانیت اور دنیا کا ترک اور خود کو سواد اعظم سے بے تعلق کر کے صرف اپنی نجات کی خود غرضانہ کوشش۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام دین اور دنیا کے اٹوٹ رشتے پر زور دیتا ہے اور دونوں میں اخلاق کی یکساں کارفرمائی ہے وہ اجتماعی ذمہ داری کی تعلیم دیتا ہے جو اپنے اور دوسروں کے، یعنی سب کے لئے بھلائی

چاہتی اور اس کے لئے جدوجہد کرتی ہے ۔

ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم لوگ اصطلاحاً تو مسلمان ہیں لیکن حقیقت میں اسلام سے بہت دور ہیں۔ ہم مسلمان ہیں عبادت کے لحاظ سے نہ کہ عبدیت کے لحاظ سے، اعمال ظاہری کے لحاظ سے، نہ کہ نیتوں کے لحاظ سے۔ اسلام کا جو اصل منشا اور مقصد ہے اس کو ہم نے بھلا دیا ہے جس طرح یہودیوں نے اپنی تعلیم کو بھلا دیا تھا۔ وہ شریعت کی ظاہری چیزوں پر عمل کرتے تھے (ان سے زیادہ پابند شریعت کون قوم ہوگی؟) لیکن اس کی باطنی تعلیم پر قائم نہیں تھے۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ وہ قرآن شریف کی، جو اسلام کی ساری تعلیم اور الہام کا سرچشمہ ہے، زبان سے عزت کرتے ہیں لیکن وہ ایسی ہی عزت ہے جیسے بعض لوگ مردہ بزرگوں کی قبر کا طواف کرتے ہیں مگر ان کا کہنا نہیں مانتے! عموماً ہر چھوٹی سے چھوٹی روایت، ہر قومی رسم ورواج، ہر جاہل مولوی اور پیر کا کلام، ہر بڑھیا کا عقیدہ، ہر بچے کی ضد، ہر تعلیم یافتہ کی خام اور نامکمل رائے قرآن کو منسوخ کرنے کے لئے کافی ہے! اور اگر منسوخ کا لفظ سخت سمجھا جائے تو کہنا چاہیئے کہ ان سب چیزوں کو عملاً قرآن پر ترجیح حاصل ہے۔" ان کی حقیقت شناس نظر نے جو ظاہری باتوں سے دھوکا نہ کھاتی تھی دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں نے مذہبی معنویت کو بھلا دیا ہے اور وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کے اصولوں کی پابندی اور ان کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ بعض لحاظ سے دوسری قومیں غیر شعوری طور پر اسلام کے عملی اصولوں کو اپنا کر دنیاوی ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قومیں محنت، کفایت شعاری، عدل اور انفاق کے ذریعے بڑھتی ہیں اور جب ان میں یہ صفات کمزور پڑ جاتی ہیں تو ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان کی مسلسل کوشش یہ تھی کہ یہ صفات مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں رچ جائیں تاکہ وہ تمدنی اعتبار سے دوسری جماعتوں سے پیچھے نہ رہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان "معاملات" میں ایک دیانتدار جماعت بنیں اور روزمرہ کے کاروبار میں سچے، کھرے اور بے لاگ ہوں۔ انہیں یہ فکر اس لئے تھی کہ عام صورت حال اس سے بالکل مختلف تھی۔ بہت سی بُری عادتیں، جھوٹ، وعدہ خلافی، امانت کو امانت نہ سمجھنا، روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں دھوکا دینا، قومی

سیرت کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں۔ اخلاق کو عرف عام میں نمائش، ریا کاری، تکلف اور تصنع کا ہم معنی سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ چیزیں عوام اور خواص ہیں، امیروں اور غریبوں میں، جدید تعلیم یافتہ اور عالمانِ دین سب میں کسی حد تک پائی جاتی تھیں۔ اس صورت حال، کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا۔

"آج کل کے اکثر مسلمان بلکہ ان کے مولوی بھی احکام الٰہی کی تعمیل کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی رسوم اور عبادات کی ظاہری تعمیل کر دیا کریں اور بس۔ معاملات ہیں ایمان داری کو یا تو وہ مذہب کا ضروری جزو نہیں سمجھتے یا تاویلات کے ذریعے بے ایمانی اور بد معاملگی کو جائز کر لیتے ہیں! یا بعض لوگ روزہ نماز وغیرہ کو معاملات کی بد دیانتی کا معاوضہ سمجھ لیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جب روز قیامت نماز اور اعتقادات کا حساب لگایا جائے گا تو ہم بہت فائدے میں رہیں گے اور ہمارے اعمال حسنہ کا پلڑا بھاری رہے گا! یہی حالت دیکھ ایک ظریف شاعر نے ایسے پابندان مذہب کی چھبتی ہوئی ہجو اس طرح کی ہے

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

وہ مذہب اور اس کے اصولوں کو مادی ترقی سے بے تعلق نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک دنیاوی ترقی کے لئے بھی ان اصولوں کا سہارا لینا ضروری تھا لیکن وہ محض مادی ترقی پر قانع نہ تھے انھیں روز روشن کی طرح اس بات کا یقین تھا کہ جیسے انسان کی ترکیب میں جسم اور روح دونوں شامل ہیں اسی طرح اس کی ترقی کے دو پہلو ہیں۔ ایک اصلاح تمدن اور دوسرا روحانی ترقی یا تزکیہ نفس جس کے لئے مسلمان کو اسلام کے سرچشمہ سے الہام اور ہدایت حاصل ہو سکتی ہے۔ خواہ انسان کا عمل بظاہر دنیاوی ترقی یا اصلاح معاشرت کے لئے ہو مگر جب وہ دیانت کے ساتھ کام کرتا ہے اور اخلاق کے اصولوں کا پاس رکھتا ہے تو وہ دنیاوی ترقی اور تزکیہ نفس دونوں کو حاصل کرتا اور منشائے ایزدی کو پورا کرتا ہے لیکن ان کے نزدیک یہ خیال کرنا ٹھیک نہ تھا کہ یہ سب باتیں صرف سیاست مدن کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں۔ نہیں، "جو چیز کام کو عدل قرار دیتی ہے، مستعدی کو تزکیہ سے بدلتی ہے اور حیوانی جذبات کو پاک کرتی ہے یعنی ہمارے مادہ کے ڈھیر کو انسانیت سے

بدلتی ہے وہ فرض کا خیال ہے اور یہ خیال اصل معنی میں صرف خدا ترسی یعنی مذہب سے پیدا ہوتا ہے ان مقاصد کے لئے خدا کو موجود اور محیط علی الکل اور علیم وقدیر جان کر ہم جو کوشش کریں گے وہ بالکل منشائے الٰہی کے موافق ہو گی۔ خدا کا منشا ہی یہ ہے کہ اس کی ذی عقل مخلوق ان تمام اسباب کے ذریعے، جو مہیا کئے گئے ہیں برتر ہوتی چلی جائے اور درجہ کمال تک پہنچے لیکن یہ کمال مادی بھی ہونا چاہیئے اور روحانی بھی۔ دنیاوی ترقی ان اصولوں کی تابع ہے جن کو بحیثیت مجموعی عدل یا میانہ روی سے تعبیر کر سکتے ہیں جو اعتدال محض دنیاوی ہو وہ اکثر نمائشی ہوتا ہے اور بہت جلد زائل ہو جاتا ہے بہت جلد سے میری مراد دو چار سال نہیں۔ بعض اوقات اس میں دو چار صدیاں لگ جاتی ہیں۔ جو وگ مغرب کی مادی ترقی پر فریفتہ ہیں وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ روحانی عنصر کے نہ ہونے سے ان کے نظام میں کیسی خوفناک خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور کسی طرح مثل اور قوموں کے یہ تہذیب بھی تباہی کی طرف جا رہی ہے۔" یہ پیشین گوئی اس وقت کی گئی تھی جب بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ مغرب کی جدید مادی تہذیب، جو سائنس، صنعت وحرفت اور جمہوریت کی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی، ایک ایسی وسیع شاہراہ پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے آگے ہی بڑھنا ہے۔ زوال کا اندیشہ نہیں۔ لیکن زمانے کی رفتار نے اس اندیشے کو سچ کر دکھایا اور اسی کے بطن سے دنیا کی دو سب سے خوفناک جنگیں، فاشزم اور ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم جیسے فتنے پیدا ہوئے! انھیں اس بات کا کامل یقین تھا کہ انسانی تہذیب اپنے عروج کو نہیں پہنچ سکتی جب تک انسان اپنی زندگی کا رشتہ منشائے الٰہی کے ساتھ نہ جوڑے اس شان کے ساتھ کہ "میری عبادت اور میری عادات اور زندگی اور موت سب خدا کے واسطے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے" اور وہ اپنے کو ان تمام نعمتوں کا "امین" نہ سمجھے جو اسے خدا کی طرف سے ملی ہیں۔ یعنی اس کا جسم اور روح، اس کی قوت اور خودداری، اس کی دولت اور اختیار، اس کا دماغ اور اس کی صناعی۔ انھوں نے بار بار اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ بڑی بڑی قدیم تہذیبیں اسی وقت تک پائدار ثابت ہوئیں جب تک ان کا رشتہ عدل اور دوسری بنیادی اخلاقی قدروں کے ساتھ قائم رہا اور یہی خدائی قانون موجودہ تمدن پر بھی لاحق

ہوتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کے بارے میں ان کا رجحان معذرت کانہ تھا جیسا بعض مغربی تعلیم لوگوں کا مذہب کی حمایت کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب دراصل وہی بات کہتا ہے جو سائنس یا فلسفہ کا عصری رجحان ہے (تاکہ ان کی روشن خیالی کے بارے میں شبہ کی گنجائش پیدا نہ ہو!) لیکن خواجہ غلام الثقلین کا عقیدہ یہ تھا کہ بنیادی اخلاقی قدریں اٹل ہیں اور سائنس اور فلسفے کے نظریئے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے زندگی کا اصلی سہارا اخلاق کی حبل المتین ہی ہو سکتی ہے۔ پرانے تمدن اس لئے تباہ ہوئے کہ مادی اغراض کی کشش اور کشمکش نے سچی اخلاقی قدروں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اور اب موجودہ تمدن کی طرف سے انہیں اندیشہ تھا کہ وہی خود غرضی، قوت اور دولت کے لالچ سے مغلوب ہو کر اس نے بھی عدل کے اصولوں کو پس پشت ڈال کر اپنی سائنٹیفک ایجادوں اور وسائل کو انسانی خدمت کے لئے وقف کرنے کی بجائے فنا آفرینی کے واسطے مخصوص کر دیا ہے۔ مادیت نے عیاشی اور نمود کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ اعلیٰ خصائل تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ ہمدردی اور انسانیت کے خیالات پر علانیہ خندہ زنی تو نہیں ہوتی (موجودہ نسل نے تو یہ عبرت ناک انجام بھی دیکھا!)، لیکن ان پر عمل بہت کم کیا جاتا ہے۔ اس لئے باوجود اس تمدن حاضر کے زبردست کارناموں کے اس کے خطرناک نتائج کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ اس نازک وقت میں اسلام کا مخصوص وظیفہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ علم اور قوت اور حکومت کی ترقی کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس پر زور دے اور اس طرح روحانی ترقی کی طرف رہنمائی کرے۔ تاکہ اس حیوانِ ناطق میں اخلاقی شعور کی شمع روشن ہو جائے۔ لیکن یہاں بھی عدل کا اصول مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اسلام رہبانیت کا قائل نہیں۔ ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ دنیا کو ہیچ نہیں ٹھیراتا۔ وہ اِس دنیا میں بھی انسانی بھلائی کا خواستگار ہے اور اُس دنیا میں بھی کیونکہ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ صحیح تمدن وہ ہے جو دونوں کے مطالبوں اور تقاضوں کو تسلیم کرے اور ان کا صحیح مقام معین کرے۔ یعنی عدل کرے، ترازو کی ڈنڈی نہ مارے۔" ان کی جدوجہد دونوں محاذ پر تھی۔ ایک طرف انھوں نے اپنی پوری کوشش، وقت اور روپیہ کو اصلاح تمدن کی تحریک کو پھیلانے کے لئے وقف کر دیا تھا اور دوسری

طرف وہ اپنے فکر کی تمام سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں ہیں، بلکہ سب لوگوں ہیں، سچا مذہبی جذبہ بیدار کرنا چاہتے تھے تاکہ ہماری تہذیب اور تمدن کی بنیاد ریت کی دیواروں پر نہیں بلکہ حق اور انصاف اور انسانیت کے ستونوں پر رکھی جائے۔ اقبال نے ایک شعر میں اپنے خاص انداز میں مذہب کے دو مختلف تصور پیش کئے ہیں۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل　　　یا خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات

اگر ان سے پوچھا جاتا کہ تم ان دونوں تصوروں میں سے کس کے قائل ہو تو وہ شاید اس تضاد کو تسلیم ہی نہ کرتے۔ وہ "وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل" کے قائل تھے کیونکہ وہ مذہب کا آب حیات پلا کر انسانوں میں وہ قوت پیدا کرنا چاہتے تھے جو اس کو زمین و آسمان کی تسخیر کا حوصلہ اور قوت دیتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ "خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات" کے قائل بھی تھے کیونکہ اس تنہائی اور عجز و انکسار کی ذہنی کیفیت میں انسان اپنے بنانے والے کے ساتھ براہ راست تعلق قائم کر سکتا ہے اور اس حالت میں جزو کو کل کی، اضافی کو مطلق کی شان کا خفیف سا جلوہ نظر آتا ہے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ "ملّا کا روایتی مذہب" بہت محدود اور سطحی ہے اور اس کی کنجی سے اسلام کی اصلی معنویت اور اس کے زبردست امکانات تک نہیں پہنچ سکتے۔ انھوں نے اپنے ایک پرمغز فلسفیانہ مضمون میں (خدا کا تعلق انسان کی زندگی سے) لکھا تھا۔

> "عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب کا مقصد خود غرضی ہے یعنی آدمی دوزخ سے بچے یا جنت کا لطف اٹھائے اس لئے وہ خدا کی عبادت یا اطاعت صرف اپنے فائدے کے واسطے کرتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے . . . . دوزخ کا خوف اور جنت کی خواہش دراصل نامکمل اور ضعیف عقلوں کے لئے کارگر ہے۔ جو عرفان کامل رکھتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ خالق کی عبادت اور اطاعت ان کی خلقت کا مقتضا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت علی مرتضیٰ ؑ نے فرمایا تھا کہ "دوزخ کے خوف سے خدا کی اطاعت کرنا غلاموں کی اطاعت ہے

جنّت کے لالچ سے عبادت کرنا تجارت ہے۔ میں خدا کی عبادت اس لئے
کرتا ہوں کہ وہ اس کے لائق ہے .... اور اگر میرے سامنے سے تمام پردے
اٹھا دئے جائیں تب بھی میرے یقین میں اضافہ نہ ہوگا۔"

ان کی آرزو اور کوشش تھی کہ اس عین الیقین کا ہلکا سا پرتو مسلمانوں کی زندگی پر پڑ جائے اور وہ ایک ایسا متوازن اور عادلانہ نظام تمدن قائم کریں اور اپنی انفرادی زندگی کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالیں جس میں دین اور دنیا دونوں کو اپنا صحیح مقام حاصل ہو۔ ان کو یقین تھا کہ "اگر اسلام عقلی اور روحانی لحاظ سے اپنے تئیں اعلیٰ ثابت کرے گا اور اس کے پیرو اپنی زندگی کی بنیاد خوفِ خدا پر رکھیں گے تو وہ غالب ہوگا۔ حق باطل کو ہضم کر جائے گا اور جیسا کہ وعدہ ہے خدا کی روحانی حکومت سچائی اور انصاف پر ختم ہوگی۔"

ان کی مذہبیت میں اعتدال کی شان تھی۔ انھیں اس بات پر اصرار تھا کہ مذہبی بحث میں شرافت اور رواداری کا پورا پاس رکھا جائے۔ جب کبھی وہ دیکھتے کہ کوئی فرقہ یا کوئی گروہ یا مذہب اس بارے میں زیادتی اور دوسروں کی دل آزاری کرتا ہے تو وہ سختی سے اس پر تنقید کرتے تھے لیکن انہوں نے تحریر و تقریر میں، بات چیت میں ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھا کہ کسی کی ذاتی دل آزاری نہ ہونے پائے۔ باوجود عمر بھر پبلک کاموں میں گھرے رہنے اور ہر قسم کے لوگوں کی مخالفت کرنے اور مخالفت سہنے کے انھوں نے کبھی کسی کے لئے سخت اور ناشائستہ لفظ استعمال نہیں کیا، کسی کا نقصان نہیں چاہا۔ عامیانہ مناظرہ بازی کی انھوں نے ہمیشہ علی الاعلان مخالفت کی اور خاص طور پر مسلمانوں کو یاد دلایا کہ وہ اس بزرگ ہستی کے پیرو ہیں جس کی شان میں قرآن شریف نے "خلق عظیم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان کے لئے یہ کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ ایسے نامبارک مناظروں اور اشتعال آمیز تحریروں کی دلدل میں پھنسیں اور دوسروں کی بدزبانی کا ترکی بہ ترکی جواب دیں۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ کسی جماعت کے معبودوں کو بُرا نہ کہو، مبادا کہ وہ عداوت یا جہالت سے تمہارے خدا کو بُرا کہیں۔ اور بہر حال انسانوں کی دل آزاری تو ایک زبردست گناہ ہے....

"یاد رہے کہ اگرچہ زمانہ آزادی کا ہے لیکن تہذیب کا بھی ہے اور ہم کسی طریقے سے نہ قانوناً نہ خلافاً مخالفوں کی بدگوئی کو روک سکتے ہیں۔ جب تک اپنی بدگوئی کو نہ روکیں۔ یہ طوفان بے تیزی جو برپا ہے قانون اس میں عاجز ہے۔ اس لئے جب تک ہم ضبط نفس سے کام نہ لیں گے اور دوسروں کے مذہب کی عزت اور ان کے جذبات کی پاسداری نہ کریں گے ہمیں کیا حق ہے کہ ان سے عمدہ اور شریفانہ سلوک کی توقع رکھیں ؟"

وہ خود عقیدۃً شیعہ تھے۔ لہذا اپنی عادت کے مطابق شیعوں کی غلطیوں پر زیادہ سختی سے تنقید کرتے تھے اور ان لوگوں کی صریحاً مخالفت کرتے تھے جو غلط قسم کی مناظرہ بازی کے ذریعے مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرتے تھے۔ شیعوں کے ایک رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لطیف طنز کے انداز میں لکھا تھا :

"حضرت لقمان کی حکایت میں لکھا ہے کہ خدا نے انسان کو دو تھیلیاں دی تھیں۔ ایک اپنے عیبوں کی جو آگے کی طرف تھی۔ دوسری اوروں کے عیبوں جو پشت پر تھی مگر حضرت انسان نے اس کو پلٹ کر دوسروں کے عیبوں کی تھیلی کو آگے کر لیا اور اپنے عیبوں کی تھیلی پیچھے ڈال لی ! یہی حالت اس رسالے کی ہے۔ بے شک یہ اصلاح چاہتا ہے لیکن فرقہ اثنا عشری کی نہیں، دوسرے فرقوں کی جن میں سے لاکھ میں سے ایک بھی شاید اس رسالے کو نہ پڑھتے ہوں گے۔ وہی پرانے اعتراض جو شیعہ سنیوں پر کیا کرتے تھے ان کو چمکا کر نئی زبان میں پیش کیا جاتا ہے، یا سنیوں کے اعتراض کا جواب ہوتا ہے . . . جب کہ شیعہ روز بروز مفلس، دریوزہ گر اور تباہ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اپنی ناعاقبت اندیشی اور اسراف اور غرور کی وجہ سے جائدادیں اور ریاستیں کھو رہے ہیں اور کھوتے جاتے ہیں تو نجاست مشرکین اور مسح کے مسائل پر اتنا غور اور مباحثہ کرنا کب جائز ہے ؟ . . . . اس فرقہ کے سرگرو

نہ اپنے زوال کو مانتے ہیں نہ اس کے وجوہ پر غور کرتے ہیں، نہ اپنے عادات اور خصائل کو دنیا کی رفتار کے مطابق اور سنجیدہ بتاتے ہیں۔ مگر یہی کام ہیں جو کرنے چاہئیں۔ ورنہ یہ کہنا کہ میں بہت گورا ہوں اور میرے کپڑے بہت اچھے ہیں اور سامنے جو شخص بیٹھا ہے وہ کالا کھونڈا ہے اور برے کپڑے پہنتا ہے کس کو نہیں آتا؟ اور ایسی باتوں سے لوگوں کو خوش کرنا کیا مشکل ہے؟"

کہاں ہیں ایسے لوگ اس زمانے میں جو اس انداز سے اپنی جماعت پر کھلم کھلا تنقید کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ دراصل پوری قوم پر گول گول اعتراض کرنا آسان ہے کیونکہ اس کی چوٹ کسی خاص فرد یا گروہ پر نہیں پڑتی۔ لیکن وضاحت کے ساتھ اپنے خاص فرقے یا جماعت کی کمزوریوں پر ان کو تنبیہ کرنا اور حق کی خاطر جنبہ داری کو مسترد کرنا بڑی اخلاقی جرأت چاہتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی قوم کے کردار کو بہتر بنانے کے لئے سختی کے ساتھ احتساب نفس کی ضرورت ہے۔ ایک ماہر سرجن کی طرح اس کے چھپے اور کھلے ناسوروں کو ٹٹولنے اور اس کی اخلاقی کمزوریوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے بڑی دل سوزی لیکن جرأت کے ساتھ قوم کی کمزوریوں کا مطالعہ کیا تھا اور برسوں کے مشاہدے اور غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "اس وقت ہم پر اس درجہ جہالت، خود غرضی اور بداعمالی طاری ہے کہ جب تک چند برسوں تک ایک سچی اور سادہ زندگی کا تریاق ہمارے جسموں میں نہ ڈالا جائے گا ہم فنا ہو جائیں گے یا کم سے کم تزکیہ باطنی کی منزل تک نہ پہنچ سکیں گے۔" یہ ایک گہری اور بنیادی حقیقت ہے جو آج بھی ہمارے لئے اتنی ہی اہم ہے جتنی اس وقت تھی۔ کسی مذہب یا فلسفہ حیات یا نظام اخلاق کے سچے اور اچھے ہونے کا آخری ثبوت اس کی نظری تعلیم میں نہیں بلکہ اس کے ماننے والوں کی روزمرہ کی زندگی اور عادات و اخلاق میں مل سکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اسلامی اخلاق اور تہذیب کا احیا نظری بحثوں اور فقہی موشگافیوں کے ذریعے نہیں بلکہ مسلمانوں میں "ایک سچی اور سادہ زندگی کا تریاق" ڈال کر کرنا چاہتے تھے اور یہی ان کی اصلاح معاشرت کی تحریک کا حقیقی مفہوم تھا۔

دراصل ان کا مذہب کا تصور بہت بلند تھا اور وہ اس سے بہت اونچی توقعات رکھتے
اور ان کا بے چین دماغ اس فکر میں لگا رہتا تھا کہ مذہب سے جو توقعات جائز طور پر کی جاسکتی ہیں وہ
پوری ہوئیں یا نہیں اور نہیں ہوئیں تو کیوں؟ جس وقت بیش تر مسلمان لیڈر، عالم اور اہل قلم پرانے
سلاطین کی "مدلل مداحی" کر کے یا ماضی کی شان اور شوکت کے افسانے سنا کر قوم کو جھوٹا اطمینان دلانا چاہتے
تھے اور ایک قسم کی احیاء ماضی کی ذہنیت پیدا کر رہے تھے انھوں نے دلوں کو ٹٹولنے والا یہ سوال
اٹھایا کہ "اسلام نے انسانی معیارِ اخلاق کس درجہ بلند کیا ہے اور نہیں کیا تو کیوں!" وہ سطحی
جوابوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتے تھے۔ اسلام کی کامیابی کا یہ ثبوت پیش کرنا کہ مسلمانوں نے بہت سے
ملک فتح کئے یا بہت سے علوم پھیلائے اور کتابیں لکھیں یا صنعت و حرفت کے اعلیٰ نمونے پیدا کئے
ان کے نزدیک ناکافی تھا "مادی قوت سے کم تربیت یافتہ قوموں کو دبا لینا اور ان کی محنت اور
مشقت سے فائدہ اٹھا کر مدتوں شان و شوکت سے زندگی بسر کرنا یا یونانیوں کی کاسہ لیسی کر کے
تیرہ سو برس میں تیس چالیس ہزار نسخوں کا تیار کر لینا انسانی اور اسلامی زندگی کا اعلیٰ ترین اور اصلی
مقصد نہیں ہے"۔ ان کی نظر اوپر کے غلافوں کو چیرتی ہوئی اندر کی حقیقت تک پہنچی اور انھوں نے
صاف صاف بتایا کہ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیم اور خلقت انسانی کے اصل مقصد کو سمجھنے میں
بے پروائی کی ہے اور وہ اصل منزل کو بھول کر بیچ کے مقامات میں کھو گئے ہیں۔ انسانی زندگی
کی ہم آہنگ اور حسین تشکیل کے لئے جو اسلام کا منتہائے مقصود ہے ضرورت اس بات کی
ہے کہ انسان اپنی تمام جسمانی، عقلی اور روحانی قوتوں کا صحیح استعمال کرنا سیکھے۔ یہی صحیح استعمال
'شکر' ہے جس کی بدولت اس کی شخصیت فروغ پاتی ہے اور ان کا غلط استعمال 'کفر' ہے جو افراد
اور قوموں دونوں کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن "صحیح استعمال" بجائے خود ایک تشریح
طلب لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاد و معاش کے مسائل میں، جسمانی، ذہنی اور روحانی
تربیت کے معاملے میں، سماجی اور اقتصادی اصلاح کی جد و جہد میں، فرد اور جماعت کے باہمی حقوق
و فرائض میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں عدل کے تصور کو چراغ راہ بنایا جائے جب تک معاشرت

میں عدل کے اصول کی کارفرمائی نہ ہوگی قوم میں باہمی مخالفت، بدکاری، بے کاری، فضول خرچی، کاہلی کم نہیں ہوگی، نہ سچی اخلاقی اور اسلامی سیرت کی بنیاد پڑے گی۔ اس لئے وہ بنیادی خرابی کی اصلاح کرنا اور بنیادی خوبی کا بیج بونا چاہتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں اپنے ایک لکچر میں انھوں نے اس مسئلے سے بحث کی تھی۔ اس میں قابل غور یہ بات ہے کہ جہاں دوسرے لوگ مقصد کے اتحاد کو تسلیم کرتے ہیں اور فرق محض طریقہ کا بتاتے ہیں۔ انھوں نے جرأت کے ساتھ مقصد کے فرق کو تسلیم کیا ہے۔

"میری تحریک اور دوسری تحریکوں کے راستے میں فرق نہیں بلکہ منتہا میں فرق ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے انگریزی تعلیم پھیلاؤ یا علوم دین کی تعلیم پر زور دو، یا اردو زبان کو ترقی دو اور انجمن مترجمین قائم کرو۔ کوئی محض شادی غمی کی بے جا رسموں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، کوئی مسلمانوں میں مغربی تہذیب پھیلانا چاہتا ہے۔ کوئی عورتوں کی تعلیم پر زور دیتا ہے مگر یہ لوگ ان سب اچھی باتوں کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی جسمانی اور عقلی قوت اور دولت کا صحیح استعمال کریں۔ لیکن صرف اس غرض سے نہیں کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں مثلاً اہل یورپ یا اہل امریکہ یا اہل جاپان کی مادّی ترقی کی معراج پر پہنچ جائیں۔ میں مادی ترقی کو محض ایک وسیلہ روحانی اور عقلی ترقی کا سمجھتا ہوں اور یہی فرق ہے سامی اور یونانی آئیڈیل میں۔ یونانی آئیڈیل مادی ترقی اور حظ نفس کو مقصود بالذات سمجھتا ہے اور بجائے طوبیٰ کے قامتِ یار کو پسند کرتا ہے۔

من وطوبیٰ، وتو و قامتِ یار　　فکر ہر کس بقدر ہمت اوست!

برخلاف اس کے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وَجَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۤءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (اور ہم نے تم کو ایک امت وسط یعنی ایک عادلانہ جماعت بنایا کہ تم تمام انسانوں پر شاہد بنو اور ہمارا رسول تم پر شاہد بنے)، اسلامی تعلیم کا سارا نچوڑ اس فقرے کے اندر موجود ہے قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ یعنی کہہ دو کہ میرے پروردگار

نے مجھے عدالت اور انصاف کا حکم دیا ہے "، اپنے ساتھ انصاف اور دوسروں کے ساتھ انصاف یہی انصاف کا تصور اسلامی تعلیم اور تہذیب کا سب سے گراں مایہ گوہر ہے جس کے بغیر نہ فرد ایک اچھی زندگی تعمیر کرسکتا ہے نہ قوم۔ اس زندگی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے خواجہ غلام الثقلین وقتی طور پر بہت سے پھول اور شگوفے نظر انداز کرنے کے لئے تیار تھے! وہ ملک اور قوم کے سامنے تہذیب و تمدن کا ایک واضح مکمل اور بے لاگ تصور اس طرح پیش کرنا چاہتے تھے کہ اس کے مختلف عناصر کی اضافی اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں کوئی ابہام نہ رہ جائے۔ ان کا فکر روشن تلوار کی دھار کی طرح تیز اور بے امان تھا اور وہ گول مول باتیں کہنے، مصلحت اندیشی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے۔ ہر رنگ کے لوگوں کو خوش کرنے کو صداقت اور جرأت کی توہین سمجھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تہذیب کے جس تصور پر یا اس کے جس خاص رُخ پر زور دیا ہم اس کو ہمہ گیر نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بعض ان جمالی اور جذباتی قدروں کے لئے کوئی خاص جگہ نہ تھی جن کو دوسرے زمانوں اور تہذیبوں میں بہت اہم سمجھا گیا ہے۔ انھیں تاج محل کے حسین دریچوں میں سے ان محنت کش مزدوروں کی محرومیاں بھی نظر آتی تھیں جنھوں نے اس مرمریں خواب کو شکل دی تھی۔ انھیں جاگیر دارانہ تمدن کے تکلفات اور نفاست پسندی میں زوال آمادگی کی علامتیں دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن انھوں نے جان بوجھ کر، سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر یہ راستہ پسند کیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب ہاتف صدا دیتا ہے کہ

نقشِ حق را ہم بہ امرِ حق شکن بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن!

اسی لئے ان کا مسلک ان جزوی اصلاح کرنے والوں سے جدا تھا جو مغربی تعلیم کی اشاعت یا صنعت و حرفت کی ترقی یا اسلاف پرستی یا مذہب کے روایتی تصور کا احیاء چاہتے تھے ان کی پکار یہ تھی کہ مسلمانوں کو ایک عملی اور کفایت شعار قوم بننا چاہیے اور دولت، قوت، وقت غرض ہر چیز کے خرچ میں کفایت سے کام لینا چاہیئے۔ ہماری قوم مفلس ہے، ہمیں بے کار

رہنے یا بزرگوں کی دولت کو غفلت سے صرف کرنے کا حق نہیں ہے ۔ ہم کسی ایسے تمدن کے تابع نہیں ہوسکتے جس کی بنیاد ناعاقبت اندیشی پر ہو۔ مثلاً دولت عباسیہ کا عیش وعشرت، یا محمد شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد کا تمدن جس کی آج بھی ہمارے امرا پیروی کرتے ہیں۔ ہماری مفلسی اجازت نہیں دیتی کہ ہم قدیم ایتھنز یا یونان کی پیروی کرسکیں۔ اس تمدن کا مقصد اعلیٰ یہ تھا کہ انسان حُسن وخوبی اور عقلی زندگی کے شایستہ لطف سے محظوظ ہو۔ اگر یہ خیال ایک جاہل اور مفلس اور بڑی قوم میں پھیل جائے تو وہ اس کو محمد شاہی تمدن کی طرف لے جائے گا۔ یورپ کا تمدن زیادہ تر ایتھنز کا مرہون منت ہے لیکن اس میں زوال سلطنت روما کے زمانے کی نفسیاتی قوتیں بھی زور پکڑتی جاتی ہیں۔ تیسرا تمدنی نظام رہبانیت یا ایک حد تک بدھ مذہب کا ہے یہ طرز خیال شاید بعض لحاظ سے ان سب سے عمدہ ہوتا مگر یہ قابل عمل نہیں۔ .. اس لئے ان تینوں میں سے کوئی بھی ہمارے لئے موزوں نہیں۔ نہ حیوانی عیاشی اور بدمستی، نہ حسن وخوبی اور خوشنما زندگی کی پرستش کہ یہ ان قوموں کو زیبا ہوسکتی ہے جو کافی ذہنی اور مادی ترقی کرچکی ہیں، نہ رہبانیت اور ترک دنیا کا تمدن۔ اب صرف ایک تمدن رہ جاتا ہے جس کی ہلکی سی جھلک قدیم اہل روما کے ابتدائی دور میں ملتی ہے (جس وقت تک غلامی کی لعنت نے ان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کو مسموم نہیں بنایا تھا) یا اس کا جلوہ اسلامی اور قرآنی تمدن میں نظر آتا ہے۔ اس تمدن کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اعتدال اور سادگی کے ساتھ اس دنیا کو برتے۔ اس میں دیانت داری کے ساتھ محنت کرے، عاقبت اندیش بنے اور دنیا کو ایسی ایمان داری اور سلامت روی سے چلائے گویا یہ خود دین ہے ۔"

جس طرح ان کا مذہب کا تصور بہت بلند اور ہمہ گیر تھا۔ اس طرح وہ سیاست کے بارے میں بھی ایک غیر معمولی نظریہ رکھتے تھے ۔ وہ اسے زبانی شورش یا ریزولیوشن پاس کرنے یا حکومت اور مخالف پارٹیوں کو برا کہنے کا مترادف نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کے ذریعے اجتماعی زندگی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آج سے پچاس سال پہلے انہوں نے صاف طور پر لکھدیا تھا کہ "پولیٹکس کو اس امر پر محدود کرنا کہ چند تعلیم یافتہ مسلمان عہدے حاصل کریں بڑی غلطی ہے

کاشتکاروں کی حالت درست کرنا، ملک اور عملۂ عدالت میں رشوت کو کم کرنا، حکام کے مظالم کو روکنا، اہل حرفہ کے لئے وسائل معاش پیدا کرنا، تجارت کو ترقی دینا، عام لوگوں کے حقوق میں اضافہ کرنا، یہ باتیں ہندوستان کے سچے پولٹیکس کا جزو اعظم ہیں۔ پولٹیکس کو کانگریس کی مخالفت پر محدود کرنا بھی سخت غلطی بلکہ خودکشی ہے۔ ہماری پولٹیکس یہ ہونی چاہیئے کہ جو بات ہمارے لئے مضر ہوگی ہم اس پر اعتراض کریں گے۔ جو بات معتدل اور معقول رہ کر ہمارے لئے مفید ہوگی اس کے لئے کوشش کریں گے . . . . اہل حکمت کے نزدیک پولٹیکس یعنی جماعتی خرابیوں کی اصلاح اور انتقال قوت ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب کوئی جماعت دولت اور عقل اور ادراکِ انسانیت میں ترقی کرتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس کی قوت و اقتدار میں ترقی ہو اور حکومت میں اس کی اہمیت بڑھتی رہے۔ اسی طرح تمدنی زوال کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار زائل ہوجاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ مدتوں تک ہمارے سیاسی لیڈروں بالخصوص مسلمانوں نے اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہیں مانا اور وہ بجائے قوم کی تمدنی، اخلاقی اور علمی ترقی پر زور دینے اور اس کے لئے کوشش کرنے کے محض ملازمتوں اور چند حقوق اور رعایتوں کے لئے جدو جہد کرتے رہے اور اسی وجہ سے قوم کی سچی اور پائدار سیاسی ترقی کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ اس ناعاقبت شناسی کا اندازہ ہم نے پچاس سال کے بعد بھگتا اور نہ معلوم کب تک بھگتیں گے۔"

مندرجہ بالا بیان سے ان کی نظر کی گہرائی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس وقت ان کے سامنے قوم کی مکمل سیاسی آزادی کا تصور نہ تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں یہ تصور کسی اور فرد یا جماعت کے سامنے بھی نہ تھا لیکن وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ سیاست میں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش بے کار ہے۔ وہ بہت محنت، صبر اور جان جوکھوں کا کام ہے جس میں عوام کی واہ واہ، تقریروں کی گرم بازاری اور خطیبانہ تحریروں کے نشے کو چھوڑ کر قومی زندگی کے ہر پہلو اور ہر محاذ پر بے تکان کام کرنے کی ضرورت ہے۔ بے شک سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے "انتقال قوت" لازمی ہے لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں قوت اس

وقت تک نہیں آسکتی جب تک وہ اپنی "جماعتی خرابیوں کی اصلاح" نہ کریں، اپنی تعلیم اور دماغی ترقی کی طرف توجہ نہ کریں، اپنی مالی حالت درست نہ کریں اور ان میں "ادراک انسانیت" نہ پیدا ہو یعنی وہ خود غرضی اور ذات پات اور نفس کے بندھنوں سے نکل کر بنیادی انسانی رشتوں کو پہچانیں اور دوسرے انسانوں کے حقوق کا احترام کرنا سیکھیں۔ اس لئے انھوں نے جو سیاسی پروگرام پیش نظر رکھا تھا وہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا اور اس میں سماجی اور اقتصادی اصلاح کا پروگرام نہ صرف شامل تھا بلکہ وہی اس کا "جزو اعظم" تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے کہیں اپنی تحریروں میں "سوشل ڈماکریسی" یا "اکونامک ڈماکریسی" کی اصطلاحیں استعمال کی ہوں لیکن اس کے بارے میں انھوں نے جو خیالات وقتاً فوقتاً خاص کر عصر جدید کے ذریعے ظاہر کئے ان میں یہ تصور واضح طور پر نظر آتا ہے ان کے انتقال کے پندرہ بیس سال بعد مہاتما گاندھی اور دوسرے سمجھدار اور اہل نظر لیڈروں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ سیاسی آزادی بجائے خود کافی نہیں۔ وہ محض ایک ذریعہ ہے عام لوگوں میں سماجی اور اقتصادی آزادی اور خوش حالی پیدا کرنے کا اور اس مقصد کے لئے چن چن کر اور چھانٹ چھانٹ کر ان کی سماجی خرابیوں اور کمزوریوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اس چیز کو خواجہ غلام الثقلین نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا تھا اور اسی وجہ سے مندرجہ بالا بیان میں انھوں نے کاشتکاروں اور صناعوں کی بُری حالت، عوام کے حقوق پر دست برد، حکام کے مظالم، رشوت ستانی، معاشی وسائل کی تنگی کی طرف توجہ دلائی ہے دوسری بات اس ضمن میں قابل غور یہ ہے کہ ان کی سیاست کی بنیاد کسی دوسری جماعت یا گروہ کی مخالفت پر نہیں تھی بلکہ وہ اس بارے میں ایک مثبت اصول رکھتے تھے یعنی جو بات ہمارے لئے مضر ہو گی ہم اس پر اعتراض کریں گے۔ جو بات "معتدل اور معقول رہ کر مفید" (صرف مفید نہیں بلکہ اس کڑی کی شرط کے ساتھ مفید!) ہو گی اس کے لئے کوشش کریں گے خواہ وہ کہیں سے آئے۔ سیاست کے میدان میں "دوست" اور "دشمن" کی اٹل تقسیم کر لینا کہ ہم ہر بات میں فلاں کی مخالفت کریں گے اور فلاں کا ساتھ دیں گے مصلحت اور صداقت دونوں کے منافی

ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اصول یہ ہونا چاہیئے کہ ہم حق کا ساتھ دیں گے اور جو حق کے ساتھ ہوگا وہی ہمارا ساتھی ہوگا۔ دوسروں کی پالیسی اور پروگرام کو پرکھنے کے لئے سب سے اچھی کسوٹی حضرت علی مرتضیٰؑ کا یہ قول ہے "یہ نہ دیکھو کہ کون کہتا ہے، یہ دیکھو کہ کیا کہتا ہے"۔ خواجہ غلام الثقلین کی سیاست کچھ ایسے ہی پرانے، فیشن کے خلاف اصولوں پر قائم تھی!

جنگ عظیم کے شروع ہونے کے سال بھر بعد خواجہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس لئے ان کی آنکھوں نے وہ دورِ عذاب نہیں دیکھا جو ہماری نسل کے حصے میں آیا ہے لیکن قوموں کی چھوٹی موٹی جنگیں بہر حال ہوتی رہیں اور انھوں نے اپنی زندگی میں کئی ایسی جنگوں کے تباہ کن اثرات دیکھے۔ جنگ کے بارے میں بھی وہ ایک واضح رائے رکھتے تھے جو تاریخ کے گہرے اور سنجیدہ مطالعہ پر مبنی تھی۔

انھوں نے ایک موقع پر عصر جدید میں لکھا تھا "مشرق و مغرب میں جو جنگ ہو رہی ہے وہ دراصل اس لڑائی کا سلسلہ ہے جو اب سے پانچ ہزار برس پہلے شروع ہوئی تھی اور اگر انسانوں میں قناعت، انصاف، رحم دلی پیدا نہ ہوئی تو اب سے پانچ ہزار برس بعد بھی دنیا کے مختلف حصوں میں یہ چلتی رہے گی۔ کبھی یہ جنگ صنعت و حرفت کے میدان میں تجارت کے راستے ہوتی ہے اور کبھی تلوار اور بندوق سے۔ جب غیر قوم کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوتی ہے خواہ مالی ہو یا فوجی، اس کی بڑی خوشی کی جاتی ہے۔ جب ایک ہی قوم کے لوگ آپس میں لڑتے ہیں تب عقلمند لوگ ان کو نفرین کرتے ہیں۔ کاش وہ زمانہ آجائے جب ہر قسم کی جنگ کو، خواہ خانہ جنگی ہو یا دوکانداری کی جنگ یا باہر والوں سے لڑائی ہو ہم حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور انسان امن اور محبت کے ساتھ ایک دوسرے کی ترقی کے خواہش مند ہوں۔ لیکن جب تک سرزور قومیں اور سرزور انسان کچل نہ جائیں یہ محبت ممکن نہیں معلوم ہوتی"۔

دراصل بنیادی طور پر یہ مسئلہ انسان کی عزت و احترام اور انسانی محبت کا ہے بقول ان کے "جو قوم انسانوں کی اور نسل انسانی کی عزت نہیں کرتی وہ نہ دنیا میں ترقی کر سکتی ہے نہ

عقبیٰ میں"۔ یعنی نہ مادی لحاظ سے نہ اخلاقی لحاظ سے۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا کہ وہ مادی ترقی کر سکتی ہے لیکن وہ ترقی پائدار نہ ہوگی، ریت کی دیوار ہوگی جس کی تعمیر میں اس کی خرابی کی صورت مضمر ہے۔ خود ہماری آنکھوں نے یہ تماشا دیکھا کہ جرمنی، اٹلی اور دوسری ملوکیت پسند قوموں نے کمزور اور پس ماندہ اقوام پر ظلم اور تصرف کر کے بے اندازہ قوت اور دولت حاصل کی اور معلوم ہوتا تھا وہ مادی اور ذہنی ترقی کی معراج پر جا پہنچی ہیں لیکن وہ خوشگوار منظر ایک سراب تھا۔ ان قوموں نے انسان کی عزت نہیں کی، نسل و رنگ کے امتیاز کو روا رکھا، انصاف کی رسی مضبوط نہیں پکڑی اور محبت کے تقاضوں کو ٹھکرایا۔ وہ اخلاقی زندگی کی کسوٹی پر، خدا کے ترازو پر پوری نہیں اتریں اور انھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس لئے تھوڑی سی مدت میں ہمارے دیکھتے دیکھتے ان کی بداخلاقیاں اور بے انصافیاں ان کی قوت کو گھن کی طرح کھا گئیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو ہر زمانے میں کار فرما رہا ہے اور ہر زمانے میں کار فرما رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی اس قانون کی لاٹھی جلدی وار کرتی ہے کبھی اس میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین کے انتقال کو تقریباً چالیس سال ہو گئے ہیں اور ان کے ذاتی دوستوں اور جاننے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں آپ کو مختصراً اس مرد درویش سے ذاتی حیثیت سے بھی متعارف کرا دوں۔ ان کے عزیز دوست سید کلب عباس صاحب نے اپنے تعزیتی مضمون میں ان کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"چہرہ روشن، ناک نقشہ درست، آنکھوں کی چمک ذہانت پر شاہد، ہونٹوں کی ساخت اور تنگ دہنی متانت اور سنجیدگی پر دال، پیشانی کی فراخی وسعت خلق کا دیباچہ، قد متوسط سے کچھ زیادہ مگر جسم کے لئے موزوں، بدن چھریرا رنگ صاف دھلتا ہوا گندمی، چہرے پر چھوٹی سی خوش نما ڈاڑھی تھی اور جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے اس پر متانت اور وقار کی خاص شان پائی جاتی تھی۔ اکثر لمبا ٹرکش کوٹ یا اچکن پہنتے تھے اور اس کے ساتھ سفید پاجامہ یا ہم رنگ پتلون، سر پر ٹرکی ٹوپی اوڑھتے تھے لیکن اکثر جلوسوں اور خاص موقعوں پر

سبز عمامہ باندھ کر جاتے تھے۔ لباس میں تراش خراش اور فیشن کی طرف توجہ نہ تھی۔ البتہ صفائی کا بہت خیال رہتا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ لباس وضع قطع، اور بود و باش کے معاملہ میں تکلف، تصنع اور شان چھو کر بھی نہ گئی تھی۔"

واقعہ یہ ہے کہ ان میں باوجود اپنی علمی اور اعلیٰ خوبیوں کے ایک خاص سادگی اور معصومیت تھی اور دنیا سازی سے ناواقفیت۔ خود اپنے بارے میں وہ کوئی ادّعانہ رکھتے تھے۔ ہر کسی کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ اور برابری کے انداز میں ملتے تھے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ انہیں خاص طور پر ناپسند تھی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی "بڑا آدمی" ان سے ملنے آتا اور وہ اتفاق سے ایسا کرتا۔ پاجامہ پہنے ہوتے جو کہیں سے پھٹا ہوتا جب باہر جانا چاہتے تو بیوی ٹوکتیں کہ کپڑے بدل کر جایئے۔ وہ کہتے "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ملاقاتی یہ کپڑے دیکھ میرے بارے میں رائے قائم نہ کریں گے۔ اگر تمہیں شبہ ہو تو کسی کو چپکے سے بھیج کر اندازہ کرا لو"۔ اور پھر ہنس کر کہتے "اگر بالفرض وہ ایسا کریں تو مجھے ایسے شخص کی رائے کی پروا نہیں!" مطالعہ کے شوق میں اکثر کھانا بھول جاتے یا بعض وقت ایسا ہوتا کہ کھانا سامنے رکھا ہے کتاب پڑھ رہے ہیں اور اس میں اتنے محو ہیں کہ روٹی کو خالی پلیٹ سے چھو کر کھاتے جاتے ہیں اور کچھ خبر نہیں کہ کیا کھا رہے ہیں! اگر باورچی نے کبھی کھانا بدمزہ پکایا یا پانی کے مزے کا شوربا تیار کر دیا تو وہ اس میں بہت سا نمک اور سادہ مرچ ڈال کر اسے بغیر کسی شکایت کے کھا لیتے۔ اگر مرچیں مسالہ بہت زیادہ ہوتا تو بلا تکلف سالن میں پانی ملا کر (اپنے خیال میں) اس کا مزہ درست کر لیتے۔ غرض ان کی روزمرّہ کی زندگی میں بھی ایک شان درویشی تھی جو مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت ہی کم پائی جاتی تھی۔ جس انسانی ہمدردی کا اظہار وہ قومی اور پبلک کاموں میں کرتے وہی ذاتی تعلقات میں کارفرما تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ ہر ضرورت مند کی مدد کرنے کو تیار رہتے۔ پیشہ وکالت کا اختیار کیا لیکن کبھی دولت جمع کرنے کا خیال نہیں آیا حالانکہ ان میں بہت سی ایسی صلاحیتیں تھیں جو ایک کامیاب وکیل کے لئے ضروری ہیں اور اگر وہ یک سوئی کے ساتھ اس طرف توجہ کرتے تو یقیناً اپنے پیشہ میں اعلیٰ کامیابی حاصل کر سکتے

تھے لیکن جیسا میں نے ذکر کیا ان کا طریقہ یہ تھا کہ اگر مہینے کے پہلے چند روز میں اتنے روپے مل جاتے کہ مہینے بھر کا کام چل جائے، فراغت کے ساتھ نہیں بلکہ غریبانہ انداز میں تو وہ مطمئن ہو جاتے اور باقی دن عدالت میں جانے کی بجائے اپنے قومی کاموں اور تصنیف و تالیف وغیرہ میں منہمک رہتے! کامیابی کا گر سیکھنے کی بجائے انہوں نے زندگی کا سلیقہ سیکھا اور پھول کی سیج پر پل صراط کو ترجیح دی جو تلوار سے تیز اور بال سے باریک بیان کیا جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جب حساب لگانے والا حساب لگائے گا اور ان کے نامۂ اعمال کو ترازو میں تولے گا جس میں رائی برابر نیکی اور رائی برابر بُرائی بھی ظاہر ہو جاتی ہے تو ان کا شمار "محسنین" میں ہوگا۔ ایک ایسے زمانے میں جب مصلحت پرستی کا دور دورہ ہو اور سچائی اور جرأت کی کمی، یہ کہیں بہتر ہے کہ انسان سچائی کے راستے میں غلو کا مرتکب ہو بجائے اس کے کہ ذاتی فائدے کی خاطر زمانے کی غلط روش پر چلے اور سچ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے کیونکہ آخر میں سچ ہی کا بول بالا ہوتا ہے۔ "ہم سچ کو جھوٹ سے ٹکراتے ہیں پس جھوٹ پاش پاش ہو جاتا ہے کیونکہ جھوٹ کو پائداری نہیں۔"

میں نے جا بجا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اپنی پبلک زندگی میں بہت سے افراد اور جماعتوں سے قومی مصالح کی خاطر ٹکر لی اور ان کی مخالفت مول لی لیکن اس سے یہ مطلب نکالنا غلط ہوگا کہ قوم نے ان کے کام اور ان کے اصولوں کی قدر نہیں کی یا بالآخر ان کی گراں مایہ خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص نیک نیتی اور بے نفسی سے کام کرتا ہے اور برسوں، بغیر ستائش کی تمنّا اور صلے کی پروا کے، اسے کرتا رہتا ہے تو دھیرے دھیرے اس کا اثر اور نقش قائم ہو کر رہتا ہے۔ ممکن ہے لوگ کچھ عرصے تک دیانت داری کے ساتھ اختلاف رائے کی وجہ سے یا محض ضد یا تعصب یا نفسانیت کی بنا پر اس کی مخالفت کریں لیکن ان میں سے اکثریت دیر یا سویر، صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور خلوص میں جو کشش اور بے پناہ قوت ہے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ اس سے یہ امید افزا نتیجہ نکلتا ہے کہ

ہماری قوم اور ملک باوجود بہت سی کمزوریوں کے احسان ناشناس نہیں بلکہ ان میں شکر گزاری کا اور اپنے سچے سیوکوں کو پہچاننے کا مادّہ ہے۔ گو قومی خدمت کرنے والوں کو یقیناً بے غرضی کے ساتھ کام کرنا چاہیے لیکن اگر ان میں خلوص اور استقلال ہے تو ان کے کام اور شخصیت دونوں دلوں پر اثر کریں گے رائگاں نہ جائیں گے۔ ان کو قرآن شریف کی ایک آیت بہت محبوب تھی جس کو انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں کئی بار استعمال کیا ہے جس وقت ان کا دم واپسیں تھا انھوں نے فرمائش کی کہ ان کو قرآن شریف پڑھ کر سنایا جائے اور حسنِ اتفاق سمجھئے یا تائیدِ الٰہی کہ جس گھڑی انھوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی تو وہی آیت پڑھی جا رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت ان کی زندگی پر ایک برجستہ تبصرہ ہے:۔ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَہَا سَعْیَہَا وَہُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُہُمْ مَشْکُوْرًا

"اور جو شخص آخرت کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے اور اس کے لئے اپنی پوری کوشش کرتا کرتا ہے اور اس کا ایمان پختہ ہے تو بشارت ہو ایسے لوگوں کو کہ، ان کی سعی مشکور ہو گی"۔

ان کی ذاتی سیرت اور اخلاق پر نظر ڈالتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شیکسپیر کے "جولیس سیزر" میں انٹونی نے بروٹس کے لئے جو لفظ استعمال کئے ہیں وہ بغیر کسی مبالغے کے ان کے بارے میں بھی کہے جا سکتے ہیں:

"اس کی زندگی ایک شریف زندگی تھی اور اس میں عناصر کی ترکیب اس خوبی کے ساتھ کی گئی تھی کہ فطرت ساری دنیا کے سامنے یہ اعلان کر سکتی تھی کہ وہ انسان تھا"۔ انسان بھی اور انسان دوست بھی!

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

شبنم

مُجّی (مسز خواجہ احمد عبّاس)

کہا جاتا ہے کہ دنیا نیک لوگوں کی برکت سے قائم ہے۔ جو صاحب ایمان ہیں ان کا تو عقیدہ ہی یہ ہے لیکن عام لوگ بھی زباں سے اس کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ برکت صرف انہی لوگوں کے دم سے نہیں جو آج زندہ ہیں، اس میں بڑا حصہ ان لوگوں کا ہے جو اپنی برکت روشنی اور خوشبو کی طرح بکھیر کر خود خدا کو پیارے ہو چکے ہیں۔ یہ برکت ایک طرح سے امر اور اٹل ہے۔ نیکی اور شرافت، محبت اور خلوص، خدمت اور دل نوازی کسی انسان کے نحیف اور فانی جسم کی قیدی نہیں۔ ان کا اثر عناصر کی قید کو توڑ کر بھی قائم رہتا ہے اور وہ حُسن، خیر اور صداقت کی میراث کا جزو بن جاتی ہیں جو انسان کی سب سے بڑی دولت ہے۔

میری پیاری عزیزہ "مُجّی" مجتبائی خاتون، مسز خواجہ احمد عباس بھی قدرت کے انہیں شاہکاروں میں تھی۔ اس کا اثر دنیا کے بڑے اور نامور اشخاص کی طرح لاکھوں پر نہیں پڑا لیکن جو کوئی بھی اس کے اثر میں آیا اس کی شخصیت کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ خود مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اس کا اثر کس قدر وسیع اور گہرا تھا، اور کتنے مختلف لوگوں پر پڑا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ کسی نعمت کی پوری قدر اس سے محروم ہو جانے کے بعد ہی ہوتی ہے جب خدا کی نامعلوم مصلحت نے اسے اپنے پاس بلا لیا تو لوگوں کی بات چیت سے، ان کے خطوں سے، ان کی یادوں کی خلش سے، اُن کے آنسوؤں کی تپش سے اندازہ ہوا کہ کیسی کیسی

خوبیوں نے اس کی ذات میں اپنا نشیمن تلاش کیا تھا۔ عزیزوں، دوستوں، سرسری ملاقاتیوں اور مشاہیر کے تعزیت کے خطوں نے اس کی دل نواز شخصیت کے نقوش ابھارے۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو اس سے ایک یا دو ہی مرتبہ ملے تھے اور ایسے بھی جو اس کے زندگی بھر کے ساتھی تھے (اور کیسی مختصر تھی چالیس سے کم کی یہ زندگی!) ہر کسی نے اپنی جگہ پر اور اپنے طور پر یہ محسوس کیا کہ اس میں کوئی غیر معمولی بات تھی جو دل کو اس کی طرف کھینچتی تھی۔ ایک غیر ملکی ادیب نے جو اس سے ایک یا دو مرتبہ ملا تھا، ہمارے مقامی سفیر سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اس خاتون میں ایک غیر ارضی دل کشی کی شان تھی جو میں نے کسی اور عورت میں نہیں دیکھی"۔

ایک مشہور ہندوستانی مدبر نے لکھا "میں نے اور میری بیوی نے اس حادثہ کی خبر بہت دکھ کے ساتھ سنی۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ اس واقعہ کا ہم پر اتنا شدید اثر ہوگا۔ ہماری اس کی ملاقات مقابلتاً مختصر تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری عمر کی دوستی ہو۔ یہ بات شاید ٹھیک ہی ہے کہ دیوتا جس کو چاہتے ہیں اُسے جلدی اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔ اس میں ایک ایسی پاکیزہ روحانی دل کشی تھی جس کا ہماری اس سنگ دل دنیا کے ساتھ کوئی میل نہ معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے لئے اس کی دوستی ایک شرف تھی اور ہمیں یقین ہے کہ ہم ساری عمر اس غم کی خلش محسوس کریں گے"۔

ایک اور غیر ملکی قونصل جنرل نے اس کے شوہر کے نام پیغام تعزیت کو ان لفظوں پر ختم کیا "میں اس غم کی گھڑی میں تمہارے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کرتا ہوں اور اس منکسر مزاج خاتون کی رُوح کے حضور اپنے سر عقیدت کو خاموشی کے ساتھ جھکاتا ہوں"۔

ایک ادیبہ نے اپنی بہت مختصر دوستی کی داستان یوں بیان کی: "پہلی مرتبہ اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ بستر علالت پر تھی اور اٹھ نہ سکتی تھی . . . . اور کچھ وقفہ کے بعد جب میں اس کمرے سے نکلی تو گویا اپنی بڑی بہن کو وہاں چھوڑ آئی تھی جسے میں ہمیشہ سے جانتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے، کہ ایک دل کش، پُرخلوص دردمند ہستی دنیا سے اٹھ گئی جس کے خلوص نے میری زندگی کی پیاس بھڑکائی تھی۔ کاش میں ان سے نہ ملی ہوتی اور یہ ہمیشہ کے لئے کسک بن کر

ساتھ رہنے والی چند یادیں بھی نہ ہوتیں"۔

ایک اور نامور ادیب نے دجو مُجّی اور عباس دونوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں، لکھا کہ "اس ولی صفت خاتون کے اُٹھ جانے سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں اس صدمہ میں تمہیں کیا تسلّی دوں سوائے اس کے کہ موت ہمیں اس حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ ہمیں زندگی کو محبّت اور خدمت میں بسر کرنا چاہیئے"۔

جب تک وہ زندہ رہی بڑی بہادری اور خاموشی سے موت سے لڑتی رہی۔ دل کی موذی بیماری سے جس نے اس کی زندگی کو پر تشنج کر دیا تھا، میں نے کسی کو اس بہادری، خندہ پیشانی اور کرامت کے ساتھ یہ لڑائی لڑتے نہیں دیکھا۔ لوگوں کی انگلی میں پھانس چبھ جاتی ہے تو ان کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ زکام ہو جاتا ہے تو وہ زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ لیکن مُجّی کے لئے مدّت تک چلنا پھرنا بند رہا۔ رات کی نیند اور دن کا چین ایک خواب پریشاں ہو کر رہ گیا۔ زندگی گزارنے کے جو نقشے بنائے تھے، معلّمی کا جو منصوبہ مرتب کیا تھا، امیدوں کے جو پیکر تراشے تھے، سب ناامیدی میں بدل گئے لیکن اس کے مزاج میں تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ شکست کا جذبہ نہیں اُبھرا۔ پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ تمام آزمائشوں میں ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی اور دوسروں میں دلچسپی، ان کی خدمت، ان کے آرام کا خیال، اُن سے محبّت اس کے حریم قلب میں ایک شمع کی طرح روشن رہی۔ خدا کی اس دین نے اس کی دکھوں سے مالامال زندگی کو فروزاں رکھا اور اس کی روشنی دوسروں کی زندگی کو جگمگاتی رہی۔ اس نے ہر قسم کی تکلیفوں اور آزمائشوں میں صبر کی وہ شان دکھائی جو مومنوں اور خدا کے خاص بندوں کا حصّہ ہے۔ اس کی مثال ان بزدل اور کم ہمت لوگوں کے لئے باعث عبرت ہے جو ذرا سی تکلیف میں ہتھیار ڈال دیتے ہیں، جن کو نہ خدا پر بھروسا ہوتا ہے نہ خود پر!

دراصل جب تک ہماری زندگی خود اپنی ذات کے تنگ محور کے گرد گھومتی رہتی ہے اس میں نہ وسعت پیدا ہوتی ہے نہ خود اعتمادی، نہ زندگی کے بڑے بوجھ اٹھانے کی قوت،

نہ اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت

برکوہ و بیاباں پیچ، برباغ وخیاباں پیچ　　برقے کہ بہ خود پیچد، میرد بہ سحاب اندر

جب کوئی شخص خود کو کسی اچھے اور بڑے مقصد کے ساتھ والبتہ کرلیتا ہے تو اس کی زندگی کی چھوٹی سی ندی گویا ایک بڑے سمندر کے ساتھ ہمکنار ہوجاتی ہے۔ بس ایسا ہی کچھ مجّی کا حال تھا۔

کیا چیز تھی جس نے اس کے نحیف اور مختصر جسم کو پہاڑ کا سا عزم اور پھولوں کی سی مسکراہٹ بخشی تھی جسے بیماری بھی نہیں چھین سکی؟ یہ یقین کہ اس کی زندگی کی شمع بجھ جانے سے حسن اور خیر اور صداقت کا کارواں جو صدیوں سے چل رہا ہے رک نہیں جائے گا بلکہ چلتا رہے گا اور اس میں اس کی اپنی زندگی کی دین بھی شامل ہوجائے گی! یہ محض میرا خیال ہی نہیں بلکہ اس کی ساری زندگی اس کی روشن دلیل ہے اور اس کا وہ آخری قول جو احمد عباس نے اپنے تعزیتی مضمون "موت اپنی جیت پہ نازاں نہ ہو" میں نقل کیا ہے۔ عباس نے اس حادثہ سے چند روز قبل دو مضمون بمبئی کے ایک اخبار میں لکھے جن کا عنوان تھا "زندگی کے لئے جنگ" اور ان میں بتایا تھا کہ کس طرح مختلف ملکوں میں ڈاکٹر دل کی بیماری پر فتح پانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، اور انہوں نے کس قدر کامیابی کے ساتھ آپریشن کے ذریعہ بہت سے مریضوں کو موت کے منہ سے نکالا ہے اور کس طرح ایک باکمال ہندوستانی ڈاکٹر نے مجّی کا کامیاب آپریشن کیا۔ آپریشن تو کامیاب ہوگیا تھا لیکن اس کے بعد زندگی کامیاب نہ ہوسکی! موت سے ایک روز پہلے جب نمونیہ کا حملہ ہوچکا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس کا وقت آن پہنچا ہے، زندگی میں اس کی دلچسپی اسی طرح قائم تھی۔ اس نے ان مضمونوں کو فرمائش کر کے سُنا اور "جب میں سُنا چکا تو اس نے، جس نے اصرار کر کے ان مضمونوں کو لکھوایا تھا، اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اس کے چہرے پر ایک خاص سکون اور اطمینان کی کیفیت چھا گئی اور اس نے زیرِ لب کہا، 'اب کوئی مضائقہ نہیں'۔ میں نے پوچھا کس بات کا مضائقہ نہیں؟ اور میرے دل میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید بخار اور

ہذیان کے عالم میں کوئی بے ربط بات کہہ رہی ہے۔شاید اس نے میری آواز میں اس پریشانی اور خوف کی لہر کو محسوس کیا اور کوشش کر کے اپنی آنکھوں کو کھولا۔ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔بولی "اب اگر میں نہ بچوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔میں جانتی ہوں کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے اس کو پڑھ کر لوگوں کو اس طرف زیادہ توجہ ہوگی اور اس طرح دوسروں کی جانیں بچیں گی۔ تمہارا شکریہ!"

یہ آخری بامعنی جملے تھے جو اس کے منہ سے نکلے جب وقت موت اس کو اپنی بھیانک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، اس نے بھی موت کی آنکھوں میں اپنی مسکراتی آنکھیں ڈال کر اُسے دیکھا اور اس سے خوف زدہ نہیں ہوئی۔اس کے دل کی گہرائیوں میں آخری شعوری خیال یہی تھا کہ دوسروں کا بھلا ہو، دوسروں کی زندگی سپھل ہو۔اس کی شمع بجھتی ہے تو بجھ جائے لیکن زندگی کی شمعیں جلتی رہیں۔اس خیال میں نراشا یا ہار کا جذبہ نہ تھا۔رحم طلبی کی جھلک نہ تھی۔بس ایمان کی قوت تھی اور بہادری کی مسکراہٹ۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چوں مرگ آید تبسم برلبِ اوست!

سوچتا ہوں کیا خوبیاں تھیں اس جانہار میں جس نے اس کو اس درجہ ہر دل عزیز بنا دیا تھا ہر قسم کے لوگوں میں؟ اس میں نہ عمر کی قید تھی نہ مذہب کی، نہ دنیاوی حیثیت کی، نہ اُن سیاسی اختلافات کی جو آجکل لوگوں پر جنون کی طرح چھا جاتے ہیں اور روزمرّہ کے تعلقات میں سے شرافت اور شیرینی کو چرا لیتے ہیں۔اس نے ایسے مختلف لوگوں کے دل میں گھر کر لیا تھا جو ایک دوسرے سے بات چیت تک کرنے کے روادار نہ تھے۔میں تو پھر ایک جانب دار گواہ ہوں اس لئے میری شہادت کافی نہیں۔دوسروں کے تعزیتی خط اس معمّہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

"اس میں نہ صرف محبّت اور ہمدردی کا ایک اتھاہ خزانہ تھا بلکہ سمجھداری بھی تھی جس کے بغیر محبت کافی نہیں ہوتی۔محبت سمجھداری کو راستہ دکھاتی ہے اور یہ سمجھداری محبّت کو زندگی کی شمعِ راہ بناتی ہے۔جب یہ روشنی ہاتھ آجائے تو انسان عزیزوں، دوستوں،

بڑوں، چھوٹوں، مخالفوں سب کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرسکتا ہے۔ اسی سمجھداری کا اعجاز تھا کہ ہر قسم کے لوگ اپنے مسائل کو اس کے سامنے پیش کرتے اور خواہ کتنے ہی دل تنگ آتے مطمئن واپس جاتے۔"

اس کی ایک عزیزہ نے اپنے خط میں لکھا کہ "وہ میری بہن تھی اور بھاوج بھی۔ ماں بھی اور بیٹی بھی۔ ماں کی طرح چاہتی، بھاوج اور بہن کی طرح محبت کرتی، بیٹی کی طرح خدمت اور اطاعت کرتی اور ایک ناصح دوست کی طرح نصیحت کرتی اور سمجھاتی تھی۔"

ایک اور عزیز نے لکھا "زندہ تھیں تو میری نظر میں ان کی حیثیت ایک مثالی عورت کی تھی، اب مر کر ایک افسانہ بن گئی ہیں۔ ان کے جاننے والے اپنے بہت سے غموں کو بھول جائیں گے لیکن ان کی یاد دلوں سے محو نہ ہوگی اور ان کا ذکر گفتگو کو گرمائے گا۔ ان کے لئے بھی جو ان سے بخوبی واقف تھے اور وہ بھی جو سرسری طور پر ملے تھے، اُن کا ایک کمال یہ تھا کہ جو ان سے ملتا اسے محسوس ہوتا کہ ان کے دل کے ایوان محبت میں میرے لئے ایک خاص جگہ ہے۔ یقین کیجئے کہ میں خاندان بھر میں جن لوگوں سے اپنی شادی کے بعد ملا، ان میں سب سے زیادہ انہیں نے مجھ کو سمجھا اور میرے قریب ترین عزیزوں کو میرے سمجھنے میں مدد دی۔"

لیکن محض محبت اور سمجھداری ہی کسی شخص کو اس قدر ہر دل عزیز اور حیات بخش نہیں بنا سکتی۔ لوگ اپنے دوستوں میں مختلف چیزیں تلاش کرتے ہیں۔ اکثر لوگوں کی زندگی اداس، بے رنگ، ہاری ہوئی سی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ غیر شعوری یا شعوری طور پر چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے دوستوں کی صحبت میں زندگی کا ولولہ اور جوش، اس سے مقابلہ کرنے کی ہمت، اس سے لطف اٹھانے کی صلاحیت ملے۔ مجی میں یہ چیز غیر معمولی حد تک موجود تھی۔ ذاتی پریشانیاں، بیماری، ماحول کی ناسازگاری، اس کی تیز لو کو کبھی مدھم نہیں کرسکی۔ اس کے کئی دوستوں اور عزیزوں نے اپنے خطوں میں اس غیر معمولی صفت کی طرف اشارہ کیا ہے یہ خط ایسی ذہنی اور جذباتی حالت میں لکھے گئے ہیں جب کوئی ٹھنڈے دل سے اپنے تاثرات

کا تجزیہ نہیں کرسکتا۔ بلکہ غم کی وارفتگی میں جو خیال بھی سب سے پہلے دل پر چوٹ کرتا ہے اسی کو بیان کرتا ہے۔

ایک دوست کا خط: "کیوں ایسی زندگیاں آناً فاناً ہم سے بچھڑ جاتی ہیں جن سے ہم جینے کا حوصلہ پاتے ہیں؟ ...... جو شخص ذہنی اعتبار سے اس قدر صحت مند ہو جس کے دل میں کائنات کی ہر خوبصورت شے سے لطف اندوز ہونے کا ایسا شدید جذبہ ہو، جو بڑے بڑے دکھوں کو ہنس کر جھیل جانے کی صلاحیت رکھتا ہو، جو چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بڑی بڑی مسرتیں حاصل کرسکتا ہو، کیوں ایسے کمیاب انسانوں کو موت بے وقت اپنا نشانہ بنا لیتی ہے؟"

ایک عزیزہ کا خط: "میں نے آج تک ان جیسا آدمی نہیں دیکھا اتنی زندہ دل، زندگی سے اتنی محبت کرنے والی ہستی، جو شدید سے شدید تکلیف میں حرف شکایت زبان پر نہیں لائی، جس نے دوسروں کی بھلائی کے سوا کبھی اور کچھ نہیں کیا، جس نے زندگی سے پیار کیا، جس نے موت سے لڑائی کی اور پہلے مرحلے میں جیت حاصل کی .... کتنی ہمت اور بہادری سے کام لے کر وہ آپریشن کے لئے گئی ہوں گی۔ زندگی کو، اپنی تمام آرزوؤں کو، اپنے تمام جذبات کو، سارے عزیزوں کو اور خود کو خدا حافظ کہا ہوگا۔ اور ساتھ ہی موت کے خلاف اپنی تمام ہمت اور بہادری سے اپنے دل کو تیار کیا ہوگا۔ اور پھر جب آپریشن کے بعد آنکھ کھولی ہوگی تو ایک دفعہ پھر زندہ رہنے کا، اپنا پورا حسن وگداز زندگی کو دینے کا جذبہ ابھرا ہوگا۔ دھیرے دھیرے زندگی نے انہیں تھاما ہوگا۔ دل پر پھاپا رکھا ہوگا اور زندگی کو جنت بنانے کے پروگرام بنائے ہوں گے .... ان کا دل کتنا وسیع تھا۔ کس طرح انہوں نے ساری دنیا کو، سارے دکھوں کو، سب کی خوشیوں کو اس اتھاہ ساگر میں سمیٹ لیا تھا۔ کتنا گداز، کتنی گہرائی تھی ان کی شخصیت میں۔ کیا ان کے کردار کی اسی عظمت نے انہیں ہم سے چھین لیا؟ یعنی ہماری ناہنجار دنیا اس قابل نہ تھی کہ وہ اس میں رہیں؟"

ایک اور عزیزہ کا تاثر "یہ ہوا کیسے؟ ایک بار موت کے منہ سے زندہ نکل کر زندہ

رہنے کی اُمید جگا کر کیسے ہماری مُجّی ہمیشہ کے لئے ہمیں چھوڑ گئیں۔ انہیں تو زندگی سے پیار تھا زندگی کی ہر خوبصورت اور اچھی چیز سے محبّت تھی۔ ہر اچھے مقصد سے، ہر نازک احساس سے ہر خوبصورت شے سے وابستگی ۔ ۔ ۔ ۔ اس جیسی محبّت، ہمدردی، سمجھداری، غرض ہر وہ چیز جس کی انسان ایک دوسرے سے توقع کر سکتا ہے، اب مجھے تو اس طرح کسی اور سے نہیں مل سکتی ۔ ۔ ۔ اس نے اپنی اس مختصر زندگی میں ہر اُس انسان کو کتنا کچھ دیا جس سے وہ کبھی بھی ملیں۔ ان کی اتنی پیاری اور دل کش شخصیت تھی۔ ان کے کردار میں اتنی پاکیزگی اور بلندی، اتنی نرمی، محبت، ہمدردی، گرمی اور رنگارنگی تھی۔ ان کی یاد ہمارے سینوں میں ایک عزیز ترین سرمائے کی طرح محفوظ رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے قلم نے جو چنگاریاں سینکڑوں دلوں میں جگائی تھیں وہ باقی رہیں گی۔"

"وہ دنیا میں تھوڑے دن رہی مگر اس طرح رہی کہ بہت سے دلوں میں اپنی یاد اور بہت سے ذہنوں پر اپنا نقش چھوڑ گئی، گہرا نقش، پیارا نقش، حسین نقش، ایک زندگی کا ماحصل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ اگر سو سال کی عمر ہو تب بھی اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"میں نے یا تو اپنی اماں کے انتقال کے بعد ہر دل پر اتنا گہرا اثر دیکھا تھا، یا آج تیس سال بعد انھیں صفات کی حامل ان کی بھانجی کی جدائی پر لوگوں کی یہ کیفیت دیکھ رہی ہوں۔ مگر یہی چیز دل کو تسلی دیتی ہے کہ ایسی خوبیوں کا حامل انسان کبھی مرتا نہیں۔ وہ ہمارے دل میں، ہماری یاد میں زندہ رہتا ہے اور اُس کی زندگی ایک شمع نور بن کر ہماری رہنمائی کرتی ہے۔"

ایک ادبی انجمن نے اپنی تعزیت کی قرارداد میں اس جذبے کو یوں ظاہر کیا تھا۔

"ایسی ہستی جو اپنے پیچھے بہت سی اچھی یادیں چھوڑ جائے۔ مرنے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتی۔ ہمیں یقین ہے کہ مرحومہ خواجہ صاحب کی نئی تحریروں میں، اُن کے فن میں، ان کی انسانیت دوستی اور حب الوطنی میں نیا جنم لیں گی اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔"

در اصل اس نے محبت، خلوص، بے نفسی کی ایک ایسی مثالی زندگی بسر کی جس کے سامنے ہماری اور اس کے دوسرے دوستوں اور جاننے والوں کی چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں، نفس پرستیاں اور تنگ دلی شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتی ہے اور کم سے کم وقتی طور پر زندگی میں زیادہ معنویت اور وسعت اور بلندی کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی یاد انسانی شرافت کا ایک عَلَم ہے جس کو بلند رکھنا ضروری ہے۔

اور کتنی بے پناہ تھی اس کی مقبولیت۔ خود بھی دیکھا اور دوسروں سے بھی سنا۔ علاج کے لئے روس گئی اور ایک سینی ٹوریم میں داخل ہوئی جہاں کی زبان سے تقریباً اور لوگوں سے بالکل ہی ناواقف تھی۔ کوئی دوسری عورت ہوتی تو داخل ہوتے گھبراتی یا داخل ہونے کے بعد تنہائی اور بے چارگی کے احساس سے مغلوب ہو جاتی اور شاید رحم کے جذبے کو، جس کے صرف کا صحیح مقام دوسروں کی ذات ہے، اپنے پر ضائع کرتی! لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ چند روز میں اس کی دوستی سب مریضوں، نرسوں اور ڈاکٹروں سے ہو گئی تھی۔ چند لفظوں کا حقیر سرمایہ، اشاروں کی زبان اور محبت، انسانیت اور ہمدردی کی کنجی نے دلوں کے دروازے اس کے لئے کھول دیئے، اور ہر عمر اور ہر قسم کے لوگوں نے اس کو ایک عزیز اور مشفق دوست کی حیثیت سے اپنی جماعت میں جگہ دی۔ ایک مریضہ نے کئی سو میل سے اپنے کسی عزیز کو جو ڈاکٹر تھا محض اس لئے بلایا کہ وہ آکر اسے مزید علاج کے بارے میں مشورہ دے۔ وہ سینی ٹوریم سے چلی آئی لیکن ڈاکٹروں، نرسوں اور مریضوں کی دلچسپی اس میں قائم رہی اور وہ ہندوستان میں بھی اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے خط لکھتے رہے ماسکو کے ایک پبلشنگ ہاؤس کے لئے اس نے پشکن کی ایک کتاب کا اُردو ترجمہ کیا تھا "ایوان بیلکن کی کہانیاں" (بڑا سلیس اور دل کش ترجمہ ہے یہ اور بہت زیب طباعت ہے اس کی) اور اس سلسلے میں وہاں کام کرنے والوں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے ایک ہندوستانی آرٹسٹ نے بتایا کہ جب وہ حال میں ماسکو گئے تو اُن سب نے بڑی محبت اور تعلقِ خاطر سے اس کی خیریت پوچھی اور جب انہیں اس حادثے کا علم ہوا تو ہر ایک نے ایک قریبی دوست

اور عزیز کی طرح اس صدمہ کو محسوس کیا۔ اُن پر ایک سناٹے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ انہوں نے اپنا کام کاج بند کر دیا اور دیر تک وہ اسی کا ذکر خیر کرتے رہے۔ کوئی تو غیر معمولی بات تھی اس میں کہ ہر کسی کی قدر شناسی کو جگا دیتی تھی۔

یہ تو دور کی بات ہے۔ خود بمبئی کے ہسپتال میں جب آپریشن کا نازک مرحلہ سر ہو چکا اور وہ صحت کی بحالی کے انتظار میں وہاں ٹکی ہوئی تھی اس کا کمرہ مرجع خلائق تھا۔ ڈاکٹر، نرسیں، دوست، عزیز، اسپتال کی خادمائیں جب ذرا فرصت ہوتی اسی کے کمرے میں جمع ہو جاتیں اور وہ اُن میں، اُن کے کاروبار میں، اُن کے دکھ درد میں، اُن کی خوشیوں میں اس طرح شریک ہوتی گویا وہ ایک مریض کی حیثیت سے وہاں نہیں ہے بلکہ اس نے سماجی اور نفسیاتی فلاح کا ایک مرکز کھول رکھا ہے! جسم تو خدمت کرنے کا اہل نہ تھا لیکن دل اور دماغ زبان اور محبت کے جادو پر کون قفل لگا سکتا ہے۔

یوں تو ہر شریف آدمی کسی کو دکھ یا پریشانی میں دیکھتا ہے تو حتی الامکان اس کی مدد کرتا ہے لیکن اس میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ دوسروں کی تکلیف اور دکھ درد میں خوشی اور آمادگی کے ساتھ شریک ہوتی تھی۔ وہ اپنے راستے سے ہٹ کر ان کا بوجھ بٹانے اور بٹورنے کی کوشش کرتی تھی جیسے وہ کوئی بوجھ نہیں بلکہ ایک اعزاز ہے، ایک شرف ہے جس کے لئے وہ قدرت کی شکرگذار ہے! ایک عزیز سخت بیمار تھا۔ خیال ہوا کہ علاج کے لئے اس کو روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ اپنے سونے کے کڑے فروخت کر کے خاموشی اور معذرت کے ساتھ رقم اس کے پاس پہنچا دی۔ ایک عزیز نے کسی کام کے لئے روپے مانگے کسی طرح گنجائش نہ تھی لیکن ایثار کے سوتے کیسے بند ہو سکتے ہیں؟ ایک قیمتی دوا جس کے استعمال کی ڈاکٹر نے سخت تاکید کی تھی، تیمارداروں کی نظر بچا کر منگانی بند کر دی اور جو روپیہ اس طرح علاج کو جوکھوں میں ڈال کر بچا اُسے چھپا کر بھیج دیا! زندگی میں شاید ہی اس کا کوئی دشمن یا مخالف ہو لیکن حالات نے ایک دفعہ ایسی صورت پیدا کی کہ ایک شخص نے اس کے ساتھ انتہائی برائی اور بدسلوکی کی۔ اس خدا کی

نیک بندی نے نہ صرف ان بدسلوکیوں کو کرامت کے ساتھ جھیلا بلکہ جب اس پر ایک سخت موقع پڑا تو اس کی ان تھک تیمارداری اور خدمت کی اور پیشانی پر بل نہ آنے دیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خدمت کے ڈانڈے عشق سے مل جاتے ہیں۔ عشق صوفیہ کی اصطلاح میں، عشق اقبال کے فکر اور کلام کے آئینہ میں رووہ کلام جس کی وہ انتہائی دلدادہ تھی اور جسے بہت خوش الحانی اور سوز کے ساتھ پڑھتی تھی، وہ عشق جس کے بارے میں کہنے والے نے کہا ہے

عشق کارے است کہ بے آہ وفغاں نیز کنند

اس نے آہ وفغاں کرنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ جسے دے کر، دکھ جھیل کر، خدمت کر کے خوشی ہو وہ آہ وفغاں کیوں کرے؟

اس کو ہر قسم کی ترقی پسند اور صحت مند تحریکوں سے دل چسپی تھی، ادب میں، سیاست میں، سماجی معاملات میں۔ وہ ان میں جہاں تک صحت اجازت دیتی حصہ بھی لیتی تھی۔ لیکن اس تعلق کی وجہ سے کبھی اس میں وہ تعصب اور غلو اور تنگ نظری پیدا نہیں ہوئی جو اکثر یک جہت ترقی پسندوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی ترقی پسندی کا سرچشمہ نہ نفرت تھی نہ فیشن پرستی، نہ دریا کے ساتھ بہاؤ، بلکہ وہ گہری سچّی، ہمہ گیر انسان دوستی جو اس کے رگ وپے میں جاری وساری تھی اور اس کے آخری سانس تک جوان و توانا رہی۔ اسے سچی ترقی پسند تحریکوں سے وابستگی تھی کیونکہ وہ ان کو انسانوں کی زندگی سدھارنے کا، اس میں حُسن اور فراوانی اور عدل پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ وہ ان کو دوسروں کی تذلیل یا سرزنش کا آلہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر گروہ اور ہر خیال کے لوگوں میں مقبول تھی۔ اس کی انسانیت دوسروں کی انسانیت کو جگاتی تھی۔ اس کے حالات اور صحت نے اجازت نہ دی کہ وہ اس قسم کی کسی تحریک میں مسلسل حصہ لے کر اس میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ پیدا کرتی لیکن اس میں اس کی صلاحیت تھی۔ اور اگر حالات موافق ہوتے تو وہ یقیناً اپنا نقش صرف دوستوں اور عزیزوں اور جاننے والوں کے دلوں پر ثبت نہ کرتی بلکہ اپنے دیس کی زندگی پر بھی

اس کی چھاپ ہوتی۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ ہوا۔ قدرت جس کے متعلق شاید براؤننگ نے کہا ہے :-

"وہ جو میں نہ بن سکا۔ وہ جو میں بننا چاہتا تھا، وہی میری قیمت ہے۔ خدا کی نظروں میں جس کے چاک نے میرے برتن کو ڈھالا اور سنوارا۔"

اس لئے نگاہ قدرت میں اس کی قدر کم نہیں ہو سکتی۔

میں نے اوپر خواجہ احمد عباس کے مضمون کا ذکر کیا ہے جو اس نے مجّی کے انتقال پر لکھا تھا۔ اس میں سے یہ اقتباس ایک گہری حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے:

"اب وہ زمین کے چھ فٹ نیچے دائمی نیند سو رہی ہے۔ کیا یہ زندگی کے کھیل کا انجام ہے؟ کیا یہ خاتمہ ہے اس کی نیکی اور شرافت اور نرم دلی کا، اس کی محبت کے اتھاہ خزانوں کا، اس کی سیوا کے بھاؤ اور دینے کی صلاحیت کا، زندگی سے محبت کا؟ ان تمام خوابوں اور منصوبوں کا جو وہ دوسروں کے لئے اور اپنے لئے بُن رہی تھی؛ وہ کتنی بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اپریشن کے بعد جب وہ ایک نارمل زندگی بسر کر سکے گی وہ سفر کرنا اور دنیا دیکھنا چاہتی تھی، ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتی تھی، مزدور عورتوں کے لئے ایک کلچرل مرکز قائم کرنا چاہتی تھی اور بچوں کے لئے ایک کتب خانہ۔ دوسروں کی خوشی اور ارام کے لئے کام کرنا اس کی تمام تجویزوں اور سپنوں کا جزو تھا۔ کیا یہ موت خاتمہ ہے اس کا، اس کی صفات کا۔ ان سب چیزوں کا جو وہ کرنا اور بننا چاہتی تھی؛

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ انسان کی روح کی ماہیت کیا ہے اور اگر روح امر ہے تو میں نہیں جانتا کہ مذہب کی اصطلاح میں "حیات بعد الموت" ہے یا نہیں؛ میں نہیں جانتا کہ انسان مرنے کے بعد دوسری شکلوں میں پیدا ہوتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسانی شخصیت کا جوہر انسان کی روح، اس کی نیکی اور اس کی عقل میں مضمر ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سیدھی سادی شرافت اور نیکی، جس کا یہ

جانہار ایک مکمل نمونہ تھی، زندگی پر ایک نہ مٹنے والا اثر چھوڑتی ہے اور ہر نیک اور اچھے کام سے نیکی اور اچھائی کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ہمیشہ چلتا رہتا ہے کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ہمیں ابتک پوری طرح علم نہیں کہ انسان کا دماغ اور اس کا نفس کس طرح عمل کرتا ہے اور اس کے جذبات کی ساخت کیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ انسانی ذہانت اور ذکاوتِ احساس پر زوال اور موت کے قانون کی کارفرمائی نہیں ہے۔ وہ تو ایک حصہ ہیں (خیر و حق کے) اس وسیع ناپید اکنار سمندر کا، اس لازوال 'انرجی' کا (خواہ اس کو خالق کائنات کے ساتھ نسبت دو یا انسان کے ساتھ) جو علت و معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ بن کر انسان کی زندگی اور اس کے کارناموں پر حاوی ہے۔

"اگر یہ صحیح ہے تو صرف انبیا اور اولیا اور مہاتما ہی نہیں بلکہ ہر فرد بشر، معمولی سے معمولی کاشتکار، ہر غریب بے نفس، گھر کا کام کرنے والی عورت جو اپنی زندگی میں نیکی اور اچھائی کا جلوہ دکھاتی ہے اور جس کی چھوٹ دوسروں کی ذات پر پڑتی ہے وہ امر ہے۔

"نہیں، وہ ہستی جس کو ایک دوست اور ساتھی اور بیوی کی حیثیت سے چاہنے کی سعادت اور خوش بختی مجھے نصیب ہوئی، مر نہیں سکتی۔ وہ زندہ ہے ان سب کی محبت میں جو اس سے محبت کرتے تھے۔ جن کو اس کی نیکی اور شرافت نے زندگی کے ایک بہتر تصور سے آشنا کیا۔ وہ زندہ ہے ان ادبی کاموں میں جو اس نے خود انجام دئے یا جن کو کرنے میں اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ وہ زندہ ہے ان طلبہ کے ذہن اور حافظہ میں جن کو اس نے پڑھایا اور ان سینکڑوں محتاجوں اور دردمندوں کے دل میں جن کی اس نے خاموشی کے ساتھ اور اکثر چھپ کر مدد کی اور خدمت کی۔

"موت اپنی ظاہری جیت پر نازاں نہ ہو، ایک کمزور اور بیمار، شریف اور منکسر مزاج عورت نے تیری بے پناہ اور شر انگیز طاقت کو شکست دے کر دکھایا ہے۔"

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لینا جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر طرف سے جو کچھ مل سکے لیں اور اسے اپنے ذاتی آرام و آسائش یا قوت اور اثر حاصل کرنے کا آلہ بنائیں۔ دوسرے وہ جن کی دل کی گہرائیوں سے یہ آرزو جھلکتی ہے کہ اُن کے پاس جو کچھ ہے وہ دیں،

روپیہ، پیسہ، علم، محبت، خدمت، دل سوزی ہر چیز۔ ان کی خودی کو تسکین حاصل ہوتی ہے دوسروں کی زندگی میں روشنی پہنچا کر، ان کا دکھ درد بٹور کر، ان کے راستے کے کانٹے ہٹا کر۔ اس قسم کے خالص مثالی کردار کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں میں دونوں باتیں ملی جلی ہوتی ہیں۔ وہ لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں لیکن جو لوگ زیادہ لیتے ہیں اور کم دیتے ہیں، اُن میں خود غرضی اور نفس پرستی جڑیں پکڑتی ہے جو دیتے زیادہ اور لیتے کم ہیں ان میں خدمت اور ایثار کا جلوہ پیدا ہوتا ہے۔

مُجیؔ ان لوگوں میں سے تھی جن کو قدرت نے اپنی فیاضی سے دینے کی بے اندازہ صلاحیت بخشی تھی۔ اس نے ساری عمر جہاں تک ممکن ہوا دیا۔ لینے کی حرص کبھی نہ کی اور یہی انسان کی سب سے بڑی سعادت اور فضیلت ہے

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم نادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

بس اتنا ہی یاد رہے کہ شاعر محض یار کی راہ میں حاصل عمر نثار کرنے کی امنگ رکھتا ہے اور اس محبوب ہستی نے ہر کسی کو اس محبت اور یاری کے حلقے میں شامل سمجھا اور اس کی بدولت اپنی زندگی سے خوش گئی۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اس کے وہی دوست اور ملاقاتی خوش نصیب تھے جو اس سے کم ملے تھے اور جن کو شاید اس نقصان کا پوری طرح احساس نہیں، اس خلا کا اندازہ نہیں جو اس کی موت سے پیدا ہو گیا ہے ان کے مقابلے جنھوں نے اس گوہر گراں مایہ کو قریب سے اور عرصے تک دیکھا اور پرکھا اور برتا تھا۔

لیکن سوچتا ہوں کہ نہیں، یہی غم نصیب زیادہ خوش نصیب ہیں "محبت کرنا اور کر کے کھو دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ سرے سے محبت ہی نہ کی ہو۔"

غم کی یہ خلش بڑی دولت ہے اور بڑی نعمت۔

خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود

شعلۂ مستعجل

سیّدہ خاتون

خدا ہی اپنی مصلحتوں کو سمجھتا اور سمجھ سکتا ہے۔ اگر ہمارا یہ عقیدہ نہ ہوتا تو دنیا بعض دفعہ بالکل مہمل اور بے معنی معلوم ہوتی۔ کیا وجہ ہے کہ ایک پھول جس کی خوبصورتی اور رعنائی کے لئے قدرت اپنے بہترین وسائل وقف کرتی ہے کھلتے ہی مرجھا جاتا ہے اور ایک انسان جس کی شخصیت کی تکمیل اور آرائش کے لئے اس نے سالہا سال تک اہتمام کیا ہے عین عالم شباب میں جب اس کی کامرانی کا وقت آتا ہے، ایک شعلہ کی طرح دفعتہً بجھ جاتا ہے۔ قدرت اس قدر فضول خرچ کیوں ہے؟ اسے آرزوؤں اور امیدوں کی شکست میں کیا لطف آتا ہے؟

وہ قدرت کے حسن صنعت کا ایک نادر شاہکار تھی جس میں دل و دماغ کی تمام خوبیوں اور خوبصورتیوں نے اپنا نشیمن تلاش کیا تھا!

آنکھیں اس صورت کو ڈھونڈتی ہیں جو اپنے گھر کا چراغ اور ہر انجمن کے لئے شمع تھی، جو میرے حریم قلب کو فروزاں رکھتی تھی اور جو میری نظروں میں ماہ شب چاردہم سے خوب تر تھی!

دماغ اس نکتہ رس دماغ کو روتا ہے جو بات کو زبان سے نکلنے سے پہلے سمجھ لیتا تھا۔ جس کی خداداد طباعی اور ذہانت ہر مسئلے اور ہر مشکل کو سہل کر دیتی تھی جو بجلی کی سی تیزی اور خوبصورتی کے ساتھ ان نکتوں اور لطائف کو پا لیتا تھا جس پر دوسروں کی بھدّی اور سست رفتار عقل بہت کوشش کے بعد پہنچتی تھی!

اور دل، یہ بے چارہ کس کس چیز کے لئے روئے اور تڑپے اور زمین اور آسمان کو چھانے؟ اس محبت کے لئے جس نے مجھ کو اپنی آغوش میں لے کر مہر مادری کو بھلا دیا تھا؟ اس ہمدردی کے لئے جو اپنی وسعت اور گہرائی میں تمام دنیا کے دکھ درد کو آسودہ کرتی تھی؟ اس ایثار کے لئے جس نے دوسروں کی تکلیف کو ہمیشہ اپنی تکلیف پر مقدم سمجھا اور اپنے آنسوؤں کو ہمیشہ ضبط کیا تاکہ دوسروں کے دل کو ٹھیس نہ لگے؟

یہ دل بے چارہ ان سب چیزوں کے لئے رونا ہے لیکن سب سے زیادہ اس رفاقت اور دوستی کی یاد میں روتا ہے جس کا بیش بہا عطیہ اس نے میری نذر کیا تھا۔ محبت اور ہمدردی اور ایثار تلاش سے مل سکتے ہیں لیکن مکمل رفاقت اور دوستی ایسی نعمت ہے جو انسان کو بہت کم نصیب ہوتی ہے!

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں!

میں نے بیس سال تک اس مجسمۂ حُسن و خوبی کو بڑھتے اور نشو و نما پاتے دیکھا۔ اور ہر سال، ہر مہینہ، ہر روز نئی نئی دل فریبیاں اور خوبیاں اس کی ذات تلاش کرتی ہوئی آتی تھیں اور سازگار ماحول پاکر وہاں بس جاتی تھیں۔ اس کا دماغ دن بدن زیادہ روشن اور رسا ہوتا جاتا تھا اور اس کا دل محبت اور ہمدردی کی گھلاوٹ سے لبریز۔ اس کی گفتگو دنیا میں شیرینی کو زیادہ کرتی تھی۔ اس کا تبسم سورج کی کرن کی طرح دل سے رنج اور پریشانی کو دور کرتا تھا . . . . اور میں فخر اور ناز کے ساتھ اس پھول کو کھلتے ہوئے دیکھتا تھا۔ کیونکہ میں خیال کرتا تھا کہ اس کی تشکیل اور حسن آفرینی میں صانع حقیقی کے ساتھ ساتھ شاید میں بھی تھوڑا سا شریک ہوں!

اس کی شخصیت میں ایک سحر تھا جس سے ہر شخص متاثر ہوتا تھا۔ اس کا اخلاق دلوں کو موہ لیتا تھا اس کی شیریں کلامی غصہ اور مخالفت اور ضد سے ہتھیار رکھا لیتی تھی۔ اس کا اطمینان اور بردباری دوسروں کی بے چینی اور بے صبری اور جلد بازی کو شرماتی تھی۔ لوگوں کی باہمی رنجش اور عداوت کو دور کرنے اور فکر و اندوہ کی پیشانی سے سلوٹوں کو صاف کرنے کے

لئے اس کے پاس ایک ایسا جادو تھا جس کا راز میں پوری طرح کبھی نہ پا سکا۔ بچے اپنی شرارت اور ضد کی وجہ سے دوسروں کے لئے وبال جان ہوتے تھے۔ اس کی محبت اور ہمدردی اور سمجھداری ان کو ذرا سی دیر میں مسخر کر لیتی تھی۔ نوکرانیاں جو بعض دفعہ اپنی جہالت یا خراب ماحول کے اثر سے تمیز اور شرافت سے عاری ہوتیں اس کے فیضان صحبت سے انسان بن جاتیں اور اس کے اشارہ ابرو پر کام کرتیں۔ اس چھوٹی سی عمر میں وہ ان کو نہ صرف بہتر خدمت گار بلکہ بہتر انسان بنا دیتی تھی۔

مگر سب سے زیادہ اثر آفریں اس کا اپنا عمل اور نمونہ تھا جو ہر شخص کو آہستہ آہستہ بغیر کسی کوشش یا احساس کے ایک بہتر اور خوب تر زندگی کی جھلک دکھاتا تھا۔ میں تعجب کرتا تھا کہ اس قدر نوعمری میں اس نے کس طرح اپنے دامن میں اس قدر جواہر جمع کر لئے ہیں کہ وہ ان کو اپنے چاروں طرف نہایت استغنا کے ساتھ تقسیم کرتی ہے اور ہر شخص جس کو اس سے کچھ بھی سابقہ پڑتا ہے اپنی صلاحیت کے موافق مالا مال ہو جاتا ہے۔

اس کی شخصیت میں ایک ایسی ہم آہنگی اور موزونی تھی جو صرف آرٹ کے شاہکاروں کے حصہ میں آتی ہے۔ اس کی تمام قوتوں نے اس طرح تناسب کے ساتھ نشوونما پائی تھی جس طرح گلاب کی پنکھڑیاں اپنی ترتیب اور موزونیت سے ایک دوسرے کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں اور پھول میں دل فریبی اور حسن پیدا کرتی ہیں۔ اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ میں نے اس عمر میں کسی کا مطالعہ اس قدر وسیع نہیں پایا۔ لیکن اس کے ادبی مذاق میں وسعت اور ہمہ گیری تھی۔ جہاں وہ ادب لطیف کے بہترین نمونوں اور افسانوں سے لطف اٹھاتی تھی وہاں تاریخ اور سوانح اور سفرنامے بھی اس کو مرغوب تھے۔ شعر کو سمجھنے اور پرکھنے کا ملکہ اس کو فطرت سے ملا تھا اور وہ نہایت آزادی اور جدت خیال کے ساتھ شاعروں کے کلام پر تنقید کرتی تھی۔ مذہبی ادب کی بیشتر معقول کتابیں اس نے اچھی طرح پڑھی اور سمجھی تھیں لیکن اس تمام مطالعہ نے اس کی طبیعت میں خشکی پیدا نہیں کی۔ اس کی گفتگو کی شگفتگی کو آزردہ نہیں کیا۔ اس کی بات چیت

"علمیت" سے پاک تھی لیکن جب کبھی وہ اپنی گفتگو میں کوئی ادبی حوالہ دیتی یا شعر پڑھتی (اس کو بے شمار شعر یاد تھے) تو وہ اتنا موزوں اور برجستہ ہوتا کہ سیدھا دل میں اتر جاتا۔ اس کی گفتگو میں شوخی تھی۔ اور وہ لوگوں کی عادات اور حرکات کا خاکہ چند جیتے جاگتے لفظوں میں کھینچ کر رکھ دیتی تھی۔ میری زندگی کی سب سے پرمسرت گھڑیاں وہ ہوتی تھیں جب میں دن بھر کے کام کاج اور مشاغل سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ باتیں کرتا۔ اس دن جو واقعات اور ناگوار یا دلچسپ باتیں پیش آتیں اس کو سناتا اور وہ اپنے دل فریب انداز میں ان پر تبصرہ کرتی۔ ان کی سختی اور تلخی کو دھیما کرتی۔ ان کے مضحک پہلو کو سمجھاتی۔ خود ہنستی اور مجھ کو ہنساتی اور اس کی آنکھوں کی گہرائی میں سے اس کی محبت ہر وقت یہ دیکھتی رہتی کہ کوئی چیز میرے دل کو غمگین نہ کرے! اس پر مہر نگاہ کی دل جوئی کی خواہش زندگی کی بہترین نعمت تھی اور دنیا کا کون سا غم تھا جس کی تاریکی کو محبت کی یہ کرن دور نہ کر دیتی ہو؟ اور اب میرا سرمایہ ان سب باتوں کی یاد ہے اور اس درد کی کسک جو دنیا کے ہر راحت و آرام سے کہیں زیادہ عزیز ہے!۔

میں جب کوئی اچھی کتاب یا رسالہ یا مضمون پڑھتا تو سب سے پہلا خیال میرے دل میں یہ پیدا ہوتا کہ میں اس کو اپنی بہن کیلئے لے جاؤں گا اور اس کے ساتھ مل کر پڑھوں گا۔ اس طرح مل کر پڑھنے سے کتاب کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ میں الفاظ اور خیالات کی ان مشکلات کو حل کرتا جو اسے پیش آتیں اور اس کا شگفتہ اور تازہ دماغ میرے لئے بہت سے ایسے لطائف اور معانی کو روشن کرتا جن کی طرف میرا ذہن منتقل نہ ہوا تھا۔

اس کا دل بے حد نرم اور رقیق تھا اور دوسروں کی ذراسی تکلیف اس کو بے چین کر دیتی تھی۔ لیکن دل کی یہ نرمی کبھی اس کے دماغ یا قوت عمل کو معطل نہیں کرتی تھی۔ بارہا دیکھا کہ اچانک کوئی ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ اور سب لوگ خوف یا غم کی وجہ سے ہراساں ہو گئے ہیں لیکن اس کا دماغی سکون متزلزل نہیں ہوا۔ دل کی چوٹ اور بے قراری اور دھڑکن کو اپنی قوت ارادی سے دبا کر وہ فوراً ان تدبیروں کو اختیار کرتی جن سے خوف یا خطرہ دور ہو جائے

وہ ایک فرشتۂ رحمت تھی جو نہ صرف اپنی محبت اور ہمدردی سے دکھے ہوئے دلوں کا مرہم بن جاتی تھی بلکہ اپنے حسن انتظام سے بدنظمی میں نظم اور بدحواسی میں اطمینان پیدا کر دیتی تھی۔

دماغی، طباعی اور ادبی مشاغل نے اس کو ان کمالات سے بے نیاز نہیں کیا جو عورتوں کا زیور ہیں۔ امور خانہ داری کی انجام دہی میں اس کی ذہانت اس کی سبکدستی کے ساتھ شامل ہو کر مشکل سے مشکل کام کو آسان کر دیتی تھی۔ اس کو کسی کام کے کرنے سے عار نہ تھا وہ ہر کام کو عزت اور رحمت کہتی اور اس کو ایسی خندہ پیشانی سے کرتی کہ دیکھنے والوں کو اس کی زحمت اور ناگواری کا اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتی تھی اس پر اپنے حُسن طبیعت کا پرتو ڈالتی اور اس کو سنوار دیتی۔ ہر قسم کی دستکاری میں اس کو مہارت تھی خواہ وہ سوئی سے کام کرتی ہو یا کوئی چیز بنتی ہو یا کپڑوں پر نقش و نگار بناتی ہو یا پھولوں کا گلدستہ سنوارتی ہو، اس کی لانبی خوبصورت انگلیاں ہر قسم کے سامان میں نہایت آسانی اور روانی کے ساتھ حُسن اور ترتیب پیدا کرتی چلی جاتیں . . . . اس کا خط اس قدر پاکیزہ تھا کہ دیکھنے والے تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

لکھنے میں وہ ایک خاص دل کش انداز کی مالک تھی، اس کے خطوط اس قدر دل چسپ اور جیتے جاگتے ہوتے تھے کہ ان کو بار بار پڑھ کر بھی طبیعت کو سیری نہ ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی شخصیت کے مخصوص جوہروں کو اپنی محبت اور سنجیدگی اور شوخی کو ان میں پرو رہی ہے۔

اس کی مطبوعہ ادبی یادگار صرف ایک کتاب "خادمات خلق" ہے جو ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں مختلف ملکوں کی ان نیک اور شریف خواتین کے حالات ہیں جنھوں نے اپنے کارناموں سے نوع انسانی کی تاریخ اور اس کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ اس کی عملی یادگار پانی پت میں ایک چھوٹا سا دستکاری اسکول تھا جس کا نام اس کے بعد "سیدہ خاتون صنعتی اسکول" رکھا گیا تھا اور جس کو اس کی عزیز بہنوں نے اپنی ہم وطن لڑکیوں اور عورتوں کی خاطر برسوں تک چلایا۔ لیکن اس کی ذاتی یادگار وہ بے شمار نیکیاں اور شرافت، محبت اور خدمت کے نقش ہیں جو اس نے اپنے سب عزیزوں اور دوستوں کے دل اور دماغ پر چھوڑے ہیں اور جن کو وہ اپنی عزیز ترین دولت شمار کرتے ہیں۔

میری عزیزاو زجواں مرگ بہن سیدہ خاتون نے اس دکھ بھری دنیا میں صرف بائیس سال گزارے۔ بائیس سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ ایک "شعلہ مستعجل" جو چمکا اور پل بھر میں بجھ گیا! لیکن اس کی دل کش اور غیر معمولی شخصیت کا مجھ پر اس قدر گہرا اثر ہے کہ آج تیس سال کے بعد بھی وہ جیتی جاگتی میرے دل میں ایک چراغ کی طرح روشن ہے۔

وہ پانی پت کے ایک قدیم اور شریف گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کی تربیت بچپن ہی سے ایسے اثرات میں ہوئی جنھوں نے اس کی فطری شرافت اور قدرتی صلاحیتوں کو خوب جلا دی۔ اس کے والد خواجہ غلام الثقلین ایک مشہور قومی کارکن، مصنف اور مصلح تھے۔ اس کی والدہ مولانا حالی کی پوتی تھیں۔ اس کے تخلیقی ماحول میں علاوہ اس کے والدین کے مولانا حالی، ان کے نیک نام فرزند خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین (انسپکٹر جنرل تعلیمات صوبہ سرحد) اور اس کے نامور چچا خواجہ غلام الحسنین اور خواجہ غلام السبطین شامل تھے جن کی زندگی اور کردار کی بلندی اس کی تربیت کیلئے بہترین گہوارہ ثابت ہوئی۔ ان سب بزرگوں کو اس بچی سے ایک خاص انس تھا۔ وہ بھی فطری ذہانت اور طباعی کی وجہ سے ان کو اپنی طرف کھینچتی اور ان کی باتوں اور مثال سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ اس کے والد کا انتقال تو اس کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اس لئے انہیں اس کی باقاعدہ تعلیم میں حصہ لینے کا زیادہ موقع نہیں ملا گو ان کی گفتگو، ان کی محبت، ان کی معصومانہ شرافت بجائے خود ایک سرچشمہ فیض تھی جس کا اثر غیر محسوس طور پر بھی ہوتا تھا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد جب وہ اس قابل ہوئی اس نے ان کی تصانیف، خاص طور پر "عصر جدید" کی جلدوں کا غور سے مطالعہ کیا۔ (یہ ایک ماہوار اور بعد میں ہفتہ وار رسالہ تھا جو وہ نکالتے تھے) اور اس طرح اس کو، ان کے خیالات سے، ان کے قومی درد سے، تعمیر ملت کے اس عظیم الشان پروگرام سے اچھی خاصی واقفیت ہو گئی تھی جو ان کے پیش نظر تھا اور جس کو ان کی بے وقت موت نے پورا نہ ہونے دیا۔ اس کی تربیت میں اس کے چچاؤں کو بھی بڑا دخل تھا۔ خواجہ غلام الحسنین بچوں کی تربیت، خصوصاً مذہبی تربیت میں غیر معمولی نظر

اور دل چسپی رکھتے تھے۔ اس کی طبیعت کے بنانے اور اس میں دین داری اور دیانت داری کو پختہ کرنے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ اس کے دوسرے چچا خواجہ غلام السبطین ایک بہت پختہ اور با اصول سیرت کے مالک تھے اور اپنے ہر قول اور فعل میں صداقت، اصول پرستی، دیانت داری، محنت اور جفاکشی کی قدروں پر زور دیتے تھے۔ ہم سب بھائی بہنوں اور خاص کر سیدہ پر ان کی تربیت کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ انھوں نے علاوہ اور چیزوں کے اس کو فارسی بہت شوق سے پڑھائی تھی اور اس وجہ سے اس میں فارسی کی اچھی قابلیت پیدا ہو گئی تھی۔

مولانا حالی کو اس بچی سے خاص انس تھا شروع ہی سے اس کی بچپن کی حرکتوں سے اس کی دل موہ لینے والی باتوں اور ہونہاری کے انداز سے بہت خوش ہوتے تھے۔ جب اس کی عمر صرف دو سال کی تھی تو انھوں نے اس کی "شان" میں ایک نظم لکھی تھی جو ان کے غیر مطبوعہ کلام کے ساتھ "جواہرات حالی" میں شائع ہوئی ہے۔ ان کے دل میں عورتوں کی بڑی قدر اور عزت تھی اور ان کی "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" وغیرہ اس کا زندہ ثبوت ہیں لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے خاص طور پر کسی عورت یا بچی کے لئے کوئی نظم نہیں لکھی۔ اس نظم کو اس لئے درج کرتا ہوں کہ وہ اپنی قسم کی حالی کی ایک ہی نظم ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی قوت مشاہدہ کس قدر گہری اور واضح تھی:-

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے — صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
ذرا دیکھو تو اس کی صورت کو — سچی چینی کی جیسی مورت ہو
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان — پر سب اچھے بُرے کی ہے پہچان
ماں نے جو کچھ اسے سکھایا ہے — جو ادب قاعدہ بتایا ہے
وہ سبق سارے اس کو ہیں ازبر — نقش ایک ایک بات ہے دل پر
ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام — سب کو کرتی ہے ہاتھ اٹھا کے سلام
پھر ادب سے وہیں سلام کے ساتھ — پوچھتی ہے مزاج جوڑ کے ہاتھ

جھوٹ موٹ اس کو گر ڈراتے ہیں — بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
پکے پن سے یقیں نہیں کرتی — دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی
وہ کسی بات پر مچلتی نہیں — اپنی عادت کبھی بدلتی نہیں
ایک بیماری سے تو ہے لاچار — ورنہ روتی نہیں کبھی زنہار
ایسی کم عمر لے سمجھ ہو کر — دودھ بھی مانگتی نہیں رو کر
بے پیئے دودھ جب نہیں سرتی — ہے وہ ماں کی خوشامدیں کرتی
کبھی کہتی ہے پیار سے اماں — اور کبھی ڈالتی ہے گل بیّاں
کوٹ کوٹ اس میں ہے بھری غیرت — اس کو کوئی جھڑک دے کیا طاقت
ماں نے جھوٹوں کبھی جو گھور دیا — اس نے سچ مچ وہیں بسور دیا
ماں کی خفگی سے ہے بہت ڈرتی — اس کے تیور ہے دیکھتی رہتی
جب کبھی دیکھتی ہے چپ ماں کو — بار بار اس کو کہتی ہے بولو
ماں یہ سن کر اگر ذرا ہنس دی — پھر کوئی دیکھے آکر اس کی خوشی
ہنستی ہے اور کھل کھلاتی ہے — بچی پھولی نہیں سماتی ہے
چاہنے والے اس کے ہیں جو جو — خوب پہچانتی ہے ایک اک کو
پھوپیوں سے تو ہے لگاؤ بہت — گھر کی خالاؤں سے ہے چاؤ بہت
ہے چچاؤں کے نام کی عاشق — ان کے کلمے کلام کی عاشق
غور سے ان کا پڑھنا سنتی ہے — اور سُن سُن کے سر کو دھنتی ہے
ختم ہو چکتے ہیں جب ان کے بول — کہتی ہے بار بار "ابا اوُل"
آرزو تو بہت ہے بولنے کی — پر نہیں اٹھتی ہے زبان ابھی
یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زباں — جبکہ کرنے لگی تھی وہ غوں غاں
اب تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار — ہوتی جاتی ہے جس قدر ہوشیار

نہیں منہ سے نکلتے پورے بول	بولتی ہے سدا ادھورے بول
لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب	زرزری اپنی بولتی ہے جب
نئے آتے ہیں گھر میں جب مہماں	دیکھ کر ان کو ہوتی ہے خنداں
پا کے بیٹھا ادھر ادھر سب کو	دیکھتی ہے مٹر مٹر سب کو
اوپری شکل سے ہے گھبراتی	ہے مگر جلد سب سے مل جاتی
ہیں جو ماں جائے اس کے بھائی بہن	یوں تو ہے سب کی اس کے دل میں لگن
پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو	کیونکہ اوپر تلے کے ہیں دونوں
پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا	اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹتی ہے دوڑ کر ماں سے	بھائی سے کھنی ہے مٹویاں سے
عمر اس کی خدا دراز کرے	علم سے اس کو سرفراز کرے

چڑھیں ماں باپ کی سلامتی میں

سارے پروان بھائی اور بہنیں

لیکن سب سے زیادہ بیش بہا اثر اس کی شخصیت کو سنوارنے اور مکمل کرنے میں اس کی والدہ کا تھا، انہوں نے مبدءِ فیاض سے ایک ایسی غیر معمولی طبیعت پائی تھی کہ جس کی نظیر میرے مشاہدہ میں کہیں نہیں آئی ۔ ہندوستان میں ایسی عورتوں کی کمی نہیں جن کی سیرت، نیکی، شرافت محبت اور خدمت کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے اور جن کا وجود اپنے خاندان کیلئے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ مگر ان میں علاوہ ان صفات کے بعض خوبیاں تھیں جو ان کو دوسری خواتین سے ممتاز کرتی تھیں۔ ان کو قدرت نے ایک ذہین، معاملہ فہم اور رسا دماغ عنایت کیا تھا جس کے سکون اور توازن کو نہ غموں کی یورش ہلا سکتی تھی نہ مسرت کا جوش۔ ان میں محبت اور ہمدردی کا غیر معمولی جذبہ تھا۔ اپنی اولاد سے جو محبت تھی وہ عشق کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی لیکن وہ اندھی محبت نہ تھی جو محض نازبرداری میں تعلیم و تربیت کے کٹھن اور صبر آزما فرض سے غافل ہو جائے۔ ان کے

دل اور دماغ ایک دوسرے سے مل جل کر کام کرتے تھے۔ ان کے تمام کاموں کا محرک محبت یا ہمدردی کا جذبہ ہوتا لیکن عنان رہنمائی ہمیشہ عقل اور دماغ کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کی خوبیوں اور کمزوریوں دونوں کو اچھی طرح سمجھتی تھیں اور نہایت دوراندیشی اور انصاف کے ساتھ خوبیوں کی ہمت افزائی اور کمزوریوں کا علاج کرتی تھیں۔ دو خوبیاں ان کی سیرت کے ہر پہلو پر چھائی ہوئی تھیں۔ ایک تو ایثار جس کے کارناموں سے ان کی ساری زندگی معمور رہی۔ انہوں نے کبھی اپنی تکلیف اور ضرورت کو دوسروں کی تکلیف اور ضرورت پر مقدم نہیں سمجھا۔ اولاد اور عزیزوں کے لئے ایثار کرنا مقابلتہً سہل ہے لیکن وہ غیروں اور اجنبیوں کے لئے بھی اسی قدر بے ساختگی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ایثار کرتی تھیں۔ ان کو کسی کی تکلیف اور مصیبت کا علم ہوجائے، پھر ان کے لئے ناممکن تھا کہ وہ اس کو دور کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش صرف نہ کردیں۔ دکھ میں شریک ہونا تو مقابلتہً آسان ہے اس سے زیادہ کٹھن امتحان انسان کی ہمدردی اور انسانیت کا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی خوشی میں بغیر کسی ذاتی غرض کے شریک ہوسکتا ہے یا نہیں۔ ان میں یہ صفت بدرجہ کمال موجود تھی۔ میں نے بارہا ان کو غیروں بلکہ مخالفوں کی خوشی اور ترقی پر خوش ہوتے دیکھا۔ ان کے دل میں ماں کی محبت کا جذبہ اس درجہ وسیع تھا کہ اس میں گویا خدا کے سب بندے سما گئے تھے۔ ان کی دوسری بڑی صفت انصاف پسندی تھی۔ وہ اپنی روشن دماغی اور معاملہ فہمی کی بدولت ہر قسم کے خاندانی معاملات اور جھگڑوں قصوں میں دیکھ لیتی تھیں کہ حق کس طرف ہے اور پھر اپنی انصاف پسندی کی بدولت اپنی پوری قوت سے اس کی حمایت کرتی تھیں، خواہ اس سے ان کی اپنی ذات کو یا ان کے قریب ترین عزیزوں ہی کو نقصان کیوں نہ پہنچے اور وہ ناراض کیوں نہ ہوں۔ انھوں نے ہمیشہ معاملہ میں حق کی بات کہی اور حق پر عمل کیا۔ ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ عام دستور کے خلاف انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ بچوں کی لڑائیوں میں جو خاندان میں اکثر ہوا کرتی ہیں اپنے بچوں کی بے جا حمایت کی ہو۔ اگر کوئی بچہ اپنی جہالت یا نادانی سے کسی نوکر پر زیادتی کرتا تو وہ ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتیں کہ نوکر سے معافی

مانگی جائے۔ اگر بچّہ اس کے خلاف ضد کرتا تو وہ نوکر کو حکم دیتیں کہ وہ بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کرے۔ ان کا محبوب قول تھا کہ "دوسروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو جیسا تم ان سے چاہتے ہو۔ آخر ان کے بھی جان ہے، وہ بھی خدا کے بندے ہیں، ان کے بھی دل ہے اور ان کی دل جوئی بھی اتنی ہی ضروری ہے۔" یہی اصول انصاف کی جان ہے۔ میں ایسی خواتین سے ملا ہوں جن میں کوئی خاص صفت ان سے زیادہ ہے۔ مثلاً وہ زیادہ عبادت گزار ہیں، یا زیادہ تعلیم یافتہ ہیں، یا ان کی ذہنی دل چسپیاں یا مشاغل ان سے زیادہ وسیع ہیں لیکن جو چیز ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کی شخصیت کا توازن اور اصول پرستی تھی۔ ان کے دل اور دماغ، جذبات اور خیالات اصول اور عمل کی ہم آہنگی، ہر معاملے میں ان کی حق پسندی اور ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے پاکی، ان کی شخصیت کو ممتاز کرتی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ سیّدہ نے یہ صفات اپنی ماں سے ورثے میں پائی تھیں۔ اس کی طبع سلیم نے بچپن ہی سے غیر محسوس طور پر نیکی اور شرافت کے اس زندہ پیکر کا اثر قبول کرنا شروع کر دیا تھا جس کی گود میں اس نے پرورش پائی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی اسی طرح نشوونما پاتی رہی جس طرح کسی باکمال آرٹسٹ کا شاہکار رفتہ رفتہ اپنے حُسن اور خوبی کو ظاہر کرتا ہے۔ ماں کی ذات اس کے لئے ایک سرچشمۂ الہام تھی اور ان کی محبت بھری تربیت مصور کا موقلم جو تصویر میں رنگ بھر کر اس کے نقوش کو ابھار کر انہیں جلا دے کر اس کے پوشیدہ امکانات کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کی طبیعت میں بھی وہی توازن اور ہم آہنگی تھی جو اس کی ماں کے حصے میں آئی تھی اور جو بڑے بڑے مصوروں اور مجسمہ سازوں کے کام میں پائی جاتی ہے۔ اس میں محبت، ہمدردی اور دوسروں کا دکھ درد بٹانے کا خداداد ملکہ تھا لیکن اس کے اظہار میں وہ ہمیشہ اپنے ذہن رسا اور عقل خداداد سے کام لیتی۔ اس لئے اس کی ہمدردی محض زبانی نہیں عملی ہوتی تھی۔ اس میں بھی ایثار اور خدمت کا مادہ تھا اور وہ دوسروں کے آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھتی تھی۔ میں نے کسی لڑکی کو اس کم عمری میں اس درجہ بے نفس نہیں پایا۔ یہ بات قابلِ ذکر اس لئے ہے کہ عنفوانِ شباب

کے دور میں بالعموم انسان کی توجہ کا مرکز اس کی اپنی ذات اور خواہشات ہوتی ہیں اور اسے دوسروں کے وجود اور جذبات اور ضروریات کا واضح اور روشن احساس نہیں ہوتا۔ وہ خدمت کرنے کو فخر سمجھتی تھی۔ مثلاً اس نے اپنی ماں کی آخری علالت میں شب و روز جس خلوص، محبت اور بے نفسی کے ساتھ ان کی خدمت کی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے یہ صلاحیت کس قدر فیاضی کے ساتھ ملی ہے۔ لیکن اس میں سیوا کا یہ جذبہ صرف اپنے عزیزوں تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے، زبان سے، دماغ، روپیہ پیسے سے، ہر ضرورت مند کی مدد اور خدمت کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔ بیماروں، ضرورت مندوں کے لئے وہ ایک فرشتۂ رحمت تھی جو بغیر کسی اظہار یا نمائش کے ان کو آرام پہنچانے کی فکر میں لگی رہتی تھی۔

اس میں انصاف پسندی کا جذبہ بھی بہت شدید تھا۔ ذاتی تعلقات یا مخالفت اس کے حق پسند اور حق شناس دماغ کے فیصلے پر اثر نہ ڈال پاتی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا کہ روزمرّہ کے خاندانی معاملات میں اس کی رائے اور عمل دوسروں سے مختلف ہوتے، کیونکہ جہاں وہ اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی یا محبت اور مخالفت کی بنا پر رائے قائم کرتے، یہ ان چیزوں کو نظر انداز کر کے غیر جانبداری کے ساتھ رائے قائم کرتی تھی۔ اس نے جذبات کو عقل اور انصاف کے تابع رکھنے کا گُر سیکھ لیا تھا۔ روزمرّہ کی زندگی میں شیرینی ہمارے اخلاق اور آداب مجلس کے رکھ رکھاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے اخلاق کی شیرینی سے ہر کس و ناکس کے دل میں گھر کر لیتی تھی۔ دراصل اخلاق کی بنیاد بھی انصاف کا جذبہ ہی ہے۔ ایک بااخلاق آدمی کے لئے لازم ہے کہ وہ کسی کی دل آزاری اور حق تلفی نہ کرے بلکہ ہر شخص کے ساتھ انسانیت اور شرافت برتے۔ سیدہ کا اخلاق اس قدر وسیع اور اس کی شخصیت میں ایسا جادو تھا کہ اس نے اپنے تمام عزیزوں اور جاننے والوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ وہ بزرگوں کا ادب اور تعظیم کرتی، ہم عمروں اور ہمجولیوں کے ساتھ محبت، ہمدردی اور خاطر نوازی کے ساتھ پیش آتی۔ چھوٹوں کے ساتھ (خواہ وہ عمر میں چھوٹے ہوں یا رشتے اور مرتبے میں) شفقت اور برابری کا برتاؤ کرتی تھی۔ وہ نوکروں کو آسانی سے رام کر لیتی تھی خواہ وہ کیسے ہی جاہل اور بدتمیز ہوں ——

بسا اوقات یہ بھی دیکھا کہ وہی نوکر جو دوسروں کے ساتھ بدتمیزی اور اکھڑپن کا برتاؤ کرتے، اس کے ساتھ ادب، محبت اور فرماں برداری سے پیش آتے تھے۔ اس کامیابی کا راز شاید یہ تھا کہ وہ حضرت فاطمہ زہرا کی تقلید میں کبھی ان سے کسی ایسے کام کو نہ کہتی جس کو خود کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وہ ان سے اس قدر نرمی اور مساوات کے انداز سے گفتگو کرتی کہ خود ان کی نظروں میں اپنی عزت اور وقعت بڑھ جاتی۔ اس نے اپنی صحبت کے اثر اور اخلاق کی عمدگی سے بہت سے واقف کاروں کو غیر محسوس طور پر ایک اعلیٰ تر زندگی کی جھلک دکھائی جس میں نفس پرستی اور آرام طلبی کی بجائے بلند تر اصولوں کی کارفرمائی ہو۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح ایک پیدائشی معلمہ تھی۔ اور علاوہ نوکروں کی اخلاقی تربیت اور اصلاح کے ان کو لکھنا پڑھنا سکھاتی اور مذہب کی ضروری باتوں سے آگاہ کرتی تھی۔ اور ان میں سے بعض کی تو اس قدر قلب ماہیت ہو جاتی تھی کہ خود ان کے والدین بھی تعجب کرتے تھے۔ بعض مرتبہ وہ اپنی جگہ پر شروع شروع میں بات چیت میل جول اور باہمی تعلقات کے ان زیادہ شائستہ آداب کی ہنسی اڑاتے، لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اس کے معترف ہو جاتے۔ اور ان میں سے اکثر (بقول خود) "سیدہ کے نام کا کلمہ پڑھا کرتے تھے"! اپنے خاندان کی بچیوں پر بھی اس کا ایسا ہی اثر ہوتا تھا۔ جو لڑکی اس کی صحبت میں کچھ عرصہ رہتی اس پر اس کی بلند سیرت کا اثر اس طرح پڑتا جس طرح صبح کی روشنی آہستہ آہستہ دنیا کے ہر گوشے میں گھر کر لیتی ہے۔ وہ جہاں کہیں جاتی ان کی توجہ کا مرکز بن جاتی اور لڑکیاں اس کو گھیر لیتیں اور اپنی مشکلات اور مسائل اور معاملات اور مخالفتوں کو اس کے سامنے پیش کرتیں، تاکہ یہ نوعمر لیکن سمجھدار جج اپنے مشورہ سے ان کی مدد کرے۔ اور وہ نہایت خندہ پیشانی اور شیریں کلامی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیتی اور اس طرح انجام دیتی کہ جس لڑکی کے خلاف اس کا فیصلہ ہوتا وہ بھی خوشی سے اس کو قبول کر لیتی! اس کے کیرکٹر کی پختگی کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ ہمیشہ دوسری لڑکیوں کو اپنے بلند تر معیار پر لانے کی کوشش کرتی تھی، کبھی سستی ہر دل عزیزی کی خاطر اس سطح سے نیچے نہ اترتی تھی۔ لیکن باوجود معیار اخلاق کی بلندی کے اس کی انسانیت، اس کی نسائیت، اس کا خلوص اور انکسار اس کے

کلام کی شیرینی اور اس کے مزاج کی دل کشی لڑکیوں کو اس کی طرف کھینچتی تھی۔ ورنہ بالعموم لوگ اس قسم کے "اخلاق" رکھنے والے لوگوں سے بھاگتے ہیں۔ کیونکہ ان کی طبیعت خشک اور سخت گیر ہوتی ہے اور وہ دوسروں کے مزاج اور مشکلات کو نہیں سمجھ سکتے۔ ذہانت کے ساتھ ساتھ سیدہ کے پاس محبت کا اسم اعظم تھا، محبت جس کی کنجی انسان کے سامنے وجدانی طور پر علم اور واقفیت کے ایسے ایسے دروازے کھول دیتی ہے جو محض دماغی کاوش سے کبھی وا نہیں ہوتے۔ اس کو اپنے والدین بھائی بہنوں، عزیزوں، دوستوں سے ایسی گہری اور پرخلوص محبت تھی کہ وہ اکثر بغیر کرید اور جستجو اور دماغی کاوش کے ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں اور ان کے دل کی باتوں کو براہ راست سمجھ لیتی تھی اس سے گفتگو کرنے میں کم از کم مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں اپنے دل سے گفتگو کر رہا ہوں۔

اسی محبّت کا فیض تھا کہ اس کم عمری میں اس نے ایک ایسا کارنامہ دکھایا جو آج تک مجھے حیرت میں ڈالتا ہے۔ جب ہم بھائی بہنوں کے سر سے بچپن ہی میں اس شفیق ماں کا سایہ اٹھ گیا جس نے ہمیں اپنے ظل عاطفت میں رکھا تھا اور دنیا کے حوادث اور تلخیوں سے بچایا تھا۔ تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین و آسمان کی جڑیں اور زندگی کی بنیادیں ہل گئی ہیں لیکن اس بلیس سال کی نوعمر اور ناتجربہ کار لڑکی نے نہ صرف گھر کی زندگی کا بار اٹھا لیا بلکہ ہمارے ویران دلوں میں اپنی محبت اور فرزانگی سے اس طرح گھر کر لیا کہ ایک حد تک ماں کی جدائی کا زخم مندمل ہو گیا۔ خدا کی قدرت اور رحمت کا پورا اندازہ ایک عورت کے دل کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں کس قدر امکانات خوابیدہ ہوتے ہیں۔ کس قدر ذمہ داری کا بار اٹھانے کی قوت ہوتی ہے۔ بچپن میں اس کے مزاج میں کسی قدر تیزی اور زود رنجی تھی لیکن جوں جوں عمر اور تجربہ بڑھتا گیا اس میں گھلاوٹ اور شیرینی اور سکون و وقار زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ماں کے انتقال کے بعد اس کی حساس طبیعت اس قدر مستحکم اور اس کے دل کی محبت ایسی اتھاہ ہو گئی تھی کہ اگر تمام دنیا کے دکھ درد کا بوجھ اس پر ڈال دیا جاتا تو وہ اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ سہہ لیتی اور اُف نہ کرتی۔ کم سے کم مجھے تو اس کی ذات سے ایسی ہی تقویت تھی۔ جب آزمائشوں اور پریشانیوں کی کثرت زندگی کو ناگوار اور تلخ بنا دیتی،

تو اس کا ہنستا ہوا خوبصورت چہرہ اور نیلگوں آنکھیں دل کے بار کو اس طرح دور کر دیتی تھیں جس طرح سورج کی روشنی رات کی تاریکی کو کافور کر دیتی ہے۔ مگر قدرت کا قانون یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان زندگی میں اپنی صلیب تنہا اٹھائے اور کسی رفیق صادق کی مدد اور محبت اس کی کٹھن منزل کو آسان نہ کرے اور انسان کی یہ دعا یا تو پوری ہی نہیں ہوتی کہ

خواہم از لطف تو یارے ہمدمے   از رموزِ فطرتِ من محرمے

یا اگر کبھی ہوتی بھی ہے تو اس یار ہمدم کو یک لخت ہم سے چھین لیا جاتا ہے تاکہ ہم جانیں کہ ہر چیز کو فنا ہے اور باقی رہنے والی محض ذات باری ہے ۔

چڑھتی ہے جب عشق کی سان پہ تیغِ خودی
ایک 'مجاھد' کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

مردِ مجاہد

(جواہر لال نہرو)

(۱)

۱۹۴۰ء کا پر آشوب زمانہ تھا اور جنگ آزادی اور ستیہ آگرہ کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کو، بہ سبیل جہاد، کشمیر جانے کی سوجھی۔ اس وقت ہندوستان بھر میں ہر جگہ حکومت کے ملازم اور ان کے دوست اور عزیز بلکہ سبھی عافیت پسند ایسے انقلابی نیتاؤں سے ملنے میں تامل کرتے تھے لیکن ہندوستانی ریاستوں میں یہ پابندیاں زیادہ سخت تھیں اور "جو سو فیصدی ہمارے ساتھ نہیں ہمارے خلاف ہے"، کے اصول پر عمل تھا! کشمیر میں بھی یہی صورت حال تھی۔ چنانچہ جب جواہر لال وہاں پہنچے تو قومی کارکنوں نے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ لیکن حکومت کے متوسلین مواخذہ کے ڈر سے اس آتش زن شخصیت سے الگ ہی رہے . . .

نہ معلوم کیسے مقامی حکومت کے ایک غیر معروف سے افسر کو، جس کی ان سے سرسری سی ملاقات تھی، یہ ہمت ہوئی کہ انہیں چند دوستوں کے ساتھ اپنے ہاں مدعو کرے۔ جس شخص نے بھی اس "جرأت رندانہ" کا حال سنا اس نے تعجب کا اظہار کیا۔ بلکہ بعض نے ازرہ خیر خواہی مشورہ دیا کہ حکومت سے اجازت لے لو۔ اس نے جواب دیا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں ذاتی مراسم کو حکومت کے اشارہ ابرو کا تابع نہیں بنا سکتا۔ یہ تو سخت غلامانہ ذہنیت ہو گی کہ کوئی شخص اپنے ملک کے محبوب ترین لیڈر کو بغیر حکومت کی اجازت کے ایک پیالی چائے کی نہ پلا سکے! چنانچہ

جواہرلال نہرو ازرہ کرم تشریف لائے لیکن بعض عمائدین حکومت نے تقریب میں شامل ہونے سے پرہیز کیا۔ گویا بقول حالی :

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید　　　　خبطی جتنے ہیں ہم سب سے حذر کرتے ہیں!

لیکن لوگوں کا یہ حال تھا کہ نہ صرف مکان کے راستے میں ان کا ہجوم تھا بلکہ اس کی خاصی اونچی چار دیواری پر بھی ان کا پرا جما ہوا تھا۔ (یہ آزادی کا وہ زمانہ تھا جب ان کی "حفاظت" کے لئے پولیس کی نگرانی یا شائقین پر دیکھ بھال کی ضرورت نہ تھی بلکہ جواہرلال سے ان کے شائقین کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن لیکن ناکام کوشش کی جاتی تھی!)

اس تقریب پر ایک چھوٹا سا لیکن دل چسپ قصہ پیش آیا جس سے ان کی سیرت کے ایک دل کش پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ پارٹی میں میزبان کی دو چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی اپنے خیال میں میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ پنڈت جی کو بچوں سے بہت محبت ہے اور وہ ان پر بے اندازہ شفقت کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی عادت کے موافق انہوں نے دونوں کو اپنے پاس بٹھا لیا اور کچھ دیر تک بہت مہربانی کے ساتھ ان سے باتیں کرتے رہے۔ ان کی ایک چھوٹی بہن، جس کی عمر تین سال سے بھی کم تھی برآمدے میں سے یہ سارا قصہ دیکھ رہی تھی۔ جب پنڈت جی موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہونے لگے تو وہ ایک دم برآمدے سے اتری، موٹر کے پاس آئی اور اس نے رُک رُک کر کہا (نہ معلوم اس نے کس جدوجہد کے بعد یہ جملہ اپنے ذہن میں مرتب کیا ہوگا!) "دیکھئے جب میری بہنیں بڑی ہو جائیں گی تو سب سے کہیں گی کہ پنڈت جی نے ہمیں پیار کیا تھا اور اپنی گود میں بٹھایا تھا۔ بتائیے میں کیا کہوں گی؟" وہ اس اچانک حملے سے اس قدر گھبرائے اور متاثر ہوئے کہ فوراً موٹر سے باہر کود پڑے۔ بچی کو گود میں اٹھا لیا اور کئی منٹ تک کھڑے اس کو پیار کرنے اور اس کی دل داری کرتے رہے!

بات بالکل چھوٹی سی ہے لیکن اس کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی واقعتاً بڑے ہوتے ہیں ان کے معیار اور انداز ے عام لوگوں سے کچھ مختلف ہوتے

ہیں۔ اکثر ان کی نظر میں وہ چیزیں اہم ہوتی ہیں جو معمولی آدمیوں کی نظر میں کوئی خاص وقعت نہیں رکھتیں اور ان چیزوں کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی جن کو معمولاً لوگ بت بنا کر پوجتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی معاملات اور قومی مسائل کے مقابلے ایک چھوٹی سی بچی کی دل داری کی کیا اہمیت ہے؟ لیکن حقیقی انسانیت کچھ ایسی ہی انوکھی ترازوؤں میں تولی جاتی ہے۔

یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ حسنِ اتفاق سے مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سنتا آیا تھا، پڑھتا آیا تھا، آنکھوں سے نہیں دیکھ پایا تھا کہ انہیں عوام میں کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔ عوام سے میری مراد صرف جاہل یا نیم خواندہ "جنتا" نہیں بلکہ اس میں تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل ہیں۔ اُن سے ان کا رشتہ دوطرفہ ہے۔ وہ ان کو جانتے ہیں، ان کی شخصیت کے سحر سے متاثر ہوتے ہیں ان کی تنقید اور نکتہ چینی بلکہ ڈانٹ ڈپٹ کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں کیونکہ انہیں ان کے خلوص پر مکمل بھروسا ہے۔ ان کی سیرت کی تعمیر ہی خلوص کے سونے سے ہوئی ہے اور پھر قومی عشق اور آزمائشوں کی بھٹی میں تپ کر وہ سونا بالکل کندن بن گیا ہے! دوسری طرف جواہر لال کے دل کے تار عوام کی زندگی، ان کے دکھ درد، ان کی آرزوؤں اور امنگوں کے ساتھ لرزش کرتے ہیں۔ اسی سرچشمہ سے انہوں نے وہ جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تقویت حاصل کی ہے جو ان کے ہم عصروں کو حیرت میں ڈالتی ہے لیکن تعجب کا مقام مقبولیت نہیں بلکہ وہ شرائط ہیں جن پر انہوں نے اسے حاصل کیا ہے۔

عام طور پر ایسی مقبولیت یا تو عارضی ہوتی ہے اور کسی فوری جذبہ پر مبنی یا اس کی خاطر اپنی اصول پرستی اور آزادیٔ ضمیر کو عوام کی خوشنودی کے لئے قربان کرنا پڑتا ہے۔ جواہر لال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے یہ سودا نہیں کیا۔ انہوں نے قیادت کی ہے اپنے اصولوں اور قدروں پر قائم رہ کر۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ انہیں جمہوری لیڈرشپ کے گر نہیں آتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے ذاتی مقاصد یا قوت اور رسوخ حاصل کرنے کے لئے اس کے اوچھے اور گھٹیا ہتھیاروں کو استعمال نہیں کیا۔ اس زمانے میں جب قوت کی بنیاد پراپیگنڈے پر رکھی جاتی

ہے اور اپنے سیاسی حریفوں کو مات دینے کے لئے ہر طرح کے ناپاک ذریعے استعمال کئے جاتے ہیں ذہنی اور جذباتی اعتبار سے جواہر لال کی طرح پاک باطن رہنا بہت ہی مشکل ہے۔ ان کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ طریقے نہ صرف اپنے ذاتی فائدے کے لئے استعمال نہیں کئے بلکہ قومی اغراض ومقاصد کے لئے بھی انہیں نہیں برتنا۔ ذریعہ اور مقصد دونوں کی پاکیزگی کا اصول، جو اہل اخلاق وفلسفہ میں ہمیشہ زیر بحث رہا ہے، اس کو جواہر لال نے قومی زندگی اور سیاست کے میدان میں استعمال کیا جہاں کی سنگلاخ زمین اس کے لئے چنداں سازگار نہیں۔ یہ چیز یقیناً ان کے فکر اور کردار کی جڑوں میں موجود تھی لیکن گاندھی جی کی صحبت نے اس کو ان کی سیرت کا بنیادی ستون بنادیا جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا گاندھی جی نے جنگ آزادی کی کانٹوں بھری وادی میں اس اصول کی پابندی کی اور اپنے ساتھیوں سے اس کی پابندی کرائی گو ظاہر ہے کہ ایک اتنی بڑی عوامی تحریک میں، جس میں کروڑوں لوگ شامل ہوں اس پر پوری طرح عمل کرنا ممکن نہیں لیکن ایک لحاظ سے مجھے جواہر لال کی آزمائش ان سے زیادہ کڑی معلوم ہوتی ہے۔

کسی مصنف نے لکھا ہے کہ جب اخلاقی قیادت جنگ آزادی کی راہبری کرتی ہے تو دیو قامت انسان پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جب سمجھوتے اور مصلحت کی بنا پر حکومت کا کام چلانا پڑتا ہے تو وہ اپنے اصلی قد پر آجاتے ہیں۔ جنگ آزادی کے جوش اور نشے میں ہندوستانیوں نے بہت سے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے لیکن جب وہ معرکہ سر ہوگیا اور "مال غنیمت" کی تقسیم کا وقت آیا تو ہر طرف سے اہل اور نا اہل امیدواروں اور غرض پرستوں کی یورش ہوئی۔ اس نازک مقام پر ارباب حکومت واختیار کے لئے عقل اور ایمان کا توازن قائم رکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ان پر کیا کیا مصلحتیں ان کے دماغ اور پاؤں میں زنجیریں نہیں ڈالتیں؟ پارٹی کو خوش کرنا ہے، قربانیوں کا "صلہ" دینا ہے، عوام کے ووٹ حاصل کرنے ہیں۔ اقربا نوازی کے مطالبات ہیں۔ بے شمار ایسے افراد کے ساتھ نباہنا ہے جو غرض کے بندے ہیں اور گھٹیا اصولوں کے پرستار۔ جواہر لال کی اخلاقی اور ذہنی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس صورت حال

میں بھی انہوں نے اپنی عفت قلب ونظر کو قائم رکھا اور قوت کے تیزاب نے ان کی خودی کو مجروح نہیں کیا۔ قوت جو انسان کے لئے سب سے گہرا نشہ اور سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اقبال نے کہا ہے:

تقدیر امم کا یہ پیام ازلی ہے   صاحب نظراں نشہ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر وجہاں گیر کے آگے   عقل ونظر وعلم وہنر ہیں خس وخاشاک

کچھ اسی مضمون کا قول لارڈ ایکٹن (Acton) کا بھی ہے اور وہ اس قدر سچا ہے کہ باوجود بار بار دہرایا جانے کے اب بھی دل میں چبھتا ہے "قوت ہمیشہ انسان کو خراب کرتی ہے۔ اگر اس پر کوئی پابندیاں نہ ہوں تو وہ اسے بالکل ہی تباہ کردیتی ہے"۔ جواہرلال کو گزشتہ پندرہ سال میں جس قدر قوت اور ہردل عزیزی نصیب ہوئی ہے ایسی شاید ہی کسی دوسرے جمہوری لیڈر کے حصے میں آئی ہو۔ "ہردل عزیزی اور قوت" یہ نہ صرف دو مختلف چیزیں ہیں بلکہ اکثر ان کے تقاضے اور مطالبات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوتے ہیں اور ان کی بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے لیکن جواہرلال نے اپنی دیانت فکر اور گداز قلب دونوں کو قائم رکھا اور وہ سیاست کی دلدل میں اس کرامت کے ساتھ گذرے کہ ان کے دامن پر اس کی آلودگیوں کی چھینٹ نہیں پڑنے پائی۔ آزادی کی جنگ میں اور بھی بہت سے نامور لیڈروں نے حصہ لیا۔ اس کے بعد ملک کے بنانے میں دوسرے بہت سے نیتاؤں اور ارباب حکومت کا ہاتھ ہے ——— لیکن چند کو چھوڑ کر کتنوں کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان تحریصوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلے کر سکے اور انہوں نے قومی کاموں میں نفس کے تقاضوں کو جگہ نہیں دی بلکہ وہ مژگاں کے خاروں میں سے پاک دامنوں کی نگاہ کی طرح صاف نکل گئے! مگر یہی تھوڑے سے افراد جو اس عام روش سے جدا رہے ملک کی اخلاقی بقا اور ترقی کے ضامن ہیں اور انہیں کی ذات میں وہ نمک ہے جس سے قوم کی زندگی نمکین بن سکتی ہے۔ مجھے اکثر اس بات کا احساس ہوا ہے کہ ہماری خوش نصیبی ہے ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں چند ایسے افراد شامل ہیں جن کی توجہ کا اصل مرکز سیاست کا کھیل نہیں بلکہ اعلیٰ قدروں کا اثبات اور ان کی اشاعت ہے۔ ان کو ایک حد تک اپنے

دل و دماغ کے بعض بنیادی تقاضوں کو دبا کر سیاست کے میدان میں آنا پڑا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی گھر میں آگ لگی ہو تو وہ لوگ جن کے دل میں سماجی احساس کے چراغ روشن ہیں ادیب کے قلم یا مصور کے برش یا مغنی کے ستار سے اپنا دل نہیں بہلا سکتے تھے۔ لیکن اس میدان میں پڑ کر انہوں نے زندگی کی ان بنیادی قدروں کو نہیں بھلایا جو ان کی فانوس حیات میں روشن تھیں بلکہ بڑی حد تک سیاست کو ان کی تحصیل کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ کسی پبلک شخصیت کی اخلاقی قدر و قیمت کو پرکھنے کے لئے ایک کسوٹی ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ یعنی آیا اغراض و مقاصد کی رسہ کشی میں وہ ان اصولوں اور قدروں کی حبل المتین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہتی ہے جن کی آغوش میں اس کی پرورش ہوئی ہے اور جن کا وہ زبان سے اعلان کرتی رہتی ہے۔ یا اس کے سارے دعوے ایک ملمع کی حیثیت رکھتے ہیں جو آگ کی ایک ہی تاپ سے اتر جاتا ہے؟ حقیقی معنوں میں انسان وہ ہے جس کی دیانت کو نہ اقتدار کا نشہ متزلزل کر سکے نہ قوت کا غرور، جو دنیا حاصل کرنے کے لئے اپنی روح کا سودا کرنے کو تیار نہ ہو۔ جواہرلال نے آزادی کے لئے جد و جہد کی اور پھر سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا لیکن انہوں نے اسے اپنی ذات کو آگے بڑھانے کے لئے استعمال نہیں کیا (وہ جہاں پہنچ چکے تھے اس سے اور آگے کہاں جاتے!) وہ تو ان کیلئے ایک ذریعہ ہے ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کا جس کا خواب انہوں نے عمر بھر دیکھا ہے، وہ ہندوستان جہاں عام لوگوں کے لئے شرافت اور فراغت کی زندگی بسر کرنے کا امکان ہو۔ جانتا ہوں کہ وہ ہندوستان ابھی تک تعمیر نہیں ہوا بلکہ بعض اعتبار سے معلوم ہوتا ہے الٹی ترقی ہوئی ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ اس عبوری دور کی مصیبتوں اور آزمائشوں سے گھبرا کر بعض کمزور ایمان اور کمزور دل والے لوگ اس سیاسی آزادی کی ناقدری کرتے ہیں جو انھیں حاصل ہوئی ہے اور خود جواہرلال سے بھی ناراض ہیں کہ "ان کے عہد میں" ابھی تک بیروزگاری کیوں ہے۔ چیزوں کی گرانی کیوں بڑھتی جاتی ہے۔ حکومت اور کاروباری حلقوں میں سے بددیانتی کیوں دور نہیں ہوئی یا دوسرے ملکوں سے قیمتی موٹر کاریں اور سامان آرائش و عیش و عشرت کی درآمد پر

پابندیاں کیوں لگی ہیں یا انکم ٹیکس کیوں بڑھتا جا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ شکایت کرنے والوں میں بہت سے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو براہِ راست ان میں سے بعض مشکلات کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن ان نکتہ چینیوں کو جن میں مخلص اور بد دیانت دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں، بد یہی حقیقتوں کا احساس نہیں۔ مثلاً یہ کہ ۳۴ کروڑ انسانوں کی زندگی کا نقشہ دس پندرہ سال میں نہیں بدل سکتا یا بہترین حکومت کے ہاتھ میں بھی کوئی ایسی جادو کی چھڑی نہیں ہوتی کہ اس کو گھمایا اور خواہش واقعہ میں بدل گئی یا کوئی جمہوری حکومت زبردستی اور جبر کے ذریعہ لوگوں کی ذہنیت میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتی اور اس قسم کا انقلاب محض خارجی حالات کے ردوبدل سے نہیں ہوتا بلکہ دھیرے دھیرے افراد کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں پلتا ہے۔ بے شک ایک حد تک بے اطمینانی اور بے صبری بھی مفید ہیں اگر وہ عمل کے لئے مہمیز کا کام دیں۔ لیکن قوموں کے بنانے میں صبر اور استقلال اور ان تھک محنت کی ضرورت ہے اور ہر فرد کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے فرض کو پہچانے اور اسے ایمان داری کے ساتھ ادا کرے۔ اس کے بغیر اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی مشکلوں اور پریشانیوں کی ذمہ داری کسی دوسرے با اختیار فرد یا جماعت یا ادارے پر ڈالے۔ میرا مقصد جواہر لال کے لئے معذرت پیش کرنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب مورخ غیر جانبداری کے ساتھ ان کے غیر معمولی کارناموں پر تبصرہ کرے گا تو ان کے لئے کسی معذرت کی ضرورت بھی نہ ہوگی! لیکن ایک پوری قوم کا ایک فرد سے اس درجہ توقعات رکھنا اور ان کی شکایتیں بھی، دراصل اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس کے دل میں ان کا کیا مقام ہے اور صالح تحریکوں کی کامیابی کس حد تک ان کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر انہیں پوری طرح اپنی قوت کا احساس ہو جائے اور یہ کہ باوجود بعض سیاسی جماعتوں اور مفاد مخصوص کی سخت مخالفت کے عوام کو ان سے کس قدر محبّت اور عقیدت ہے تو وہ ملک میں اپنی محبوب قدروں اور زندگی کے دل نواز نقشوں کو زیادہ اعتماد اور مضبوطی کے ساتھ رائج کر سکتے ہیں۔

ان قدروں کو پہچاننے اور ان کا پرچار کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے

وہ قدرت نے جواہرلال کو بہت فیاضی کے ساتھ دی ہیں۔ اس کے لئے پہلی شرط ہے ایک روشن اور بیدار ذہن جو زندگی کی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں صحیح راستہ دکھائے جس کو ہم ایک سائنٹیفک دماغ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس میں تعصب، وہم پسندی اور شب پرستی کے لئے گنجائش نہ ہو، جو سچ کا متلاشی ہو اور اس کے راستے میں جو راہزن کمین لگائے بیٹھے رہتے ہیں ان سے نہ خائف ہو نہ مسحور۔ نہرو نے اس قسم کا دماغ پایا ہے اور اپنی تحریروں، تقریروں میں ایسے ہی دماغ اور مزاج کی تربیت پر زور دیا ہے۔ سائنس کی اہمیت ایک تو اس وجہ سے کہ اس کے ذریعہ عوام کے معیار زندگی کو بلند کیا جا سکتا ہے اور جب تک ان کی بنیادی مادی ضرورتیں پوری نہ ہوں وہ تہذیب کے میدان میں قابل قدر کارنامے انجام نہیں دے سکتے۔ زندگی روٹی سے عبارت نہیں۔ لیکن روٹی کے بغیر اس کا کام بھی نہیں چلتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دور حاضر میں کامیابی کے لئے نہ صرف سائنس سے واقفیت اور اس کا استعمال ضروری ہے بلکہ انسانوں میں "سائنس کا مزاج" پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکے جس میں انکسار اور رواداری ہو، جو اس بات کو سمجھے کہ سچ کی مملکت میں کسی خاص گروہ یا ملک یا عقیدے کی اجارہ داری نہیں بلکہ اس میں بہت سے افراد اور ملک اور قومیں شریک ہیں۔ اس لئے تلاش حق کے جہاد میں مل جل کر کام کرنا اور ایک دوسرے کے تجربوں اور مشاہدوں سے فائدہ اٹھانا ہمارا فرض ہے۔ جواہرلال کے نزدیک سائنس کی تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہمارے فکر و عمل میں تیر کی سی تیزی اور "سیدھ" پیدا کرے اور ہر چیز کے انکار اور قبول کا معیار اس کی سچائی ہو۔ "میں ہمیشہ روشنی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں تاکہ سچ کا حسین چہرہ دیکھ سکوں اور اس تک پہنچنے کا راستہ نظر آجائے۔"

لیکن ساتھ ہی جواہرلال کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ زندگی کی گتھیوں کو کھولنے اور اس کی سرفرازیوں کو حاصل کرنے کے لئے صرف سائنس اور صنعت و حرفت کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے وہ عقل درکار ہے جو "ادب خوردہ دل" بھی ہو۔ یعنی ذہن بیدار کے ساتھ گداز قلب کی ضرورت ہے جس کے بغیر ساری کامیابیاں تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔ ضبط

عتدال اور رواداری جو مہذب زندگی کی بنیاد ہیں، کسی بیرونی دباؤ یا خوف کے ذریعہ پیدا نہیں ہو سکتیں۔ ان کا سرچشمہ اخلاقی اور روحانی قدروں کی پرکھ اور ان کے ساتھ سچی لگن ہے۔ اسی وجہ سے دوسرے انسانیت دوست مفکروں کی طرح انہیں بھی یہ فکر ہے کہ قوت میں، جو سائنس کا عطیہ ہے اور روحانیت میں، جو دل کی دولت ہے کس طرح تال میل پیدا کیا جائے۔ انہوں نے اس کے لئے کوئی آسان گر نہیں بتایا، ایسا کوئی گر ہے بھی نہیں۔ لیکن ہر موقع پر انہوں نے زبان اور قلم کے ذریعہ اور اپنے عمل سے ان قدروں کی وکالت کی ہے جو "روحانیت" کا تانا بانا ہیں۔ لطف یہ ہے کہ گو وہ مذہب کے لفظ سے گھبراتے ہیں لیکن ان کی عقیدت انہیں بنیادی اصولوں قدروں کے ساتھ ہے جن کو مذہب نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں میں ایک خاص "روحانیت کا عنصر" (Element of divinity) ہے جس کو نظر انداز کر کے مادی چیزوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لینا خطرناک ہے۔ اس وقت ہماری نسل جس نازک دور سے گذر رہی ہے (جس کو انھوں نے Crisis of the spirit سے تعبیر کیا ہے) اس میں اندیشہ ہے کہ اس کا ضمیر مفلوج ہو کر نہ رہ جائے۔ اور یہ وہ دولت ہے جو کسی داموں نہیں بیچی جا سکتی!

جواہر لال میں ہر مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور ان کے مطالبات میں توازن قائم کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ممکن ہے ایک عملی آدمی کے لئے جس کو حکومت چلانی ہے یہ چیز کسی حد تک کمزوری کا باعث ہو لیکن ایک مفکر کے لئے جس کو قومی مقاصد اور پالیسی کا تعین کرنا ہو، یہ بہت اہم صفت ہے چنانچہ جس طرح انہوں نے سائنس اور روحانیت میں تضاد کی بجائے ہم آہنگی کی تلاش کی ہے اسی طرح انہوں نے ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے کی تفسیر کی ہے۔ یہ ایک نظری بحث نہیں بلکہ ہمارے مستقبل کے لئے ایک نہایت مشکل اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس وقت ملک میں بعض گروہ ہیں جو ماضی کے تمام کارناموں کو مسترد یا نظر انداز کر کے ایک ایسے مستقبل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں جس کا ماضی کے ساتھ کوئی خاص رشتہ نہ ہو۔ بعض گروہ ایسے ہیں جو مستقبل کی طرف پشت کر کے محض ماضی کی پوجا کرنا چاہتے

ہیں اور اس پوجا میں اس کے حیات آفریں اور موت آفریں عناصر میں بھی تمیز نہیں کر پاتے۔ پھر ماضی کے ان پرستاروں میں بعض ایسے ہیں جن کے نزدیک "ماضی" صرف قدیم زمانے تک محدود ہے اور اس کے بعد جو دور آئے وہ سب نقصان کا سودا تھے۔ یہ مختلف عناصر ملک کو مختلف سمتوں میں کھینچ رہے ہیں اور لوگوں کی ذہنیت کو اپنے اپنے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ جواہر لال، ٹیگور، آزاد، سروجنی نیڈو، رادھاکرشنن جیسے لوگوں کا ایک احسان یہ ہے کہ اس رسہ کشی میں انھوں نے عقل اور رواداری کے تقاضوں کا احترام کیا ہے اور ماضی اور مستقبل کے صحیح رشتہ کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔ جواہر لال کا رُخ مستقبل کی طرف ہے۔ لیکن وہ ماضی کی بہترین قدروں اور کارناموں کو دامن میں سمیٹ کر، ان سے قوت حاصل کرکے، اس طرف بڑھانا چاہتے ہیں۔ وہ "خذ ما صفا دع ما کدر" (اچھی چیزوں کو لو اور بُری چیزوں کو چھوڑ دو) کے اصول کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تہذیب کی مثال ایک درخت کی سی ہے۔ جس کی جڑیں اپنی سرزمین میں پیوست ہونی چاہئیں تاکہ اس میں قوت اور استقلال پیدا ہو۔ لیکن اس پر چاروں طرف سے دھوپ اور روشنی پڑنی چاہیئے اور ہواؤں کے آنے کے لئے دروازے کھلے ہونے چاہئیں تاکہ اس میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہو اور نئے پھول پتے نکلیں۔ جب کسی تہذیب میں تعصب اور تنگ نظری راہ پا جاتی ہے، جب چھوٹے چھوٹے اختلاف مخالفت کا سبب بن جاتے ہیں، جب ذات پات کا بھید بھاؤ اور زبانوں، صوبوں اور عقیدوں کے فرق، ذہنی توازن کو بگاڑ دیتے ہیں، جب اس زہریلی فضا میں افراد اور جماعت کی زندگی میں جذبہ داری انصاف کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس وقت مستقبل کا خدا ہی حافظ ہے بلکہ خدا بھی حافظ نہیں کیونکہ اس کے بتلائے اور سکھائے ہوئے شرافت کے اصولوں کو توڑ کر کوئی قوم قوانین قدرت کے مطابق فلاح کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ یہی وہ خوفناک تحریکیں ہیں جو قومی زندگی کی فضا پر سانپوں کی طرح منڈلا رہی ہیں اور جن کے خلاف جواہر لال نے ہمیشہ بے خوفی کے ساتھ جہاد کیا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ ان کے خیالات بہت سے بااثر حلقوں میں سخت نامقبول ہیں، دوسرے

بہت سے اہل فکر کے برخلاف، جو محض اپنے خیال کے اظہار پر بس کرتے ہیں، ان کے خیال اور عمل میں ایک خاص یک جہتی ہے ۔ وہ جو سوچتے ہیں اسے کرنا بھی چاہتے ہیں ۔ فکر و عمل کے اس امتزاج نے ایک طرف ان کی زندگی کو کہیں زیادہ کٹھن بنا دیا ہے اور دوسری طرف ان کو خوشی اور اطمینان کا ایک ایسا سرچشمہ بخشا ہے جو کبھی خشک نہیں ہو سکتا ۔

ساگر یونیورسٹی میں خطبہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"کسی قوم کے لئے اس کی تہذیبی میراث سے زیادہ مفید اور قابل قدر چیز کیا ہو سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ خطرناک چیز بھی کچھ نہیں کہ وہ اسی پر اپنی زندگی بسر کرے ۔ جو قوم محض اپنے باپ دادا کی نقالی کرتی ہے وہ کبھی پوری طرح نہیں پھل پھول سکتی ۔ قومیں صرف ایجاد، تخلیق اور صلاحیت عمل کے بل بوتے پر اپنی قوتوں کو فروغ دے سکتی ہیں ۔ روح انسانی کشمکش کے جس نازک دور سے گذر رہی ہے اس سے عہدہ براہونے کے لئے ایک ایسے تخلیقی ذہن کی ضرورت ہے جس میں سماجی احساس ہو، دیا ہو اور انسانوں کے ساتھ شفقت اور سمجھداری کا سلوک کرنے کی صلاحیت ہو ۔ لیکن اس زمانے میں اشتہار بازی کے وسائل اس قدر ہو گئے ہیں کہ ان کی یورش میں ٹھنڈے دل سے مسائل پر غور و فکر کرنا مشکل ہو گیا ہے ۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ انسانی زندگی میں ذہن اور روح کو جو افضلیت کا مقام حاصل ہونا چاہیئے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ زبردست اور شاندار مادی کارنامے ہیں جو اسی ذہن نے انجام دئیے ہیں !"

اگر تعلیم کا کام دل اور دماغ کے دروازے اور کھڑکیاں کھولنا ہے تو جواہر لال نے قوم کے معلم کی حیثیت سے بہت بڑا کام کیا ہے ۔ انہوں نے ان قوتوں کا مقابلہ کیا ہے جو جمود اور ماضی پرستی کی علم بردار ہیں اور ہمارے فکر و نظر کے لئے نئے سانچے ڈھالنے کی، ایک حرکت آفریں اور ترقی پسند انداز خیال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب میں مختلف عناصر کو جذب کرنے اور ان کے تال میل سے ایک زیادہ دل کش اور معنی خیز مرقع تیار کرنے کی صلاحیت ہے ۔ جب کبھی باہمی لین دین کی یہ ذہنیت

کارفرما رہی ہے قومی زندگی میں اتحاد اور یک جہتی کا جلوہ نظر آیا ہے اور ہندوستانی تہذیب کا پیغام دور دور تک پہنچا ہے برخلاف اس کے جب کبھی تنگ نظری اور تعصب نے زور پکڑا ہے اور حیات بخش خیالوں اور تحریکوں کو جذب کرنے کی بجائے انہیں رد کیا گیا ہے قومی زندگی اور تہذیب میں زوال اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ تاریخ اس سبق کو بار بار دہراتی ہے لیکن قوم کا حافظہ اس کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس حقیقت کو بار بار یاد دلایا جائے اور یہ ایک معلم کا کام ہے۔

کسی شخص کی ذات میں ایک سچے معلم اور ایک سیاسی لیڈر کی صفات کا جمع ہو جانا ایک نادر واقعہ ہے۔ ان دونوں کے تقاضے اکثر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ سیاسی لیڈر قوت کا کھیل کھیلتا ہے اور ایک سچا معلم حسن، خیر، حق اور خدمت کی قدروں کا سیوک ہوتا ہے وہ لوگوں کی جا اور بے جا ناز برداری کرتا ہے تاکہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر قوت اور رسوخ حاصل کرے۔ یہ نامقبول لیکن صحیح خیالات کی حمایت اور غلط تحریکوں پر تنقید کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے خواہ اسے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے لیکن جب کوئی سیاسی لیڈر بے نفسی کے ساتھ کام کرتا ہے اور صرف مادی ترقی ہی نہیں بلکہ قوم کے اخلاق اور ذہن کی تربیت کو اپنا مقصود بناتا ہے تو معلم اور مدبر کے بیچ کی حدیں اٹھ جاتی ہیں اور افلاطون کا "فلسفی بادشاہ" وجود میں آتا ہے۔ یہ ایک عینی تصور ہے جس تک پہنچنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جواہر لال کی ذات میں اس کی جھلک نظر آئی ہے۔ اس نے انسان کے مستقبل کو امید کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور باوجود ان تمام ناکامیوں اور پسپائیوں کے جو حق دوستوں کے نصیب میں آئی ہیں اور جن سے ایک مورخ کی حیثیت سے وہ واقف ہیں انھوں نے یاس پسندی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے :-

"میں نے دنیا کی تاریخ میں بارہا انسان کو شہید اور مصلوب ہوتے دیکھا ہے لیکن میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اس کی امر روح بار بار سر اٹھاتی ہے اور برائی پر فتح پاتی ہے"۔

میں نے جواہر لال نہرو کی ایک تقریر چند سال ہوئے سنی تھی جس کا نقش میرے حافظہ پر آج تک بالکل تازہ ہے۔ انداز بیان کے اعتبار سے انوکھی اور موضوع کے اعتبار سے اس قدر ہمہ گیر کہ اس میں ایک طرح ان کے خیالات کا جیتا جاگتا خلاصہ آگیا ہے۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ اس مضمون کے آخر میں اس کا ذکر دوں تاکہ اس طرح میں نے جوان کے خیالات کے بارے میں لکھا ہے اس کی تصدیق ہو جائے

۲۳ / اکتوبر ۱۹۵۵ء اتوار کا دن تھا اور شام کے ساڑھے چھ بجے کا وقت۔ دہلی کے تال کٹورہ باغ میں ہزاروں مرد عورتوں کا مجمع تھا جن میں کوئی پندرہ سو کے قریب یونیورسٹیوں کے طالب علم تھے جواہر لال نہرو ان طلبہ کے سالانہ جشن کا افتتاح کرنے والے تھے اور ہر طرف ایک خاص رونق اور مسرت کی فضا چھائی ہوئی تھی . . . اتنے میں یادش بخیر، وہ تشریف لائے۔ کھدر کا ستھرا لباس جامہ زیبی کا بولتا ہوا اشتہار اور چہرے پر دل فریب اور دل گداز مسکراہٹ جوان کی سب سے موثر اور من موہنی "پبلسٹی ایجنٹ" ہے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد، جب گویا مائکروفون کی شمع پنڈت جی کے سامنے آنے والی تھی، وہ کرسی سے اٹھے۔ اچک کر سامنے کی میز پر بیٹھ گئے۔ مائکروفون اپنی طرف کھینچا۔ اس کو ذرا نیچا کیا تاکہ سامعین اور ان کے روئے زیبا کے بیچ میں حارج نہ ہو، ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی اور اس اطمینان سے مجمع کو مخاطب کیا جیسے نہ انہیں دنیا کی فکر ہے، نہ ملک کے بے شمار کاموں اور مسئلوں کی، نہ اس کا بوجھ ان کے کاندھوں پر ہے، بس ان کو ایک ہی خواہش ہے اور وہ یہ کہ اس مشتاق مجمع کو اپنے دل کی باتیں سنائیں۔

بارہا ان کو تقریر کرتے سنا ہے۔ وہ اصطلاحی معنوں میں ایک "خطیب" نہیں۔ ان کا شمار خطابت کے ایسے فن کاروں میں نہیں جیسے آزاد یا سروجنی نیڈو یا سری نواس شاستری یا رادھا کرشنن لیکن ان کا انداز بالکل اپنا ہے اور عوام کے لئے خاص طور پر موزوں ـــــ ان کی تقریر سیدھی دل سے نکلتی ہے اور دل پر گرتی ہے۔ وہ اس سے کبھی سامعین کو مرعوب کرنا بلکہ بعض دفعہ تو یہ

محسوس ہوتا ہے کہ متاثر کرنا بھی!) نہیں چاہتے۔ اکثر اس طرح بولتے ہیں جیسے کچھ سوچ رہے ہوں، خود سے باتیں کر رہے ہوں۔ اپنے ذہن میں کوئی خیال صاف کرنا چاہتے ہوں اور اس کو لفظوں کا جامہ پہنا کر دیکھنا کہ وہ کیسا معلوم ہوتا ہے! ان کو انگریزی زبان پر تو غیر معمولی قدرت ہے۔ لیکن ہندوستانی میں تقریر کرنا انہوں نے زیادہ تر کانوں سے سُن کر اور زبان سے بول کر اور بقول خود کسانوں کو تختہ مشق بنا کر سیکھا ہے۔ اس لئے اگر اس میں ادبی چاشنی اور شوکت الفاظ کی کمی ہے تو خلوص کی بھٹی میں تپ کر ایک خاص سادگی اور سلاست کی کشش پیدا ہو گئی ہے۔ جس معاملے میں ان کا اپنا ذہن صاف ہوتا ہے وہ اس کو بڑے واضح پیرائے میں بیان کر سکتے ہیں اور خیال کو مختلف طریقوں سے پیش کر کے سننے والے کے دل میں بٹھا دیتے ہیں۔

اس موقع پر جو انہوں نے تقریر کی وہ بعض لحاظ سے بالکل انوکھی تھی یا کم سے کم مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ تقریر کے فن میں ایک نیا اور دلچسپ تجربہ کر رہے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ تقریر کے عام انداز اور آپس کی دوستانہ گفتگو کے بیچ میں جو فرق ہے اس کو اٹھا دیں اور ہزاروں کے مجمع سے اس طرح گفتگو کریں جیسے چند دوستوں سے بات چیت کر رہے ہوں۔ ایک حد تک تو یہ انداز ان کی اکثر پبلک تقریروں میں پایا جاتا ہے لیکن اس موقع پر تو انہوں نے اس انداز کو کمال پر پہنچا دیا۔ امریکہ کے صدر روزویلٹ بھی اکثر اپنے "آتشدان" کے پاس بیٹھ کر ریڈیو پر غیر رسمی انداز میں قوم سے خطاب کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی تقریروں میں بھی وہ بات پیدا نہ ہوتی تھی جو پنڈت جی کی اس تقریر میں نمایاں تھی۔

اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر کے شروع ہی میں کہا کہ سیاست کے میدان میں کام کرتے کرتے کسانوں اور مزدوروں کے ہر طبقے سے ملتے جلتے اور ملک کے ہر حصے میں گھومتے پھرتے ان میں آہستہ آہستہ کچھ ایسی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ جس مجمع میں یا ملک کے جس صوبے میں جاتے ہیں ان کا ایک حصہ بن جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے، وہ ایک حد تک ان کے دماغ سے سوچ رہے ہوں)، اور ان کے دل سے محسوس

کرر ہے ہوں۔ "جب میں دکھن جاتا ہوں جہاں کی زبانیں نہیں جانتا اور لوگوں کے سامنے ہندی یا انگریزی میں بولتا ہوں تو دل میں ایسا خیال ہوتا ہے جیسے میں ان کی بولی سمجھ رہا ہوں اور وہ میری، میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کی زبان کے بیشتر لفظ سمجھتے ہیں لیکن ان کے دل کی بولی مجھے صاف سنائی دیتی ہے"۔ . لیکن (انہوں نے مضمون بدلتے ہوئے کہا) مجھے کچھ عرصہ سے ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسے میرے اور آج کل کے نوجوانوں کے بیچ میں ایک دیوار سی بنتی جاتی ہے، جیسے مجھ میں اور ان میں کچھ فاصلہ پیدا ہو چلا ہو، وہ میری بات پوری طرح نہیں سمجھ پاتے اور میں شاید ان کی بات . . . یہ ٹھیک ہے کہ میں انیسویں صدی میں پیدا ہوا تم بیسویں صدی کی پیدائش ہو، مگر یہ کوئی ایسی وجہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے وچاروں اور بھاؤناؤں کو نہ سمجھ سکیں۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان دیواروں کو جو شاید ہمارے بیچ میں پیدا ہو گئی ہیں، گرا دوں۔ کچھ اپنی کہوں، کچھ آپ کی سنوں، جو کچھ دل اور دماغ میں بھرا ہوا ہے، اور دماغ میں خیال اور خواہشیں تو ہمیشہ بھری رہتی ہیں ان کو آپ کے سامنے رکھوں، آپ کے دماغ میں ڈالنے کی کوشش کروں۔ بہت سے کام سامنے ہیں۔ بڑے بڑے کام کرنے کی خواہش ہے اور وقت کم ہے۔ لیکن وہ کام کس طرح ہو سکتے ہیں جب تک آپ لوگ ساتھ نہ دیں، جب تک یہ اطمینان نہ ہو کہ جس ہندوستان کو بنانے کا خواب ہم دیکھ رہے اس میں آپ بھی شریک ہیں اور ہمارا ہاتھ بٹائیں گے اور ہمارے بعد اس کام کو آگے بڑھائیں گے . . "

میرا خیال ہے کہ اس تقریر کو جس نے بھی سنا اپنی جگہ پر یہ محسوس کیا کہ وہ خاص طور پر اس سے اپنے دل کی باتیں کر رہے ہیں اور اس کا وہی اثر ہوا جو ایک دل سوز اور مشفق دوست کی مخلصانہ گفتگو کا ہونا چاہیئے اور لطف یہ کہ اس میں کوئی خاص ناصحانہ انداز نہ تھا، نوجوانوں کی بے ضبطی اور ہیجان پرستی پر ناراضگی یا تنقید نہ تھی (حالانکہ انہیں دنوں کالجوں وغیرہ میں ڈسپلن کے خلاف کئی قابل اعتراض واقعات ہوئے تھے!) بلکہ ایک ہلکا سا اشارہ اس طرف تھا کہ وہ کبھی کبھی وقتی جوش یا غصے میں سخت بات کہہ جائیں تو اس کا زیادہ خیال نہ کرنا چاہیئے (اور پھر بڑی خوبصورتی

سے گریز کر کے ایک بنیادی اصول پر آگئے، دراصل کوئی معاملہ بھی سختی یا ڈانٹ ڈپٹ سے طے نہیں ہو سکتا خواہ وہ ذاتی معاملہ ہو یا قومی یا قوموں کے باہمی تعلقات کا۔ مسئلے تو صرف ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے سے، خیال کے لین دین سے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش سے طے ہو سکتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس قسم کا دل اور دماغ پیدا کرو۔ . .

اس تقریر میں کیا کچھ نہ تھا؟ اپنے خیالات اور اپنے ذہنی ارتقا پر تبصرہ تھا۔ دنیا کے موجودہ حالات کا تجزیہ تھا۔ اس میں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے جس دل اور دماغ کی ضرورت ہے اس کی تفسیر تھی۔ یہ بحث تھی کہ انسان کس طرح اچھا اور بُرا بن سکتا ہے۔ "ہم سب کیا تھے؟ معمولی اور چھوٹے آدمی لیکن گاندھی جی نے ہمیں بڑے بڑے کاموں میں لگایا اور بڑے بڑے مقصدوں کی لگن ہمارے دل میں پیدا کی اور اس طرح ان کی اور ان کے آدرشوں کی کچھ بڑائی ہمارے حصے میں بھی آگئی"۔ انہوں نے یہ سب باتیں اس انداز سے کہیں کہ بغیر ناصح یا محتسب کا جامہ پہنے بہت سے دلوں اور دماغوں میں وقتی طور پر ہی سہی، وہ شمع روشن کر دی جو ان کی ذات میں فروزاں ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ کبھی کبھی ریڈیو پر اس قسم کی تقریریں خاص طور پر نوجوانوں کے لئے کرتے رہیں تو ان کی ذہنیت میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ . .

تقریر کا کوئی طے شدہ بندھا ٹکا موضوع نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا خیال کی شمع کبھی زندگی کے ایک پہلو کی طرف مڑ جاتی ہے کبھی دوسرے کی، جن میں بظاہر کوئی تعلق نہیں۔ مگر انھوں نے خود ہی مسکرا کر کہا، تم سوچتے ہو گے کہ میں ذرا بے ربط سی تقریر کر رہا ہوں۔ لیکن یہ دراصل ایک تدبیر ہے تمہارے دماغوں کو ٹٹولنے کی تاکہ میں اندازہ کر سکوں کہ تم کیا سوچتے ہو، کیا کرنے کا ارادہ ہے، اور تمہارے سامنے زندگی کا کیا آدرش ہے۔ . . اس تقریر میں انہوں نے بہت سی بنیادی اور پتے کی باتیں کہیں۔ اگر ہمیں اپنی قومی زندگی کو شرافت اور سمجھ داری کی بنیادوں پر قائم کرنا ہے تو انہیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دینی ہو گی۔ ان کے بتائے ہوئے اصولوں اور قدروں کی سیوا کا عہد کرنا ہو گا۔ اور اپنے ضمیر کو ٹٹول کر دیکھنا کہ ہمارے قول اور فعل کہاں تک

اُن کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ کئی سال پہلے کی اس تقریر کا پورا مضمون تو یاد نہیں ہے لیکن چند اہم باتیں ابھی تک حافظے کی قندیل میں روشن ہیں۔

جمہوریت کی سچی تعریف کیا ہے؟ وہ ایک نظام حکومت ہے جس میں اختیار اکثریت کے ہاتھ میں ہوتا ہے لیکن اکثریت کا فرض ہے۔ کم گنتی والوں کے حقوق کی حفاظت کرنا۔

"اس مجمع میں ہندی جاننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے میں تقریر ہندی میں کر رہا ہوں۔ لیکن تھوڑے سے صرف انگریزی جاننے والے بھی ہیں ان کی خاطر میں انگریزی میں بھی تقریر کروں گا!"

اپنے خیال اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرو۔ سچی خوشی انہیں لوگوں کے نصیب میں آتی ہے جن کے خیال اور عمل کی دنیا میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ جب یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں تو ذہنی اور جذباتی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اگر تم کوئی بات ایمان داری کے ساتھ سوچ کر طے کرو تو تمہارا فکر بے ثمر نہ رہے گا۔ اس سے کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ اگر بغیر سوچے سمجھے کوئی کام کرو گے تو وہ بے وقوفی ہوگی اور نقصان اٹھاؤ گے۔

ہمارے خیالوں میں بلندی اور شوکت ہونی چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی ذات کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کریں اور ذاتی عظمت کے خواب دیکھیں بلکہ جو کچھ سوچنا ہے، جو کچھ کرنا ہے اس میں اونچے آدرشوں کو اپنے سامنے رکھیں۔ مثلاً سائنس کے میدان میں کام کرنا ہے تو آئن سٹائن کو اپنی قسمت کا ستارہ بنائیں۔ ڈاکٹر بننا ہے تو معمولی دوائیں دے کر روپیہ کمانے پر بس نہ کریں بلکہ مریضوں کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں اور ریسرچ کے ذریعہ لاعلاج بیماریوں کی دوائیں معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ نظر میں وسعت پیدا کرو۔ اب ایسے لوگوں سے کام نہیں چلے گا جو کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے شہر یا گاؤں یا ضلع یا ذات پات کے حلقے سے باہر کچھ نہ دیکھ سکیں۔ اب تو ایسی نظر کی ضرورت ہے جو نہ صرف اپنے ملک اور قوم بلکہ ساری دنیا کو دیکھ سکے اور ایسے دماغ کی جو سب کے بھلے بُرے کو سمجھ سکے۔

سب سے اہم بات یہ نہیں کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ کیا کرتے ہیں۔ سب سے

اہم بات یہ ہے کہ ہم خود کیا ہیں اور کیسے ہیں یعنی ہمارے من میں کس قسم کے خیالات اور جذبات اور آدرش ہیں جو ہمارے فکر اور عمل کی رہنمائی کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اب تک پڑھنے کی فضا پیدا نہیں ہوئی۔ ہمارے استادوں اور رودیارتھیوں میں بھی عام مطالعہ کا شوق نہیں۔ قوت فکر کی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ ہم شوق اور دلچسپی کے ساتھ اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ مگر یاد رکھو کہ پڑھنے کا مطلب صرف روزانہ اخبار یا گھٹیا ناول اور افسانے پڑھنا نہیں۔

سائنس نے طبعی قوت کے بے اندازہ خزانے ہمارے قدموں پر ڈال دیئے ہیں جن کی وجہ سے دنیا کا رنگ اور زندگی کا نقشہ بدل گیا ہے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے بدلتا جاتا ہے۔ اس تیزی سے بدلتی دنیا کو کسی پرانے بندھے ٹکے "ازم" (نظام فکر) کے چوکھٹے میں لگا کر دیکھنا ٹھیک نہیں، خواہ وہ سرمایہ داری ہو، سوشلزم ہو، مارکسزم ہو یا گاندھی ازم۔ دماغ کے دروازے بند کر کے آج کل کی انقلابی دنیا کو سمجھنے کی کوشش اپنے ساتھ بھی بے انصافی ہے اور دنیا کے ساتھ بھی۔ یہ دنیا ہمارے سامنے ایک زبردست چیلنج پیش کرتی ہے۔ ہمارا زمانہ اچھا ہو یا برا اس میں شک نہیں کہ یہ غیر معمولی طور پر اہم ہے۔ اس میں اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں میں قوت دماغ میں بیداری اور دل میں دیا کی ضرورت ہے۔

اپنے ملک کو تمام ملکوں سے بہتر اور اپنی قوم کو سب قوموں سے بلند نہ سمجھو۔ دنیا کے سبھی ملک بدقسمتی سے اس دھوکے میں گرفتار ہیں کہ صرف ان ہی کا ملک تہذیب کا شمع بردار ہے یا اس نے سب سے زیادہ یہ خدمت انجام دی ہے۔ اپنے وطن سے محبت کرنا قدرتی بات ہے اور اچھی بات ہے لیکن دوسروں کو ذلیل یا اپنے سے کمتر سمجھنا ذہنی بیماری ہے۔ دراصل ہر قوم میں اچھی اور بُری باتیں دونوں ہوتی ہیں، جیسے ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ کوئی فرد یا قوم نہ سراسر سفید ہوتی ہے نہ سیاہ۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ دوسروں کے عیب تلاش کرنے کی بجائے ان کی خوبیوں پر نظر کریں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ افسوس کے قابل ہیں وہ لوگ جن کو اپنی آنکھوں کا شہتیر نظر نہیں آتا لیکن دوسروں کی آنکھ کا چھوٹا سا تنکا بھی نظر آجاتا ہے اور وہ اپنی کمزوریوں

کو بھلا کر صرف دوسروں پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے ہیں۔

ہم لوگ کچھ بھی نہیں تھے۔ بالکل معمولی انسان تھے۔ لیکن گاندھی جی کی بڑائی کی چھوٹ ہم پر بھی پڑی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی خوبیوں کو ابھارا اور انہیں کسی نہ کسی حد تک اچھا اور بڑا بننا پڑا۔ انہوں نے ان کو بڑے بڑے مقصدوں کی جھلک دکھائی اور ان کی سیوا کا سبق پڑھایا گاندھی جی کا کمال یہ تھا کہ لوگوں کی خوبیوں کو ابھارتے تھے اور ان کی کمزوریاں اس ابھار میں چھپ جاتیں یا دور ہو جاتیں۔ اگر ہم زندگی کے اس تصور اور کام کرنے کے ان طریقوں کو بھلا دینگے جو انہوں نے ہمیں سکھائے ہیں تو نہ صرف ہماری آزادی خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ ہم اپنی انسانیت بھی کھو بیٹھیں گے۔

یہ بڑے پتے کی باتیں ہیں اور بیان کے انداز اور خلوص نے ان کو دل میں اس طرح بٹھا دیا کہ حافظہ آج تک اس تقریر کی چاشنی سے لطف اندوز ہے۔ مسلمانوں کے دینی راہبر علیٔ مرتضیٰ کا قول ہے کہ "یہ نہ دیکھو کہ کون کہتا ہے۔ یہ دیکھو کیا کہتا ہے"۔ یہ گہری حقیقت ہے لیکن بات کے ایک پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے یعنی اثر صرف بات کی سچائی کا نہیں بلکہ کہنے والے کی ذاتی سچائی کا بھی ہوتا ہے!۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

مردِ مومن

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد — ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے آوارہ نہ کر اپنی خودی کو — کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ (ان کی تعداد بے شمار ہے) جو ہوا کے رُخ کو دیکھ کر چلتے ہیں اور پانی کے بہاؤ کو دیکھ کر تیرتے ہیں اور دوسرے وہ (اور یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں لیکن زندگی میں انہیں کے وجود سے نمکینی ہے) جو اپنی عقل اور ضمیر کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرتے ہیں اور باوجود مخالفت اور مشکلات کے اس راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ دنیاوی کامیابی اور عیش و آرام اکثر پہلوں کے حصّے میں آتے ہیں لیکن حقیقی نیک نامی اور خدمت کی سعادت دوسروں کے قدم چومتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے زمانے کو نئی قدروں سے آشنا کرتے ہیں۔ اور انھیں کے طفیل زندگی کی نبض زیادہ تیز، اس کے امکانات زیادہ وسیع اور اس کی معنویت زیادہ گہری ہو جاتی ہے . . . . . ذاکر صاحب کا شمار ایسے ہی خلاق لوگوں میں ہے۔

قدرت انسانوں کے معاملے میں کبھی اپنی جزرسی کا اظہار کرتی ہے کبھی فیاضی کا۔ بیشتر انسان تو دل و دماغ کے اعتبار سے اس قدر گھٹیا ہوتے ہیں کہ ان کے وجود کی مصلحت کو سمجھنا ہی مشکل ہے لیکن کبھی کبھی قدرت بعض انسانوں کو ایسی فیاضی کے ساتھ نوازتی ہے اور اپنے خزانے

ان پر اس قدر بے دریغ نچھاور کرتی ہے کہ عقل حیرت میں رہ جاتی ہے اور ایمان کی لو زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ "اچھے انسان" کی جھلک ایسے لوگوں کی ذات ہی میں دکھائی دیتی ہے اور اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کے سامنے "انسان" کا کس قدر بلند تصور ہے جس شاعر نے نیاز مندانہ گستاخی سے دست قدرت کو طعنہ دیا تھا کہ مٹی کے کھلونے بنانا تیرے شایان شان نہیں (لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را!) اس نے بے صبری اور مصلحت ناشناسی کو یہ کہہ کر تسکین بھی دی تھی کہ

مشو نومید زیں مشت غبارے　　پریشاں جلوۂ ناپائیدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را　　تمامش می کند در روزگارے

جس طرح ہلال کی تنگنائے میں بدر کامل کا جمال جہاں آرا پوشیدہ ہے اسی طرح اس کم مایہ انسان میں وہ حیرت ناک امکانات موجود ہیں جن کا جلوہ ہمیں کبھی کبھی بعض خاصان خدا کی ذات میں نظر آجاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر ہمیں اس مہ و افلاک سے بلند تر منزل کا سراغ ملتا ہے جس کی طرف بڑھنے کی کوشش انسان ٹمٹماتی آنکھوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے کر تا رہا ہے۔ لیکن یہ راستہ اس قدر صبر آزما اور دشوار گزار ہے کہ ہزاروں مسافر ہر ہر قدم پر تھک کر رہ جاتے ہیں۔ صرف وہ تھوڑے سے لوگ اس منزل کے قریب پہنچ پاتے ہیں جن کو تائید الٰہی حاصل ہے . . . . ذاکر صاحب کا شمار انھیں گنے چنے لوگوں میں ہے۔ ان پر قدرت نے صورت اور سیرت، دل اور دماغ، شرافت اور ذہانت، دوستی اور قیادت کی غیر معمولی صفات ارزاں فرمائی ہیں لیکن وہ ان کو اس استغنا اور خود اعتمادی اور سادگی کے ساتھ برتتے ہیں کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کا اندازہ نہیں ہوتا اور گہری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کی بلندی اور عظمت گراں نہیں گزرتی! یہ چیز بجائے خود انسانی شرف کے لئے ایک بڑی سخت کسوٹی ہے۔ ذاکر صاحب ان لوگوں میں نہیں جو اپنی بزرگی کی دوکان لگا کر بیٹھتے ہیں اور خریداروں کو باصرار وہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو شاید خود بھی اپنی قدر و قیمت کا پورا احساس نہیں یا اگر ہے تو ایسا ہی جیسا گلاب کے پھول یا شب ماہتاب کو ہوتا ہے یعنی ان کے لئے خوشبو دینا اور روشنی پھیلانا عین فطرت ہے۔ اس کے لئے کسی تعریف یا معاوضہ کا مطالبہ ان کے

ذہن میں آہی نہیں سکتا!

میرا خیال ہے اور غالباً ذاکر صاحب کے بہت سے دوست اور جاننے والے اس سے اتفاق کریں گے کہ وہ جس شعبہ زندگی کو اپنے لئے اختیار کرتے اس میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت شہرت، مقبولیت اور کمال حاصل کر سکتے تھے۔ ایک اتفاق تھا کہ وہ ڈاکٹر ہونے ہوتے رہ گئے، طب کی تعلیم شروع کر کے چھوڑنی پڑی۔ ورنہ عجب نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کا زخم مندمل کر دیتے۔ فطرت کی ستم ظریفی نے ان کو ہندوستان کے غلام آباد میں پیدا کیا۔ اگر وہ کسی آزاد اور قدر شناس ملک میں پیدا ہوتے تو اس کی سیاسی زندگی میں ان کے لئے مقام اعزاز مخصوص ہوتا اور وہ ملک کی سیاست اور اخلاق کا ٹوٹا ہوا ناتہ جوڑنے کا فرض انجام دیتے۔ اگر وہ وکالت کا دولت آفریں پیشہ اختیار کرتے تو ان کی تقریر کی قابلیت، ان کی نکتہ رسی، ان کی حاضر جوابی حشو و زوائد سے گزر کر بنیادی امور کی گرفت ان کو صف اول میں جگہ دلاتی۔ ان میں سمجھداری ہے، خلوص ہے، ذاتی کشش ہے، اور یہ تینوں صفات مل کر انسان کو ایسی قوت بخشتی ہیں کہ وہ جس کام کو ہاتھ میں لے اسے ایک امتیازی شان کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ سمجھداری راستہ دکھاتی ہے۔ خلوص کا انعام تائید الٰہی ہے اور ذاتی کشش کی وجہ سے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کی رفاقت، وفاداری اور اعتبار کی دولت میسر آتی ہے اور کام کرنے میں سہولت ہوتی ہے . . . تعلیم کی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کے لئے اس کو اختیار کیا۔

لیکن کسی غیر معمولی قابلیت کے شخص کے لئے اس میدان کو پسند کرنا بجائے خود ایک خلاف توقع سی بات ہے کیونکہ اس میں بڑے صبر اور ایثار کی ضرورت ہے، انسان دوستی اور جذبۂ خدمت کی ضرورت ہے اور نفس کو مار کر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صفات بالعموم ایسے لوگوں میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ اپنی ذہنی قابلیت کی بہت اونچی قیمت لگاتے ہیں اور اسے بہت جلد دولت، قوت رسوخ، شہرت اور لیڈری کے سکوں میں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے لئے عام طور پر سیاست یا وکالت یا ملازمت کا میدان پسند کرتے ہیں جہاں یہ تمام چیزیں آسانی سے ہاتھ آسکتی ہیں یا کم سے کم

ایک دل کش سراب کی طرح دسترس کے اندر معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے بیشتر لوگ ان چمک دار نگینوں کی خاطر اپنا سب کچھ تج دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل کی گرمی اور دماغ کی روشنی جو شاید ان کے ہم جنسوں کی شب تاریک کو سحر کرتی محض ان کی زندگی کی تنگ کوٹھری کو گرم اور روشن رکھتی ہے۔ لیکن ذاکر صاحب ان غیر معمولی لوگوں میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ قوموں کے بنانے میں معلم کے خاموش اور جاں کاہ کام کی اہمیت ارباب سیاست کی تگ و دو اور شور و غل سے زیادہ ہے یعنی ان کو آتش بازی اور تاروں کی ٹھنڈی روشنی کا باریک فرق معلوم ہے! معلم انسانوں کے دل و دماغ میں ان بنیادی صفات کا بیج بو سکتا ہے جن پر نہ صرف پائدار سیاسی کامیابی کا انحصار ہے بلکہ جن کے بغیر سچی انفرادی اور جماعتی شرافت کا حصول ناممکن ہے۔ اگر افراد میں یہ صفات موجود نہ ہوں تو سیاست کی ساری کشمکش اور جدوجہد ایسی ہے جیسے ریت میں ہل چلانا یا سمندر کے پانی کو بلو کر اس میں سے دودھ نکالنے کی کوشش! ذاکر صاحب کا یہ انتخاب کار بجائے خود ان کی سیرت کے ایک روشن اور مرکزی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب انسان کے سامنے بہت سی راہیں کھلی ہوں اور ہر ایک زندگی کی کامرانیوں کو پیش کرتی ہو اور وہ تکلیف کو راحت پر، خدمت کو حکومت پر، ایثار کو دولت پر ترجیح دے تو وہ عقل دنیادار کی نگاہ میں عقل کا دشمن ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ اور انسان کی ترقی میں ایسے جنون کا مقام عقل سے کہیں بلند ہے:

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے　　جس نے سئے ہیں ادراک کے چاک!

ذاکر صاحب کے تعلیمی خیالات اور منصوبوں اور زندگی کے اصولوں پر مفصل بحث کرنے کے لئے ایک مفصل کتاب درکار ہے۔ اس وقت میرا مقصد محض چند ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہے جن کا تعلق ان کے تعلیمی کام اور ان کی ذات دونوں سے ہے۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے اصول اور عمل، عقیدہ اور پالیسی میں ہم آہنگی ہے۔ جن کا دل ان کے دماغ سے مصروف پیکار نہیں رہتا اور زبان دل کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی تمام شخصیت میں وہ توازن جاری اور ساری ہے جو یونان کے فلاسفہ اور اسلام کے معلمین اخلاق کی نظر میں انسانیت

کا بہترین جوہر ہے۔ اس لیے ذاکر صاحب کی شخصیت کو سمجھ لینے سے ان کے تعلیمی خیالات کی کنجی بھی ہمارے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔

میرے خیال میں ذاکر صاحب کی سب سے نمایاں صفت انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ ہے۔ وہ کاموں اور مقصدوں کی اضافی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگاتے ہیں بہت سی چیزیں جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں ان کی نگاہ اور ان کے دل کو کبھی مرعوب نہیں کر سکتیں۔ یہ بظاہر معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل ایک کمیاب صفت ہے اور خوش نصیب ہے وہ انسان جو آزمائشوں اور تحریصوں کی یورش میں اپنے نظام اقدار کو درست رکھے اور اس کی حفاظت کر سکے۔ دراصل تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ انسانوں کو قدروں کی پرکھ سکھائے۔ اس لئے ایک اچھے معلم کے ذہن میں انسان اور اس کی دنیا کی صحیح تصویر ہونی چاہیئے تاکہ وہ اہم اور غیر اہم، اصلی اور نقلی، سچی اور جھوٹی باتوں میں تمیز کر سکے۔ اگر اس کے خیال اور عمل میں غلط اور کم عیار چیزوں کی عزت اور محبت بسی ہو گی تو اس کے شاگرد بھی خود بخود انہیں چیزوں کا احترام کریں گے۔ ذاکر صاحب کی عظمت بحیثیت ایک معلم کے دراصل اس وجہ سے نہیں کہ ان کو موجودہ اور قدیم تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے بہت اچھی واقفیت ہے یا انہوں نے ایک بہت مشہور درسگاہ کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کو پروان چڑھایا ہے بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات ہماری بہترین اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی حامل ہے اور عصر حاضر کے شیطانی ہیجان میں انہوں نے اپنے مذاق سلیم اور احساس صالح کو قائم رکھا ہے اور یہ چیز علم اور عمل کے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ وقیع ہے!

آوازۂ خلیل ز بنیاد کعبہ نیست   مشہور گشت زاں کہ باتش نکو نشست!

ذاکر صاحب کی قدروں کا اندازہ آپ کو دو مثالوں سے ہو جائے گا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تعلیم کے میدان میں دولت کو علم کا خادم ہونا چاہیئے۔ علم کو دولت کا دست نگر نہیں بنانا چاہیئے۔ اگر ارباب دولت و حکومت اپنی دولت یا قوت کے بل پر تعلیم گاہ یا تعلیمی نظام پر قابض ہو جائیں اور اس کی آزادی کو

چھین کر اپنا آلۂ کار بنا لیں تو تعلیم کی روح مردہ ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے اصل مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔ ہندوستان میں تعلیم پر حکومت کا، مغربی ممالک میں دولت اور حکومت دونوں کا تسلط رہا ہے اور اس کے نتائج نگاہِ عبرت نے بار بار دیکھے ہیں لیکن ذاکر صاحب کی طرح کم لوگوں کو توفیق ہوئی کہ زبان سے نہیں (وہ تو آسان ہے!) عمل سے اس خطرے کے خلاف آواز بلند کرنے کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لئے انہیں ہمیشہ چندہ کرنے کی ضرورت رہتی تھی۔ ہندوستان میں کسی حساس شخص کے لئے یہ کام بہت مشکل اور صبر آزما ہے کیونکہ اس میں مانگنے والے کو مجبوراً اپنی خودداری کو آلودہ کرنا پڑتا ہے لیکن ذاکر صاحب کا چندہ جمع کرنے کا ایک نرالا انداز ہے اور اس کوئلوں کی دلالی میں بھی انہوں نے اپنے ہاتھوں کو پاک اور صاف رکھا ہے اور جامعہ کی روح کی عفت کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ابتدا میں تو انہوں نے اس مقصد کے لئے ارباب ثروت کی طرف رجوع ہی نہیں کیا بلکہ غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کا ایک ایسا حلقہ "ہمدردان" قائم کیا جو تھوڑا تھوڑا چندہ باقاعدگی کے ساتھ دیتے تھے اور رسالہ ہمدرد جامعہ کے ذریعے درسگاہ کے حالات اور اس کی ترقی اور مشکلات سے آگاہ رہتے تھے۔ اس طرح ابتدا سے جامعہ کا تعلق عوام کے ساتھ قائم ہو گیا جو ہر قومی ادارے کی صحت کے لئے ایک شرط لازم ہے۔ ورنہ اندیشہ یہ ہوتا ہے (جیسا بعض اداروں میں ہوا) کہ وہ ایک مخصوص اور غیر ذمہ دار گروہ کی اجارہ داری بن کر رہ جائے گا اور زندگی کی صالح تحریکیں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔ وہ جامعہ کے لئے ارباب دولت سے امداد کے خواہاں ہوتے ہیں تو ان کے انداز سوال میں عاجزی نہیں ہوتی گویا وہ کسی کا احسان اٹھا رہے ہیں۔ وہ دولت کے سامنے جھکنا جانتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دولت کی نجات اور سعادت اسی میں ہے کہ وہ علم کی خدمت کرے اور نیک کاموں کے قدم چومے ورنہ وہ اہل دولت کے گلے میں لعنت کا طوق ہے! ایک دفعہ ایک رئیس نے امداد کا وعدہ کر کے پورا نہیں کیا۔ رقم اچھی خاصی تھی اور اس کے نہ ملنے سے ان کے رفقائے کار کو پریشانی ہوئی اور انہوں نے مشورہ دیا کہ دوبارہ ملئے اور تقاضہ کیجیے۔ لیکن ذاکر صاحب کی پیشانی استغنا پر شکن نہ پڑی اور انہوں نے صرف اتنا کہا کہ

ایک وقت آئے گا کہ یہ لوگ خود خوشامد کریں گے اور چندہ دیں گے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ اگر نہ دیں گے تو؟ ذاکر صاحب نے فوراً اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا جس کی ظرافت میں بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی گہری حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے:" نہ دیں گے تو۔ خود ان کی ہوا خیزی ہو جائے گی!"
یہ بات نہیں کہ ان کو روپیہ کی قدر یا اس کی پروا نہیں۔ جن لوگوں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر اداروں کو چلایا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے کارکنوں کو روپیہ کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے اور کس طرح اس فکر میں ان کا دن کا آرام اور رات کی نیند جاتی رہتی ہے۔ جامعہ پر بارہا ایسے کٹھن وقت آئے ہیں جب بے زری کی پریشانی ایمان کی قوت سے ٹکرائی ہے۔ لیکن یہ مردِ مومن کبھی اس بات کے لئے تیار نہیں ہوا کہ روپیہ کی خاطر جامعہ کے مخصوص اور آزاد نصب العین پر آنچ آنے پائے۔ ایک دفعہ ذاکر صاحب جامعہ جوبلی کے سلسلہ میں چندہ کرنے کے لئے رامپور گئے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے جلسہ عام میں جو تقریر کی اس میں (دلچسپ بات ہے نا؟) چندہ مانگنے سے زیادہ اہل دولت کی تعلیم مدنظر تھی اور انھیں ان کے فرائض کا احساس دلانا۔ تقریر کا بے پناہ اثر ہر کسی کے چہرے پر نظر آتا تھا۔ بلکہ کسی کسی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر جامعہ کا کام اچھا نہیں ہے اگر چھان بین کرنے کے بعد آپ کو اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہے تو کسی سعی و سفارش سے آپ اسے ایک پیسہ نہ دیجیے لیکن اگر اس کی پچیس سالہ جد و جہد کو آپ نے دیکھا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کام ملک اور قوم کے لئے مفید ہے تو جامعہ کے کارکنوں کا فرض نہیں کہ دست سوال آپ کے سامنے دراز کریں۔ آپ کا اپنا کام ہے کہ آپ اس کی امداد کے لئے ہاتھ بڑھائیں جو قوم اپنے ایثار پیشہ خادموں کی قدر نہیں کرتی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں نہیں سوچتی اسے بشارت ہو کہ اس میں اس قسم کے کام کرنے والے پیدا ہی نہ ہوں گے اور اس کی زندگی محض کاروبار، دولت آفرینی یا باہمی جنگ و جدل کے دلدل میں پھنس کر رہ جائے گی۔ عام طور پر لینے والے کا ہاتھ نیچے اور دینے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے لیکن دولتمند کی سعادت یہ ہے کہ وہ علم اور تعلیم کی امداد کرتے وقت اپنا ہاتھ نیچے رکھے اور لینے والوں کا ہاتھ اوپر رہے۔ ذاکر صاحب کے فقر میں بھی یہ انوکھی شان ہے کہ اگر خانہ کعبہ کا دروازہ نہ کھلے تو وہ الٹے واپس

آجاتے ہیں اور اسی کا فیضان ہے کہ ارباب دولت اور مشاہیر سیاست ان سے جھک کر ملتے ہیں۔ انہیں مرعوب نہیں کر سکتے۔ ایک موقع پر جامعہ کا اصول حیات خود انہوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"مستقل سرمایہ جامعہ کا نہ ہے نہ کبھی ہوگا۔ اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمت اور ایثار اور قوم کی ہمدردی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں مگر میرے نزدیک تو یہ سرمایہ لازوال سرمایہ ہے۔ اگر جامعہ ملک و قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی۔ لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانون قدرت اسے زندہ رکھے گا اور دنیا کی کوئی قوت اسے فنا نہیں کر سکے گی۔" شاید ذاکر صاحب ان الفاظ کو کہتے وقت شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن شریف کے اس اٹل اصول کی تفسیر کر رہے تھے کہ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ!

اسی قسم کی ایک دل میں چبھنے والی بات انہوں نے اس یادگار موقع پر کہی تھی جب اوکھلے میں جامعہ کی شاندار عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ ذاکر صاحب کے ندرت تخیل کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ انہوں نے سنگ بنیاد مشاہیر ہند میں سے کسی سے نہیں رکھوایا بلکہ یہ عزت جامعہ کے سب سے کم سن طالب علم کے حصے میں آئی۔ دکھانا یہ مقصود تھا کہ ان کی نظر مستقبل کی طرف ہے جس کی تعمیر اس نژاد نو کا کام ہے جو آج مدرسوں میں تعلیم پا رہی ہے!) اس موقع پر انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا (الفاظ کی صحت کی ضمانت نہیں کرتا لیکن مفہوم یہی تھا)، بڑی بڑی شان دار عمارتوں کے بنانے میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں تعلیم کی روح ان میں اسیر ہو کر نہ رہ جائے اور ساز و سامان کی فراوانی تعلیم گاہ کے نصب العین کو دبا کر فنا نہ کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جامعہ کو چھوٹی چھوٹی کچی عمارتوں اور جھونپڑیوں میں شروع کیا گیا تھا اور اس کے کارکنوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس مادی بے سروسامانی کی حالت میں اس کی آزادی اور بلند نظری کو قائم رکھا جائے۔ اگر ان نئی عمارتوں کے بننے سے یہ اندیشہ ہو کہ جامعہ اپنے بلند نصب العین پر قائم نہ رہ سکے گی تو میں دعا کروں گا کہ یہ عمارتیں تیار ہونے سے پہلے ہی برباد ہو کر زمین میں مل

جائیں! جس زمانے میں افراد کی عظمت کا اندازہ ان کے لباس اور نمائشی شان سے اور درسگاہوں کی حیثیت کا اندازہ ان کی عمارتوں اور سازوسامان سے کیا جاتا ہو، اس قسم کا خیال ایک غیر معمولی صاحب نظر انسان کے دماغ میں ہی بیدار ہو سکتا ہے جس درسگاہ کے کارکنوں کو اس اندیشہ کا احساس ہو اور جس کا راہبر ذاکر حسین جیسا شخص ہو، اس کو یہ مصیبت پیش نہیں آسکتی۔ ایک درسگاہ میں وہی روح، وہی جذبہ اور وہی نظر کام کرتی ہے جو اس کے کارکنوں کے دل اور دماغ میں جلوہ گر ہے۔ ذاکر صاحب کے حریم ذات میں جو چراغ روشن ہے وہ صرف جامعہ ہی کو نہیں بلکہ تمام ملک اور قوم کو روشن رکھنے کی امنگ اور صلاحیت رکھتا ہے!

ذاکر صاحب کے دل میں عالموں اور علم کے خادموں کی بہت [illegible] ہے وہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ درسگاہوں میں انتظامی جماعت یا اہل ثروت ان کے ساتھ تنخواہ یاب ملازموں کا سا سلوک کریں۔ ایسا کرنا نہ صرف ان کی شان کے خلاف ہے بلکہ تعلیم کے کام میں بھی اس سے خلل پڑتا ہے۔ کیونکہ کارکنوں کو جس اطمینان خاطر، آزادی اور عزت نفس کے احساس کی ضرورت ہوتی ہے وہ انہیں میسر نہیں آتا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ درسگاہوں کا نظم و نسق زیادہ تر اس کے استادوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر کوئی عمدہ انتظامی جماعت ہو تو اسے اپنے معلمین کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے جو معزز شرکائے کار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ہر موقع پر ہمیشہ اس بارے میں سٹاف کے جائز حقوق کی علم برادری کی اور جہاں کہیں خمار دولت یا خمار قوت کے زیر اثر اساتذہ کے ساتھ شایانِ شان سلوک نہیں ہوا۔ انہوں نے نہایت دلیری کے ساتھ ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم گاہوں میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں استاد فکر معاش سے بے نیاز ہوں (گو خود انھیں اور اہل جامعہ کو اپنے ایثار کی وجہ سے یہ بات کبھی نصیب نہیں ہوئی۔) اپنا کام وقت اور توجہ تعلیم و تعلم میں صرف کر سکیں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترقی کرنے کے لئے جس تگ و دو اور ریشہ دوانی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے محفوظ رہیں۔ کس قدر مختلف ہے یہ تصور اس فضا سے جو آج کل عام طور پر ہمارے بیشتر مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں

پیدا ہوگئی ہے جہاں ذاتی اغراض و مقاصد، ذاتی ترقی اور تنخواہ، ذاتی اثر و رسوخ کی کشمکش میں تعلیم کی روح پنپ نہیں پاتی ہے۔ جامعہ کو جو کامیابی اور نیک نامی نصیب ہوئی اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس میں ذاکر صاحب نے قابل مستعد اور پرخلوص کارکنوں کی ایک ایسی جماعت اکٹھی کی تھی جس کے ساتھ وہ احترام، خلوص اور رفاقت کا برتاؤ کرتے تھے اور جس کو ان کی ذات کے ساتھ عقیدت تھی۔ ان کی ذاتی کشش کا فیض ہے کہ وہاں مدت تک بہت سے ایسے معلم کام کرتے رہے جن کو باہر بہترین مواقع مل سکتے تھے لیکن ان کے دل میں انھیں قدروں کی لگن تھی اور اسی عشق کا چراغ روشن تھا جو ذاکر صاحب کے سینے میں فروزاں ہے۔ اس لئے وہ جامعہ کو چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انھیں کبھی معاش کی طرف سے اطمینان نصیب نہیں ہوا لیکن اس کے بدلے انھیں اعتماد، رفاقت، عین پسندی کی دولت میسر تھی جو بعض مصلحت ناشناس لوگوں کے نزدیک مالی فراغت سے زیادہ قابل قدر چیز ہے! اگر ذاکر صاحب کی شخصی کشش ان کے دلوں کو جامعہ کی طرف نہ کھینچتی تو اس درسگاہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان درجنوں قومی درسگاہوں کا ہوا جو ۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریک کے بعد قائم ہوئی تھیں۔ قوم کے جوش اور ولولے نے ان کو وجود بخشا تھا اور قوم ہی کی غفلت اور استقلال کی کمی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب نے جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اس وقت وہ تقریباً نیم جان تھی اور اس کے بانیوں اور کارکنوں تک کے ذہن میں اس کا کوئی واضح تصور اور نصب العین نہ تھا۔ بعض اس کو ایک تعلیمی درسگاہ بنانا چاہتے تھے۔ بعض کی خواہش تھی کہ اس میں سیاسی کارکنوں کی تربیت کی جائے لیکن جہاں تک اس کی مالی اور انتظامی ذمہ داریوں کا تعلق ہے کوئی شخص بھی سوائے دو تین بندگانِ خدا کے جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی مدد کی، اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار نہ تھا بلکہ حکیم اجمل خاں کے بعد ایک وقت آزمائش کا ایسا آیا تھا جب تمام عمائدین ملک کی یہ رائے تھی کہ اس ادارے کے چلنے کا امکان نہیں ہے اس کو بند کر دینا چاہیئے لیکن ذاکر صاحب کی اولوالعزمی اور بلند نظری اور ان کے ساتھیوں کے ایثار نے اس شکست خوردہ رائے کو نہیں مانا اور گاندھی جی

کی ہمت افزائی کے طفیل خود اپنے بل بوتے پر وہ نہ صرف سخت کڑیاں جھیل گئے بلکہ جامعہ کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں اس نے ہند اور بیرون ہند کے اہل الرائے ماہرین تعلیم سے خراج تحسین وصول کیا۔

کارکنان جامعہ کی نظر میں جامعہ کا تعلیمی نصب العین اور مسلمانوں کی قومی زندگی میں اس کا وظیفہ کیا ہے؟ اس سوال کا مفصل اور واضح جواب دینا انھیں کا کام ہے۔ میں تو صرف ایک جھلک جامعہ کے اس نصب العین کی دکھانا چاہتا ہوں جو ذاکر صاحب کے ذہن میں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت کی اور ان کے متوسط اور اعلیٰ طبقے کو نئی تعلیم اور علوم جدیدہ کی طرف مائل کر کے ان کو ازمنہ متوسط کے جھٹپٹے سے نکالا اور عصر حاضر کا راستہ دکھایا۔ لیکن سرسید کے وقت سے اب تک زمانہ بہت بدل گیا ہے اور تعلیم اور تہذیب، سیاست اور معاشرت کے مسائل کو نئے انداز نظر اور نئی تفسیر کی ضرورت ہے۔ اُس وقت تعلیم کا مسئلہ ایک محدود سا مسئلہ سمجھا جاتا تھا یعنی اعلیٰ طبقے کے افراد کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کر دیجیے، ان کو اچھی نوکریاں دلا دیجیے، انگریزی نصاب اور مغربی علوم کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی تعلیم دینیات کی دیدیجیے اور بس، دین و دنیا دونوں کے مسئلوں کا حل ہو جائے گا! لیکن عصر حاضر کے مسائل اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اب کسی خاص جماعت کی تعلیم اور تہذیب کا سوال نہیں، عوام کی تعلیم کا سوال ہے۔ اب چند تعلیم یافتہ لوگوں کو نوکریاں دلانے کا سوال نہیں بلکہ قوم کی تمام افراد کی علمی، عملی اور فنی صلاحیتوں کی تربیت کر کے انھیں افراد کا سبہ بنانا ہے۔ زندگی کے تقاضے اس قدر شدید اور اس کا مقابلہ اس قدر سخت ہو گیا ہے کہ محض امتحان پاس کر لینے سے صلاحیت عمل کی سند نہیں ملتی۔ ضرورت ہے کہ ایک بہت بہتر اور مناسب تعلیم کے ذریعے ان کی ذہنی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ درسی تعلیم کی کچی پکی عمارت بنا کر اس پر دینیات کی سفیدی کا ایک ہاتھ پھیر دینے سے کام نہیں چلے گا بلکہ دنیا کو "ادب خوردہ دین" بنا کر زندگی کی گہرائیوں میں سے نصاب تعلیم کے لئے مواد فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ ماضی کی فرسودہ روایات اور قدامت پرستی کے آثار نے اس کھلی ہوئی حقیقت کو اس بیّن انقلاب کو نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا لیکن ذاکر صاحب کی تیز اور نکتہ رس

نگاہ نے اس کو بے نقاب دیکھا اور اس کی روشنی میں انہوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو مرتب کیا۔ ان کی درسگاہ ایک معمل یا تجربہ گاہ ہے جہاں عوام، بالخصوص عام مسلمانوں کے لئے صحیح اور اچھی تعلیم کا پیکر تیار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ استاد، طالب علم اور منتظمین سب مل کر آزادی کی فضا میں تعلیم کے حقیقی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب وہ ان بندشوں اور ذہنی پابندیوں سے آزاد ہوں جس میں ہندوستانی تعلیم نے گذشتہ سو سال میں نشوونما پائی ہے اور جن کی وجہ سے استادوں کی نظر امتحان اور نتائج کی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ طلبار کا تخیل حصول ملازمت کے چکر سے باہر نہیں نکلتا اور منتظمین افسران محکمہ کو خوش رکھنا اور ان سے مالی امداد حاصل کرنا اپنا مقصود اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ اذاکر صاحب نے انگریزی حکومت کے دور میں جامعہ کی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے پہلا بنیادی اصول یہ قائم کیا کہ اس کے لئے نہ حکومت کی امداد قبول کریں نہ اس کا چارٹر جس کے جلو میں مختلف قسم کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ ان کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے بقول شخصے "چوری کا کھٹکا" نہ رہا اور وہ علم کو علم کی اور تعلیم کو تعلیم کی خاطر حاصل کرنے کا مطلب سمجھنے لگے۔ دوسری طرف استادوں کو یہ موقع ملا کہ تعلیم کے ان پہلوؤں پر زور دیں جو قومی سیرت کی تعمیر کرتے اور عوام کی زندگی کو بناتے ہیں۔

اسی طرح قومی تعلیم کے میدان میں ذاکر صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اس کو ایک محدود اور روایتی تنگنائے سے نکال کر زندگی کے سمندر میں لاتے تاکہ وہ ان تحریکوں سے متاثر ہوسکے جو زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہو کر اس کو نئے تقاضوں سے مالا مال کرتی رہتی ہیں۔ نظری طور پر ہندوستان میں دوسرے لوگ بھی اس اصول کی تبلیغ کر رہے تھے۔ لیکن زبانی اور تحریری تلقین کی سہل پسندی کی بجائے ذاکر صاحب نے اپنے لئے عمل کا دشوار گذار میدان پسند کیا۔ اسی لئے میں نے کئی سال ہوئے اپنی ایک کتاب "مستقبل کے مدرسہ" کو ذاکر صاحب کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا تھا۔

"ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے نام جو خاموشی کے ساتھ مدرسہ مستقبل کی تشکیل کر رہے ہیں جب کہ دوسرے لوگ زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق محض تقریریں کرتے یا مضمون لکھتے ہیں!"

ذاکر صاحب نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جامعہ ملیہ کو قومی تعلیم کے لئے ایک نمونے کی درسگاہ بنائیں جہاں ایک سازگار ماحول میں مختلف قسم کے تعلیمی تجربے کئے جائیں اور ان کی روشنی میں قومی تعلیم کے اصول اور مقاصد اور اس کے نصاب اور منہاج کا تعین کیا جائے۔ اسی وجہ سے جامعہ کی توسیع کی جو اسکیم ان کے پیش نظر تھی اس میں مختلف درجے کی درسگاہوں کے لئے گنجائش رکھی گئی تھی۔ مثلاً ایک چھوٹے بچوں کا سکول۔ ایک مثالی نبیادی مدرسہ، ایک ثانوی مدرسہ جس میں تنوع تعلیمی نصاب رائج کیا جائے۔ ایک ٹکنکل سکول، ایک کالج، ایک تصنیف و تالیف کا ادارہ، چند تحقیقاتی ادارے جو ملک کی تہذیب کے مختلف عناصر کا ماہرانہ مطالعہ کریں۔

یہ تو ہوا ان کی جامعہ کا نصب العین۔ لیکن جب تک کسی تعلیمی نصب العین کو قوم اور ملت کے ساتھ وابستہ نہ کیا جاتے اس وقت تک اس میں معنویت اثر اور گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس بحث کے ساتھ ساتھ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے ذہن میں مسلمانوں کی سیاست کا کیا تصور ہے اور وہ ہندوستان میں ان کے لئے کس مقام کی توقع رکھتے ہیں؟ اس نازک اور ناروادار دور میں جب لوگوں نے اختلاف رائے کو مخالفت اور مخالفت کو جرم اور غداری سمجھ لیا ہے، ذاکر صاحب نے جس جرأت کے ساتھ اپنے خیال اور عقیدہ کی علم برادری کی وہ بجائے خود ایک دل چسپ نفسیاتی مطالعہ ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ اکثر جب کسی ملک میں سیاسی سیلاب آتا ہے تو ہر شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ہی جماعت کے وقتی خیالات اور جذبات اور تعصبات کو ایک اٹل حققت مان کر ان کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔ چنانچہ جس وقت ہندو اور مسلمان، چپ و راست کی سیاسی پارٹیاں، انگریز دوست اور انگریز دشمن سب ہی اس نامبارک ذہنیت میں گرفتار تھے ذاکر صاحب نے اپنا سوچا سمجھا راستہ نہیں بدلا اور مخالفت کی آندھیاں ان کے عقیدے کا چراغ نہیں بجھا سکیں۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ!

یہ عقیدہ کیا ہے؟ ذاکر صاحب کو اس تہذیب و تمدن سے گہری اور سچی محبت ہے جو ہندوستان میں اسلام کے حیات بخش اثر سے پیدا ہوئی اور ان کے دل میں اس فلسفہ حیات کا، اس علم و ادب کا، اس معاشرتی نظام کا زبردست احترام ہے جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں اس تہذیب و تمدن اور اس معاشرت اور فلسفے کے اصولوں اور قدروں کو پرکھنے اور ان کی مبصرانہ تفسیر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت بھی ہے۔ وہ ایک صاحب نظر مفکر کی طرح لفظوں کی سطح سے نیچے اتر کر معنی کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے اسلامی تصور حیات میں جہاں ایک سچے اور راسخ مسلمان کا عقیدہ جھلکتا ہے۔ وہاں اس میں عصر حاضر کی تحریکوں اور تقاضوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ عقیدہ ان کو بتاتا ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول چودھویں صدی ہجری میں بھی ایسے ہی سچے اور قابل عمل ہیں جیسے وہ پہلی صدی میں تھے لیکن عقل اور تجربہ اور حالات حاضرہ کا گہرا مطالعہ انھیں یہ بھی بتاتا ہے کہ چودھویں صدی میں ان اصولوں کا اعلان اور ان کی تفسیر چودھویں صدی کے مسائل اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہیئے۔ اس وجہ سے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل میں وہ "ترقی پسند" ہیں لیکن یہ وہ "ترقی پسندی" نہیں جو سفیل کے لئے بے صبری میں ماضی کے سرمائے کو ٹھکرا دیتی ہے بلکہ یہ تو جرأت کے ساتھ ماضی اور حال دونوں کا محاسبہ کرتی ہے اور اپنی تمدنی میراث کے بہترین عناصر لے کر ان سے مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اسی راہ وسط کو اختیار کرنے کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ جامعہ کو کسی خاص سیاسی پارٹی کے ساتھ وابستہ کریں اور شاید کوئی منظم سیاسی پارٹی ان کو اطمینان کے ساتھ ہضم بھی نہیں کر سکتی! پارٹی تنقید اور انفرادیت کی بجائے اطاعت اور پیروی چاہتی ہے، اسے حق سے زیادہ طاقت کی تلاش ہوتی ہے اور بدقسمتی سے ذاکر صاحب کی افتاد طبع ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ حق کو طاقت پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ یہ ستم کرتے ہیں کہ حق ہی کو طاقت سمجھتے ہیں!

ان کا سیاسی عقیدہ یہ ہے کہ قوم کی ترقی کے لئے تمام جماعتوں کو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی مکمل نشوونما کا موقع ملنا چاہیئے۔ انھیں کی ہم آہنگ تربیت میں قومی فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔ ہندوستانی تہذیب ایک مشترک کارنامہ ہے۔ اس کی نشوونما میں مختلف جماعتیں اور قومیں اور مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ شریک ہیں۔ اس اجتماعی کارنامے میں، جو ایک ہزار برس کے میل جول کا نتیجہ ہے، مسلمانوں نے بہت نمایاں اور قابل قدر حصّہ لیا ہے اور ذاکر صاحب اس مشترک ورثہ کو قائم رکھنے اور مالا مال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے یہ پوزیشن ہرگز شایان شان نہیں کہ وہ اپنی گزشتہ تاریخ اور روایات سے بے تعلقی اختیار کرلیں اور جس ملک میں انہیں جینا اور مرنا ہے اس کی سماجی اور سیاسی خدمت میں پیش پیش نہ رہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں ظلم ہے، بے انصافی ہے، جہالت ہے، توہمات ہیں، انسانوں میں نسل و رنگ کا امتیاز رائج ہے اس کو دور کرنا مسلمان کا مذہبی اور ملّی فریضہ ہے۔ خدمت اس کی سب سے بڑی سعادت ہے اور اس خدمت میں ہندو اور مسلمان کی، مشرق اور مغرب کی، سیاہ و سفید کی تمیز کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسی لئے انہوں نے جامعہ کی تعلیم کا مقصد اعلیٰ بنی نوع انسان کی خدمت کو قرار دیا ہے۔ اگر جامعہ کے صدر دروازے پر کوئی حسب حال موٹو لگانا ہو تو میرے خیال میں اس کے نصب العین کی بہترین توضیح اقبال کا یہ شعر ہوگا

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ذاکر صاحب کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ مسلمان ہندوستان کے مستقبل میں ایک نمایاں اور قابل فخر حصہ لیں اور اس مقصد کے لئے اپنے مذہب اور تہذیب و تمدن کے بہترین عناصر کو نہ صرف اپنی قومی خودی میں جذب کریں بلکہ ان کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب کو بھی مالا مال کریں۔ مانا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کمزور ہے (گو میں سمجھتا ہوں کہ جو جماعت ذاکر حسین پیدا کرسکتی ہے اس کی خاک میں ابھی بہت بجلیاں پوشیدہ ہیں)، لیکن اسلام کے کیسے میں اخلاق اور عمل کے بے نظیر نمونے ہیں جن کی اس دنیا کو، جو ظلم و جور سے بھر گئی ہے، بہت ضرورت ہے۔ یوں تو ہر جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرے لیکن مسلمان پر جو دنیا میں حق کے مبلغ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ فرض

خاص طور پر عائد ہوتا ہے۔ اسی طرح ذاکر صاحب چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستانی انصاف اور انسانیت کی اس جنگ میں کھلے دل سے حصہ لیں جو ہر ملک اور قوم میں مختلف شکلوں اور اندازمیں ہو رہی ہے۔ وہ تنگ نظر قومیت، مذہبی ناروا داری، نسلی تعصب، جغرافی حد بندیوں غرض ان تمام چیزوں سے بیزار ہیں جو انسان کو انسان سے جدا اور ان کی وحدت کو پاش پاش کرتی ہیں۔ افراد اور جماعتوں میں جو مختلف قسم کے تاریخی اور تمدنی فرق ہیں وہ ایک اچھی چیز ہے کیونکہ دنیا کی گوناگونی انہیں سے عبارت ہے۔ لیکن جب اختلاف مخالفت اور تعصب کی شکل اختیار کر لیں تو فتنہ کا باعث بن جاتے ہیں جو قتل سے بدتر ہے۔ اسی لئے ان کے نزدیک رواداری اور انصاف کی تلقین اچھی تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے۔ ذاکر صاحب ہی کے الفاظ میں اس فرض کی پرجوش تفسیر سنئے جو اس کے مذہب نے مسلمان کو سونپا ہے۔

"اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں۔ اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مامور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی سیاسی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر اور غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے۔ اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو ان فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب پہلے اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم واپس جائیں گے . . . ہمارے نوجوان روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے۔ پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہو گی بلکہ اپنے دین کی اور وطن کی خدمت ہو گی جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہ بجھے گی دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی یہ اپنے نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی، کہ کبھی دنیا اسے جنت نشان کہتی تھی سیوا کریں گے۔ اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے بیمار، بے کس، بے امید غلامام باسیوں کے سامنے انہیں اپنے رحمان و رحیم، رزاق و کریم، حی و قیوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا، کہ انہیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ ان کا وجود محدود نگاہوں کو اس کی شان ربوبیت پر ایک دھبہ سا معلوم ہوتا ہے"۔

ان الفاظ میں نہ صرف جامعہ ملیہ بلکہ تمام اچھے اداروں کے نصب العین کی روشن جھلک نظر آتی ہے۔

ذاکر صاحب کے نزدیک وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اس جذبۂ خدمت کو محدود کر کے مسلمانوں کے اسلامی اور پیغمبرانہ فرض کی حدبندی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے عمل اور اصول دونوں کا سرچشمہ قرآن شریف کی یہ آیت ہے کہ "تم میں ایک ایسی امت وسط ہونی چاہیئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے۔ انھیں نیک کام کرنے کی ترغیب دے اور برے کاموں سے روکے۔" یہ بڑا مشکل کام ہے کیونکہ نیکی کی طرف بلانے اور بدی کو روکنے میں اکثر دوستوں اور عزیزوں اور جماعت کی مخالفت مول لینی پڑتی ہے۔ لیکن اسلامی زندگی اور انسانی شرف دونوں کا تقاضا یہی ہے اور ذاکر صاحب کو قدرت نے جرأت اور دشوار پسندی کی دولت سے مالامال کیا ہے!

ذاکر صاحب چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف جماعتیں اپنی مخصوص انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک منظم، روادار اور فراخ دل قومیت کی بنیاد ڈالیں اور اپنے اپنے مخصوص تمدنی ورثے اور صلاحیتوں سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو فروغ بخشیں۔ اسی لئے انہوں نے جامعہ میں بیک وقت قومیت اور اسلامیت کی قدروں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ بے شک غلط قومیت اور اسلام، ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ لیکن سچی قومیت میں، جو وطن کی محبت اور اس کی خدمت کو ایمان کا جزو سمجھتی ہے (حُبُّ الوطن مِنَ الایمان) اور مذہب کی حقیقی روح میں کوئی بنیادی تناقض نہیں۔

انہوں نے عمل سے اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے کہ بیک وقت ایک اچھا مسلمان اور اچھا ہندوستانی ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ دونوں چیزیں دراصل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جو شخص واقعتاً ایک اچھا مسلمان ہوگا اس میں یقیناً وہ صفات ہونی چاہئیں جو ایک اچھے شہری کے لئے ضروری ہیں وہ نہ غلط اور تنگ نظر قومیت کے لئے اپنے مذہب کا سودا کرے گا۔ نہ مذہب کو اپنی تنگ نظری اور ناروا داری کی آڑ بنا کر تاریخی ارتقا کے سلسلے میں حارج ہوگا۔

لیکن جہاں وہ ایک طرف اس بات کے مخالف ہیں کہ مسلمان خود کو قومی زندگی کی دھارے سے علیحدہ کرلیں وہاں وہ سختی اور خلوص کے ساتھ اس اندھی تحریک پر بھی احتساب اور تنقید کرتے ہیں جو ہندوستان کی زندگی اور تہذیب میں سے ان قابل قدر عناصر کو نکال دینا چاہتی ہے جو مسلمانوں نے

گزشتہ ہزار برس میں ہندوستان کو بخشے ہیں۔ میں نے انہیں مسلمانوں کے مجمع میں وہ سچی اور کڑوی باتیں کہتے سنا ہے جن سے ہردل عزیزی کے بھوکے لیڈر جان بوجھ کر پرہیز کرتے ہیں میں نے انہیں افتراق اور اختلاف کی یورش میں اتحاد اور ہم آہنگی کی نامقبول تائید کرتے دیکھا ہے جس کی وجہ سے شاید بعض کوتاہ بیں اور سطحی لوگ جو عوام کی کمزوریوں کے ساتھ کھیل کر ان کے جذبات سے فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں، یہ سمجھتے رہے کہ ذاکر صاحب کے دل میں مسلمانوں کے لئے وہ تڑپ نہیں جو خود ان بزرگان ملت کے دل میں ہے! لیکن وہی ذاکر جب کسی غیر مسلم مجمع کو خطاب کرتا ہے یا کسی غیر مسلم لیڈر سے گفتگو کرتا ہے تو اسے اپنے مسلمان ہونے پر جو فخر ہے وہ اس کی ہر بات اور ہر انداز سے ٹپکتا ہے اور وہ ان سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت حیثیت کو تسلیم کریں۔

کاشی ودیا پیٹھ میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہے جس میں تقریباً تمام جمع ہندو حضرات کا ہے۔ اس جلسے میں خطبہ دینے کے لئے ذاکر صاحب کو مدعو کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں اس زمانے میں بہت سے مسلمان جانے سے بھی کتراتے کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ ایسے موقع پر کیا کہنا چاہیئے! اور بعض شاید وہاں پہنچ کر اپنی اسلامی ذہنیت کو بالارادہ پوشیدہ رکھتے۔ کیونکہ انہیں یہ چیز غیر متعلق معلوم ہوتی لیکن ایک بندۂ خدا ایسا بھی نکلا جو

کہتا ہے وہی بات سمجھتا ہے جسے حق   وہ ابلہِ مسجد ہے نہ تہذیب کا فرزند

چنانچہ اس اہم جلسے میں انہوں نے ایک غیر مسلم مجمع کو مسلمانوں کا نقطہ نظر ان واضح اور بے باک لیکن دل نشین لفظوں میں سمجھایا:-

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا

ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں ۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا:

گرچہ مثلِ غنچہ دل گیریم ما　　گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدّنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملّی وجود کو خود اپنے لئے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کئے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان انہیں ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے! ہندوستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے۔ وہ ان کے لئے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز "۔

لیکن جب وہ مسلمانوں کی کسی جماعت کو مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ شعار نہیں کہ جھوٹی تعریفوں اور لوریوں سے ان کی خود پسندی کو بیدار کر کے ان کی قوت احتساب کو سلادیں یا دوسروں کی عیب جوئی کر کے ان کی انانیت کو جھوٹا استحکام بخشیں۔ وہی بیدار مغزی اور روشن ضمیری جو اسلام کی حیات بخش قدروں کو بے نقاب دیکھتی ہے مسلمانوں کی چھپی اور کھلی ہوئی کمزوریوں کا محاسبہ بھی کرتی ہے اور انہیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ ان کے موجودہ مقام اور ان کے نصب العین میں کتنا زبردست فاصلہ ہے۔ لہٰذا اُس خطبے کے بھی یہ جملے قابلِ غور

ہیں جو ذاکر صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس جوبلی میں دیا تھا۔ یہاں مخاطب تمام تر مسلمان ہیں اور انہیں کی ثانوی تعلیم کا مسئلہ پیش نظر ہے :

"ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لئے بنائے ان کو دیکھئے۔ ہم کس معنی میں انہیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں . . کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے ؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے ؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے ؟ نہیں اور ہزار بار نہیں ! . . ایک ایسی دنیا جو نسل وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرمانروائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لئے بے تاب ہے جو ایک نبی امّی نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملت اسلامی اس نقدیر اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی ؟ . . . ایک بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خود دار اور آزاد جماعت کی طرح زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پچھتر سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا اور پچھلی مساعی کی تہ میں جو نصب العین کارفرما تھا اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔"

یہ نظر ثانی ، یہ تنقید جو انسان کو ماضی پرستی اور روایات کہنہ کی غلامی سے بچاتی ہے ، ہر بیدار مغز مفکر کا فرض ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر تعلیمی مفکر جزئیات اور غیر اہم مقاصد کے ایسے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ نہ بنیادی چیزوں کی طرف توجہ کر سکتے ہیں نہ ان میں غالباً اس کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے۔ بیسوی صدی میں کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں میں شاید ذاکر صاحب ہی ایسے عملی معلم اور تعلیمی مفکر ہیں جنھوں نے اس "فرض کفایہ" کو ادا کیا ہے۔ زمانہ کی ناسازگاری کی وجہ سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اس وقت ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو لیکن ایک مضبوط اور اچھے درخت کی طرح سچی بات میں یہ صفت ہے کہ وہ آہستہ آہستہ شور سر زمین سے سر نکالتی ہے اور

کبھی نہ کبھی اپنا اثر پیدا کر کے دم لیتی ہے۔ گو یہ بات یقینی ہے کہ بالآخر حق کا بول بالا ہو کر رہے گا، لیکن تقاضائے بشریت سے کبھی کبھی انہیں اس بات کا بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ملک کی سیاسی مخالفتیں اور چپقلش اس تعلیمی اور تہذیبی کام کو بارآور نہیں ہونے دیتیں جو وہ اور ان کے ہم خیال اس قدر صبر اور ایثار کے ساتھ سالہا سال سے کرتے آئے ہیں۔ ایک دفعہ بنیادی تعلیمی کانفرنس میں خطبہ دیتے ہوئے اس جذبہ کا اظہار بہت چبھتے ہوئے انداز میں کیا تھا:

"میں ان تعلیمی کام کرنے والوں کی ایک التجا اپنے ملک کے سب سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالئے جس میں قوم، قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن، تمدن، امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو، پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں . . . مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر، کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر، کچھ منوا کر، ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں۔ کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی؟ ہمارا کام بھی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں۔ اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں، اکثر دل ٹوٹتا ہے۔ پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی بھائی یک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی، جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں۔ کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں۔ کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں۔ کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجیے اور جلد کیجیے۔ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔"

کہنے والا کہتا رہا، اپنی سی کرتا بھی رہا، تحریر سے، تقریر سے، اپنی زندگی کی روشن مثال سے، اپنی مثال کے اثر سے، لیکن بہت سے سننے والوں نے ایک کان سے سنا، دوسرے کان سے نکال دیا۔ یا کان تھے لیکن ان سے سنا نہیں، آنکھیں تھیں لیکن ان سے دیکھا نہیں، دل تھے لیکن ان سے محسوس نہیں کیا اور اس کی پاداش دو ملکوں کے کروڑوں بندگان خدا آج تک بھگت رہے ہیں۔ لیکن ذاکر صاحب کی بتائی ہوئی قدروں اور اصولوں اور انسانی شرافتوں کا عَلَم اسی طرح بلند رہا اور ہے اور رہے گا!

ذاکر صاحب کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ جہاں تعلیم کے بنیادی اصولوں اور قدروں کی غیر معمولی پرکھ رکھتے ہیں وہاں ان میں یہ صلاحیت اور سلیقہ بھی ہے کہ وہ ان کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ ہمارے تعلیمی کارکنوں میں فکر و عمل، نظم و نظر کا یہ امتزاج مشکل سے ملتا ہے۔ ایسے ماہرینِ تعلیم ہیں جو خواب دیکھ سکتے ہیں، اپنے تخیل کی دنیا میں حسین محل تعمیر کر سکتے ہیں لیکن عمل کی سنگلاخ زمین پر نہیں اتر سکتے۔ مگر ذاکر صاحب ان "مردانِ حر" میں سے ہیں جن کی بابت شاعر نے کہا ہے:

مردِ حر سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر — خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے — کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر!

یہاں ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریوں سے مفصل بحث مقصود نہیں صرف ان کے چند بنیادی تصورات کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ان کا ایک بنیادی اصول ہے کہ فرد اور جماعت میں ایک نہایت گہرا رشتہ ہے اور انسانی ذہن کو اپنی تربیت کے لئے جس غذا کی ضرورت ہے وہ اسے جماعت کے تمدن اور اسی کی مادی اور غیر مادی تحصیلات ہی سے حاصل ہو سکتی ہے یعنی "اس کے علم سے، اس کی زبان سے، اس کے ادب سے، اس کی صنعت و دستکاری سے، اس کے نظامِ اخلاق سے، اس کے رسم و رواج سے، اس کی سماجی زندگی کے نمونوں سے، اس کے گاؤں شہروں اور قصبوں کی تنظیمات سے، اس کی موسیقی سے، اس کی مصوری سے،

اس کی تعمیرات سے، اس کی دکانوں سے، اس کے کارخانوں سے، اس کی بڑی شخصیتوں کی زندگی کے نمونوں سے، غرض اس کی تمام رنگارنگ تحقیقات سے۔" لہٰذا جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان میں سوئی ہوئی توانیاں اس میں جاکر بیدار ہو جاتی ہیں، اور اس کے لئے یہ دفینے اپنے منہ کھول دیتے ہیں۔" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو تعلیم ان تمدنی خزانوں سے بیگانہ اور ذہنِ اجتماعی کی ان زندہ تخلیقات سے بے نیاز ہوگی اس میں نہ حقیقت کا جلوہ دکھائی دے گا نہ زندگی کا شرارہ۔ وہ موجودہ ہندوستانی تعلیم کی طرح بالکل سطحی اور رسمی ہو کر رہ جائے گی۔ ہندوستانی تعلیمی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے اس ملک کی متنوع تہذیب کے سرچشموں سے کام نہیں لیا گیا بلکہ مغرب کی سطحی تقلید کی کوشش کی گئی۔ اس کی وجہ سے قوم کے تخلیقی سوتے خشک ہو کر رہ گئے اور تعلیم دفتری کاروبار سکھانے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکی اور قومی زندگی کا دھارا اس سے متاثر نہ ہو سکا۔ اسی لئے ذاکر صاحب نے اپنے خطبات میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کو جماعتی تہذیب و تمدّن اور اس کے مادی اور غیر مادی خزانوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

ساتھ ہی انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ افراد کی ذہنی اور جمالی اور علمی صلاحتیں بہت مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے مختلف ذہنوں کو ایک ہی غذا راس نہیں آسکتی۔ "ہر ذہن کو وہی چیز بھاتی ہے جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت سے مطابق ہو۔" اس حقیقت کو بھولنا (بقول ان کے) ایسا ہے "جیسے اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت دینے کی کوشش" ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بہت سی تحریکیں جنہوں نے مغرب کی تعلیم میں جان ڈالی ہے اسی اصول کی تفسیر ہیں۔

ایک اور اہم تحریک جس کے ساتھ ذاکر صاحب کا نام نمایاں طور پر وابستہ رہے گا تعلیم میں ہاتھ کے کام کی اہمیت اور اس کے مقام کا تعین ہے۔ بہت سے دوسرے ملکوں میں علم و عمل، کتاب اور کام کی یہ "جنگ" بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ لیکن ہندوستان

میں جو روایتی علم کا پجاری رہا ہے۔ جہاں ہاتھ کے کام کو اکثر ذلیل سمجھا گیا ہے، جہاں ذات پات کی تقسیم ایک حد تک کام کی نوعیت کی بنا پر کی گئی ہے، ابھی تک تعلیم کتاب اور لفظوں کے گورکھ دھندے میں گرفتار ہے اور بچوں کو ایک ایسے ناقص اور نامکمل نصاب کی پابندی کرنی ہوتی ہے جس میں نسل انسانی کے بعض نہایت اہم اور بیش قیمت تجربات کے لئے گنجائش ہی نہیں ذاکر صاحب نے پہلے جامعہ کی تعلیم میں اور اس کے بعد بنیادی قومی تعلیم کی سکیم کے ذریعہ یہ انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا کہ جو تعلیم ہاتھ کے کام کو اس کا صحیح درجہ نہیں دیتی اور اس کو انسانی تربیت کا ذریعہ نہیں بناتی وہ سراسر ناقص ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ نظریہ ذاکر صاحب کا ذاتی اجتہاد نہیں۔ اس کی ترتیب میں ان کے بہت سے نامور تعلیمی پیش رو شریک ہیں اور ہندوستان میں بھی جس وقت انہوں نے اس خیال کو پیش کیا۔ ان کے بہت سے ہم عصر اس کے موافق تھے۔ لیکن کسی نظریہ کو بیان کر دینا ایک بات ہے اور اس کا علمی، عملی اور فلسفیانہ پس منظر سمجھنا اور سمجھانا اور تعلیم کے عمل میں اس کی چولیں ٹھیک بٹھانا اور بات ہے۔ اس خیال کی وضاحت اور علم اور تجربے کے رشتے کی تفسیر جس انداز سے ذاکر صاحب نے کی۔ اس سے ہماری تعلیمی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

"ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جس کے لئے دوسرے کام کرتے ہیں، ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے خبر کی حیثیت سے۔ ایک واقفیت ہوتی ہے جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربے سے حاصل ہوتی ہے، جزو ذہن بنتی، ذہن کو روشن کرتی، اس میں نظر پیدا کرتی ہے.. روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور، اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے، نہ روح کو بالیدگی، اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لئے ایک خوش نما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا۔ آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار ذہن کو تربیت دیتا ہے۔ روح کو پرورش کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے... جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے

اس کی تعلیم گاہوں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا کہاں کی دانش مندی ہے سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی وقت ممکن ہے جب یہ مدرسے گنتی کے چند خود غرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سوادِ اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں۔"

اور پھر کام کی اخلاقی، سماجی اور عملی اہمیت کو جس خوبصورتی اور زور کے ساتھ انہوں نے اپنے بنیادی تعلیم والے خطبے میں بیان کیا ہے اس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی:۔

"جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند ضرور ہو جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے اپنا مزہ نہیں ڈھونڈھتا۔ اس سے وہ آدمی بنتا ہے، اپنا اخلاق سنوارتا ہے . . . کام کی یہ صفت ہاتھ کے کام میں ہو سکتی ہے اور دماغ کے کام میں بھی اور ہاتھ کا کام بھی اس سے خالی ہو سکتا ہے اور دماغ کا بھی، کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیئے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا، کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں۔ کام کھیل نہیں، کام کام ہے، بامقصد محنت ہے۔ کام دشمن کی طرح اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔"

یہ خیالات اور جذبات خواہ کسی کے قلم سے نکلیں ان کے سحر سے متاثر ہونا ناگزیر ہے لیکن جب یہ اس شخص کے قلم سے نکلیں جس نے پہلے ان کو اپنے دماغ میں سمویا ہو، پھر اپنے دل میں جگہ دی ہو، پھر اپنی زندگی میں برتا ہو، اس وقت ان میں عقیدہ اور عمل کے خلوص کا بے پناہ اثر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی عظمت کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے عمر بھر کام کیا ہے اور اعلیٰ قدروں کی سیوا میں کام کیا ہے اور اس وجہ سے ان کے کام کی اہمیت بہت بلند ہو گئی ہے۔ ورنہ صرف کام کرنے سے خواہ کتنا ہی ان تھک کیوں نہ ہو کوئی انسان اخلاقی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ ذاکر صاحب کی نظر میں تعلیم کا سب سے بڑا، سب سے اہم، سب سے بلند مقصد یہ

ہے کہ وہ نوجوانوں کو سیوا کی زندگی کے لئے تیار کرے اور اس غرض پرستی اور تنگ نظری کے خلاف جہاد کرے جو عصر حاضر کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگئی ہے وہ اس بات کو کافی نہیں سمجھتے کہ تعلیم افراد کی صلاحیتوں کی نشو و نما کرنے کے بعد انہیں آزاد چھوڑ دے کہ وہ جس طرف چاہیں ادھر کا رُخ کریں اور ان کی سعی و عمل کی کوئی منزل کوئی رُخ معین نہ ہو۔ در اصل صحیح مقصد کا تعین ہی انسان کی صلاحیتوں اور ہنرمندیوں کو فرد اور سماج دونوں کے لئے برکت کا باعث بناتا ہے۔ ورنہ محض ذہانت اور چالاکی کا اظہار سٹے بازی میں بھی ہو سکتا ہے اور سائنس کے کمالات جس زور شور سے جنگ کی غارت گری میں دکھائے جا رہے ہیں ان کی مثال کسی امن کے شغل میں نہیں ملتی۔ ذاکر صاحب نے ایک دفعہ اپنے خطبے میں جو انہوں نے پنجاب کی ایجوکیشن فیلوشپ کے سامنے دیا تھا۔ جامع اختصار کے ساتھ سماج کی کھلی ڈھکی چوریوں کو ایک ایک کر کے گنوایا تھا اور ان کا سبب اسی بنیادی خود غرضی کو قرار دیا تھا جس نے ہماری ساری انفرادی اور جماعتی زندگی کو کھوکھلا اور اخلاقی اعتبار سے ناقص کر دیا ہے۔

خدمت کے نصب العین پر ذاکر صاحب کو اس قدر اصرار کیوں ہے؟ نہ صرف اس لئے کہ اخلاقی زندگی کی عمارت اس صالح بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان میں اپنے ملک کی بے شمار محرومیوں اور بدنصیبیوں کا، اس کے جہل اور افلاس کا، اس کی بیماری اور بیکاری کا اور اس کی تمام پستیوں کا نہایت شدید اور گہرا احساس ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس روشن مستقبل تک پہنچنے کا، جس کی تصویر ان کے نہاں خانہ دل میں سجی ہوئی ہے صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے خدمت کا پل جو ہمارے حال کو ہمارے مستقبل سے ملائے۔ جب تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان تمام خرابیوں کے خلاف جہاد نہیں کرے گا اور قومی زندگی کو صدیوں کی غلاظت سے پاک نہ کرے گا، اس میں صفائی، فراخی اور شرافت پیدا نہ ہو سکے گی۔ جو شخص باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اس جہاد سے جی چراتا ہے، سماج سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن اس کی خدمت نہیں کرتا، جو شخص لینے کے لئے ہر وقت تیار ہے دینے کو آمادہ نہیں وہ نظر حقیقت شناس میں ایک ذلیل سماجی مجرم ہے۔ یہ امتحان گویا افراد اور جماعتوں

دونوں کے لئے حساب اور میزان ہے یا ایک پل صراط ہے جس پر ذرا لغزش ہوئی اور دوزخ کی گہرائی میں جا پہنچے۔

ایک دفعہ ذاکر صاحب کو جن کی گوناگوں شخصیت ہر موقع کو خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نباہ سکتی ہے، ایک طبیہ کالج کے تقسیم اسناد کے جلسے میں مدعو کیا گیا۔ اس اجنبی ماحول میں بھی انہوں نے طلبہ سے فن طب اور اس کے وسیع سماجی علائق کے متعلق ایسی نکتہ رس باتیں بیان کیں جو شاید کسی ماہر فن کے خیال میں بھی مشکل سے آتیں۔ اس موقع پر انہوں نے خاص کر کے خدمت کے آئیڈیل پر زور دیا اور اس کی وجہ اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کی:

"یوں تو کوئی اپنی آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے تو کوئی اس کا کیا کر سکتا ہے، پر آپ کے چاروں طرف جو بیماری پھیلی ہوئی ہے، افلاس اور فاقے نے عام صحت کا جو حال کر رکھا ہے۔۔ اس کا احساس آپ کو ہوگا تو آپ چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔ زندگی کی بپتا، دکھ اور بیماریاں ہم سے اتنی قریب ہیں کہ اکثر ہم ان سے غافل ہو جاتے ہیں۔ آہیں اتنے سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا ان سے بھر جاتی ہے اور ہم انہیں سُن نہیں سکتے اور شاید اپنی زندگی گذارنے کے لئے یہ ٹھیک ہی ہوگا۔ اس لئے کہ اگر احساس قوی ہو، ہر آہ سنائی دے اور ہر دکھ دکھائی دے تو ایسا ہو جائے جیسے کوئی گھاس کے اگنے اور بڑھنے کی آہٹ سننے لگے اور ہر جاندار کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگے اور شاید ہم اس ہیبت ناک شور کی تاب نہ لا سکیں جو بپتا کے اس سناٹے میں چھپا ہوا ہے۔۔۔ میری التجا آپ سے یہ ہے کہ اس دکھ کو دور کرنے کے لئے آپ کمر باندھیں۔۔ آپ کے سامنے ایک مہتم بالشان کام ہے مضبوط دل اور بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام ہے۔ خود غرضوں کے لئے پیسے کمانے کا موقع (بھی) ہے مگر ان کے سینے پر ہمیشہ یہ بوجھ رہے گا کہ انہوں نے اپنے بنی نوع، اپنے ہم قوموں کے افلاس، جہل، غلامی، بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ دھات کے سکے جمع کر لئے اور اپنی قوم کو اس سے نجات دلانے کے مبارک کام میں ہاتھ نہ بٹایا۔۔۔ دولت کے زنگ سے قومی زندگی کے جوہر کو محفوظ رکھنے کے لئے کوئی چیز اتنی موثر نہیں ہوتی جتنا کہ بے غرض کام کرنے والوں کا ایسا گروہ جو اس کے طوق زریں کا

آرزومند نہ ہو بلکہ جس کی ساری توجہ حق کی تلاش، سچ کے پرچار اور انسانوں کی خدمت کے لئے وقف ہو۔"

اس ضمن میں اس عظیم الشان کارنامے کا ذکر بھی ضروری ہے جو ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کے میدان میں انجام دیا۔ اس طریقۂ تعلیم کا خیال اپنی ابتدائی شکل میں مہاتما گاندھی کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ سیاست اور سماجی اصلاح کے سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں اور زندگی کے صالح تقاضوں کے ساتھ اس کا صحت مند رشتہ قائم نہ کیا جائے۔ گذشتہ دو سو برس سے یہ رشتہ ٹوٹ گیا تھا اور تعلیم کتاب اور لفظوں کے گورکھ دھندوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کام جو اس میں جان ڈالتا ہے، جو شخصیت کی تربیت کرتا ہے سکول کی چار دیواری کے اندر بار نہ پا سکتا تھا۔ اس لئے انھوں نے قوم کے سامنے ایک تعلیم کا ایک ایسا تصور پیش کیا جو علم اور عمل میں، ہاتھ کے کام اور کتابی تعلیم میں، جسم اور دماغ میں، فرد اور سماج میں اور سماج کے مختلف طبقوں میں جو تضاد پیدا ہو گیا ہے دور کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ جب ان کی بلائی ہوئی کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی گئی تو اس کے ایک ممبر ذاکر صاحب بھی تھے۔ ان کی ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد قابلیت اور خلوص اور خوبی تقریر سے ہر کمیٹی اور کانفرنس پر چھا جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی وہی حادثہ پیش آیا۔ کانفرنس بحیثیت مجموعی ان کے خیالات سے کافی متاثر ہوئی اور اس لئے گاندھی جی کی نظر انتخاب نے ذاکر صاحب کو اس کمیٹی کی صدارت کے لئے چنا جو سکیم کو مرتب کرنے کے لئے بنائی گئی۔ چنانچہ ان کی قیادت میں قومی تعلیم کی وہ اسکیم تیار ہوئی جو بنیادی تعلیم کے نام سے مشہور ہے اور خواہ اس میں کتنی ہی ترمیم اور تبدیلی ہو، مجھے یقین ہے کہ اس پر ان کی چھاپ قائم رہے گی۔ انہوں نے اپنی دوراندیشی اور تعلیمی نظر سے کام لے کر اس اسکیم کو، جو اس وقت تک سرکاری حلقوں میں مردود اور عام تعلیمی حلقوں میں مشتبہ تھی، بڑی حد تک حشو و زوائد اور افراط و تفریط کی آمیزشوں سے پاک کیا اور اپنی قوت استدلال سے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کے ممبروں اور دوسرے ماہرین تعلیم کو اس کی تائید پر آمادہ کیا۔ گاندھی جی کے خیالات تو ایک

خلاق ذہن اور زندگی کے نبض شناس کے خیالات تھے ۔ ذاکر حسین کمیٹی نے ان کو تعلیمی تصورات اور
جانی بوجھی تعلیمی اصطلاحوں کے سانچوں میں ڈھالا اور اس کی معنویت کو اجاگر کیا اور اس طرح ایک تعلیمی
صناع کی تراش وخراش کے بعد وہ اس شکل میں قوم کے سامنے آئی کہ فنی نقطۂ نظر سے اس پر جو بنیادی
اعتراض کئے جارہے تھے وہ بڑی حد تک بند ہو گئے لیکن بعض اعتراض، باوجود اس تمام کوشش کے
جاری رہے جن کی تشریح اور تنقید کا نہ یہاں موقع ہے نہ ضرورت ۔ ان میں ایک اعتراض یہ تھا زیادہ تر
ان لوگوں کی طرف سے جن کی اپنی زندگی کتاب اور لفظی تعلیم کے طلسم میں اسیر رہی تھی) کہ اس میں ہاتھ
کے کام کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اس کو ابتدائی تعلیم کے ایوان میں مقام اعزاز دیا گیا
تو مدرسے کارخانے بن کر رہ جائیں گے ۔ تعلیم کے حقیقی اصولوں اور مقصدوں کو اسکیم کے اقتصادی
اغراض پر قربان کر دیا جائے گا، بچوں کی ذہنی تربیت ناممکن ہو جائے گی اور ہمارا نیا نظام تعلیم اقبال اور
ٹیگور جیسے افراد پیدا نہ کر سکے گا!

ذاکر صاحب نے گزشتہ پچیس برس میں یعنی جب سے اس اسکیم نے جنم لیا، مختلف طرح سے
بڑے دل کش اور دل نشین انداز میں اس حقیقت کو سمجھایا کہ انسان کی زندگی میں کام کا کیا مقام ہے،
وہ کام جو دیانت داری اور صداقت، مستعدی اور ذہانت کے ساتھ کیا جائے ۔ اور خود جامعہ کے تعلیمی
نظام اور اس کے مختلف اداروں میں وہ عملاً دس بارہ سال پہلے سے اسی اصول پر عمل کرتے رہے
تھے ۔ ان کا کہنا ہے کہ بچوں کے ذہن کی بیداری، سیرت کی پختگی، تخلیقی قوتوں کے آغاز اور جماعتی
زندگی سے صالح رشتہ قائم کرنے کا بہترین ذریعہ کام ہی ہے ۔ اجتماعی تہذیب و تمدن کے بہترین
عناصر کو فرد اسی طرح اپنی ذات کا جزو بنا سکتا ہے کہ وہ مختلف طرح کے کام کرے، ان میں نظر اور مہارت
پیدا کرے اور ان کی قدروں کو اپنے اندر جذب کرے ۔ انہوں نے کام کو، جو اس سپرٹ میں کیا جائے
ریاضت اور عبادت کا درجہ دیا جائے ۔ اس بارے میں ان کا قول میں درج کر چکا ہوں خیال نیا نہیں، مذہب
اور فلسفہ نے اور بعض ماہرین تعلیم نے بھی اس کو وقتاً فوقتاً مختلف انداز سے پیش کیا ہے لیکن ہمارے سماج
میں جو ذات پات کے بندھنوں میں گرفتار ہے اور جہاں بہت سی سماجی اور اقتصادی وجوہ سے ہاتھ کے

کام کو ذلیل سمجھا گیا ہے، اس صداقت کو، اس عقیدے کو از سرِ نو مضبوطی اور قابلیت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ ذاکر صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا۔

انھوں نے بنیادی تعلیم کی محض تفسیر اور تعبیر ہی نہیں کی بلکہ اس کے مشکل اور دشوار گذار راستے میں جہاں بار بار غلطیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں، قدم قدم پر اس کی رہنمائی بھی کی۔ جب اندیشہ ہوا کہ یہ تحریک ایک عقیدے کی سی عصبیت اختیار کرے گی تو انہوں نے استادوں کی آزادیٔ رائے اور عمل اور تجرباتی ذہنیت کی تائید کی۔ جب بقول ان کے "دودھ میں اس قدر پانی ملا یا گیا" کہ سکیم میں صرف پانی کا مزہ باقی رہ گیا تو انھوں نے اس کے بنیادی اصولوں کی یاد کو تازہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہاتھ کے کام کو محض خانہ پری کے طور پر شامل کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ کام کو اس کے تمام آداب اور شرائط اور احترام کے ساتھ کرنا لازم ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بچے سکول میں جو چیزیں بنائیں وہ ہر لحاظ سے اتنی اچھی ہونی چاہئیں جتنی وہ انھیں بنا سکیں اور اس قابل کہ انھیں بازار میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ جب تک وہ اس طرح کام نہ کریں گے نہ ان کی شخصیت کی تربیت ممکن ہے۔ نہ ان میں صحیح قدروں کی لگن پیدا ہوگی۔ یہ بات ضروری ہے خواہ بعد میں انہیں فروخت کرنے کی بجائے سمندر ہی میں کیوں نہ پھینک دیا جائے! جب کبھی بنیادی تعلیم کو ناسمجھ اور تخیل سے عاری استادوں اور "ماہرین تعلیم" نے اس طرح چلا یا کہ ڈھانچا رہ گیا اور روح نکل گئی انہوں نے جرأت کے ساتھ انہیں ٹوکا کہ اس طرح کے مدرسے چلانا ریاکاری ہے یا انھیں صحیح اصولوں پر چلاؤ ورنہ بند کر دو۔ ابتدا سے اب تک ان کا رویہ اس تحریک کے ساتھ انصاف کا رہا ہے جنبہ داری کا نہیں!

یہ خیال غلط ہوگا کہ ذاکر صاحب کو اپنے کام میں مخالفتوں اور بدگمانیوں کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ ان کی دیانت خلوص اور قابلیت پر شاید ان کے بدترین مخالفوں اور نقادوں نے بھی شبہ نہیں کیا لیکن جامعہ کے کام اور اس کے بعد بنیادی تعلیم کی سرگرمی کے سلسلے میں ان پر بہت سی بدگمانیاں اس وجہ سے کی گئیں کہ وہ اس وقت ایک لحاظ سے مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے جدا تھے وہ جانتے تھے کہ کانگریس

اور لیگ میں جو رسہ کشی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہر سوال کو ایک خاص فرقہ واری نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کسی چیز کو انصاف کی ترازو میں نہیں تولا جاتا۔ مثلاً ان پر ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ انھوں نے خود کو ایک ایسی تحریک کے ساتھ وابستہ کیا جو گاندھی جی سے منسوب تھی۔ اس کا ایک مختصر جواب تو یہ ہے کہ "حکمت تو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے جہاں کہیں وہ اسے مل جائے وہ اس کا حقدار ہے۔"
اگر حکمت کا کوئی پہلو، تعلیمی صداقت کی کوئی کرن ذاکر صاحب کو گاندھی جی کے سرچشمۂ فیض سے ملے تو وہ اس کو کیوں قبول نہ کریں؟ ناواقفوں اور ناسمجھوں کے اعتراض کی وجہ سے کسی چیز کو مسترد کرنا دانشمندی کا ثبوت نہیں، تعصب کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ بھی یاد رہے کہ اس خاص تعلیمی تحریک میں ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے جس قدر لیا اس سے بھی زیادہ دیا اور بنیادی قومی تعلیم کے تصور پر ان کا نقش اس طرح ثبت ہے کہ اس طرح مٹایا نہیں جا سکتا۔ رہے محض جہالت کی گود میں پلے ہوئے اعتراض، تو ان کی ذاکر صاحب نے کبھی پروا نہیں کی۔ آخر جاننے والوں کیلئے نہ جاننے والوں کی رائے تو سند نہیں ہو سکتی۔
ایک دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جب اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کے لئے گنجائش نہیں تو انھوں نے کیوں اس کی تائید کی۔ اس اعتراض کا جواب تو وقت اب تک کافی وضاحت کے ساتھ دے چکا ہے اور اعتراض کرنے والوں پر یہ بھی حقیقت روشن ہو گئی ہے کہ ایک غیر مذہبی (سیکیولر) ریاست کے سرکاری مدرسوں میں باقاعدہ "مذہبی تعلیم" کا انتظام کرنے میں کیا کیا اور کس قدر خطرے ہیں۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ارباب اقتدار نے مذہب اور مذہبی تعلیم اپنے مفاد مخصوص کے لئے استعمال کیا ہے اور ذاکر صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں سرکاری طور پر مذہبی تعلیم کا انتظام کر کے یہ خطرہ مول لیا جائے۔ اس لئے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ مسلمان جو مذہب سے شغف رکھتے ہیں خود مذہبی تعلیم کا ایک آزاد نظام قائم کریں اور اس کو ایک جماعت کی حیثیت سے چلائیں۔ لیکن اس وقت کی مخالفت تو زیادہ تر محض مخالفت کی خاطر تھی اور ان کی اس مناسب تجویز پر کوئی موثر اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ ایک دفعہ حکومت ہند کے مرکزی تعلیمی بورڈ کی ایک کمیٹی میں مذہبی تعلیم کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی؟ ہونی چاہیئے یا نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے کیا فوائد ہیں اور کیا خطرے؟

ذاکر صاحب نے مضبوطی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، اس کی اہمیت جتائی اور بتایا کہ کسی نہ کسی مناسب شکل میں اس کا انتظام ضروری ہے۔ لیکن بالآخر کثرت رائے سے یہ طے ہوا کہ مشترک مدرسوں میں تمام مذہبوں اور فرقوں کی تعلیم کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ جلسہ ختم ہونے پر ایک ممبر جو مذہبی تعلیم کی حمایت میں بہت سرگرم تھے ذاکر صاحب کے پاس آئے اور بولے " ذاکر صاحب آپ نے تجویز پیش کر کے مسلمانوں کے لئے مختصر سا ایک رسالہ دینیات کا نصاب میں رکھا دیا ہوتا تو مسلمان بھی خوش ہو جاتے اور کوئی مشکل بھی پیش نہ آتی کوئی نہ کوئی استاد اسے پڑھا ہی دیتا۔ آخر ہر مدرسے میں اردو کا مدرس تو ہو گا ہی!"

ذاکر صاحب نے غالباً دل ہی دل میں اناللہ پڑھ کر ان کی سمجھداری اور سنجیدہ مذہبیت کی داد دی ہوگی!

لیکن ذاکر صاحب کی مذہبیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا مذہب کا تصور دوسرا ہے۔ ان کے دل و دماغ میں مذہب کی گہری محبت اور عقیدت ہے اور اس کی قدروں کی سچی پرکھ۔ چنانچہ مروجہ اسلامی درسگاہوں کی ناقص تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے اپنے "تعلیمی خطبات" میں لکھا ہے اور ان کی نظر اس مقام پر پہنچی جہاں معترضین کے طائر خیال نے پر نہیں مارا۔

"مذہب کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا چھوٹتا تو کیسے مگر اس طرح قائم رکھا جائے کہ دوسرے ارادوں میں کبھی مانع نہ ہو اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ معاملات پر کہ اہل دنیا سے متعلق ہیں اس کی تعلیمات اور حکمتوں کو زیادہ نہ ابھارا جائے۔ چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے۔ البتہ عقائد و عادات پر زبانی زور رہے اور عملاً رخصت! اور ہاں، احساس مذہبیت کے باب میں خود فریبی کے لئے مذہب کے ان حصوں پر جو ماورائے عقل ہیں، عقلی بحثیں بھی ہوتی رہیں تو مضائقہ نہیں یعنی بقول اقبال۔

محو رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے   پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

ذاکر صاحب اس قسم کی مذہبی تعلیم کے قائل نہیں۔ ان کی نظر میں مذہب اس قدر اہم اور

بنیادی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں زندگی کی تمام دوسری قدریں، دوسرے اغراض، دوسری مصلحتیں بے وزن ہیں اگر وہ روح مذہب کی نفی کریں۔ وہ مذہب کے معاملے میں کسی خود فریبی کو، کسی دکھاوے کے انتظام سے اطمینان حاصل کرنے کو نہ صرف ذہنی بد دیانتی سمجھتے ہیں بلکہ گناہ۔ اسی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ مذہبی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ وہ افراد کی زندگی کے ہر پہلو پر نظر انداز ہو اور دین و دنیا دونوں کے معاملات میں افراد اس کے اصولوں پر کاربند ہونا سیکھیں۔ اس کے ذریعہ لوگوں میں رواداری، فراخ دلی، اقدار اعلیٰ کے ساتھ وابستگی پیدا ہو اور وہ زندگی کی نعمتوں اور خود زندگی کو امانت سمجھیں۔ ان کے مذہب کے تصور میں کسی قسم کی تنگی اور تنگ نظری کو بار حاصل نہیں۔ چنانچہ بنیادی اسکیم میں اخلاقی تعلیم اور سماجی علوم کی تعلیم کا جو نصاب تجویز کیا گیا اس میں ہندوستان کی مختلف مذہبی جماعتوں کے تہذیبی کارناموں اور ان کے خیالات اور عقائد کو جگہ دی گئی ہے تاکہ ان میں گذشتہ سینکڑوں برس سے جو باہمی داد و ستد رہی ہے اور ان کے فقیروں، سنتوں، صوفیوں، رشیوں اور دوسرے مردان خدا نے محبت اور ہمدردی کا جو پیغام اس سرزمین میں پھیلایا ہے وہ سب طلبہ کی ذہنی اور جذباتی میراث بن سکے۔ اس قسم کی تعلیم نہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن کی نقیض نہیں بلکہ روح اسلام کے عین مطابق ہے۔ ممکن ہے یہ بات مذہب کے ان ٹھیکیداروں کی سمجھ میں نہ آئے جو اس کی معنویت سے ناواقف ہیں یا باہمی مخالفتوں اور تعصب کو ہوا دے کر اپنی پوزیشن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن آزاد اور اقبال، ذاکر اور ٹیگور اور گاندھی اور رادھا کرشنن کا مذہب کا تصور یہی ہے اور یہ کوئی بُرے مفسر نہیں ہیں مذہب کے! اسی لئے اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے مخالفت اور بدگمانی کا سودا کیا اور جان بوجھ کر کیا۔ کسی فوری سیاسی غرض یا سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے وہ حق پسندی کے جوہر کو کس طرح قربان کرتے؟ ان کی رگ احتساب ہمیشہ اس وقت خاص طور بیدار ہوتی ہے جب کم عیار لوگ جذبات کی لہروں میں بہہ جاتے ہیں اور پاسبان عقل سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ تعلیم کا اصلی مقصد شریف، سچّے اور دلیر افراد پیدا کرنا ہے جو بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے سر بکف ہیں، اگر ایک اچھے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تہذیب اور تمدن، اپنے مذہب اور فلسفے، اپنے ادب اور آرٹ کے خزانوں سے انسانی تہذیب کے کیسے کو مالا مال کرے اگر ایک اچھے ہندوستانی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک روادار، فراخ دل اور سچّے معنی میں مہذب انسان ہو، اگر تعصب، تنگ نظری، خود غرضی افراد اور جماعتوں دونوں کے لئے بُری ہیں، اگر حق کی حمایت انسان کا فرض ہے خواہ اس میں اپنوں کا ساتھ چھوڑنا پڑے، اگر باطل سے جنگ کرنا ضروری ہے خواہ سارا زمانہ اس کی تائید کرتا ہو، اگر انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنا اور غیروں کا احتساب سختی اور غیر جانبداری سے کرے اور حق کے معاملے میں نہ اپنا اپنا ہو نہ غیر غیر، اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ تعلیم کے ذریعہ ذاکر صاحب جن قدروں کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے لئے بلکہ عام انسانیت کے لئے قابلِ احترام ہیں اور ذاکر صاحب کا شمار ان تخلیقی اثرات میں ہے جنھوں نے ہماری تعلیم اور ہماری نئی نسل کی ذہنیت کو ایک بہتر سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس خاموشی اور صبر اور خوش دلی کے ساتھ جس طرح سورج کی روشنی مٹی کی تاریکی میں بیج کو پالتی ہے اور بارش کا پانی نازک پودوں کو پروان چڑھاتا ہے اور انھیں تازگی بخشتا ہے

ایک انگریز مصنف کا قول ہے کہ بعض لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں۔ بعض اپنی کوشش سے بڑائی حاصل کرتے ہیں اور بعض پر بڑائی زبردستی عائد کر دی جاتی ہے۔ دنیا میں اکثریت تیسرے قسم کے بڑے لوگوں کی ہے اور یہی گروہ ہے جو دوسرے انسانوں پر عافیت کے راستے بند کر دیتا ہے دوسری قسم کے لوگ بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ وہ اپنی محنت سے پھل حاصل کرتے ہیں اس لئے قابل تعریف ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ، جن کی پیشانی پر بچپن ہی سے بلندی کا ستارا روشن ہوتا ہے، شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت، جو اوسط اور گھٹیا نمونے بنانے میں بہت مشاق اور فیاض واقع ہوئی ہے اعلیٰ نمونوں کی تشکیل میں بہت جزرسی سے کام لیتی ہے لیکن سچی عظمت

حاصل کرنے کے لئے ایک سخت شرط یہ ہے کہ فرد میں بڑا بننے کی فطری صلاحیت ہو اور پھر وہ اپنی محنت اور کوشش سے ان صلاحیتوں کے جوہر کو ابھارے۔ جب وہب اور کسب کا قرآن السعدین ہو جاتا ہے اس وقت انسان برتر کی تشکیل وجود میں آتی ہے۔ ذاکر صاحب کی ذات میں یہی امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قدرت سے غیر معمولی صفات پائی ہیں لیکن وہ اس میراث پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم، محنت اور جفاکشی، تفکر اور تدبر کے ذریعہ اپنی فطرت کے سونے کے کندن، اور اپنے دماغ کی روشنی کو شعلہ برق بنا دیا۔ میں نے ان کے بعض بڑے بڑے کاموں اور خیالات کا ذکر کیا ہے لیکن ذاکر صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کارناموں سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ آپ ان کے تمام کارناموں کو گنا دیجئے، ان کی تمام دماغی قابلیتوں کی فہرست تیار کر لیجئے اگر جی چاہے تو اس میں ان کا سراپا بھی شامل کر دیجئے لیکن ذاکر صاحب کی متنوع اور شاداب شخصیت ان تمام چیزوں کے مجموعے سے بھی بڑی ثابت ہو گی جس طرح ایک چابک دست مصور کا شاہکار اس کے رنگوں، لکیروں اور دائروں سے بڑھ کر کوئی چیز ہوتا ہے جیسے اس میں اپنی ایک انفرادی روح پیدا ہو گئی ہے جو اس کو حسن اور کشش بخشتی ہے۔ ان سے مل کر انسان ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی میں کچھ زیادہ فراخی، زیادہ گہرائی زیادہ گرمی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی شخصیت ایک "دینے والی" شخصیت ہے۔ ایک فیض جاری ہے، ایک چشمہ رواں ہے، جس سے لوگ آتے ہیں اور مستفید ہوتے ہیں لیکن "دینے" کے انداز میں ایسی شرافت، دل کشی اور انکسار ہے کہ لینے والے پر گراں نہیں گزرتا۔ اس میں کچھ دخل ان کے اس گہرے خلوص کو ہے جو ان کی زندگی کے ہر پہلو پر رحمت کی طرح چھایا ہوا ہے اور کچھ انداز گفتگو کا کمال ہے، جس میں صداقت، ظرافت، وضاحت خیال، شفقت، جوش اور سادگی کا ایسا حسین امتزاج ہے جو آج کل بہت شاذ دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک زمانے میں لوگ گفتگو کو فن لطیف سمجھتے تھے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے بزرگوں یا اہل فن کی صحبت میں بیٹھ کر باقاعدہ کسب کرتے تھے۔ اب بھی کہیں کہیں پرانے مہذب خاندانوں میں آپ کو ایسے لوگ مل جاتے ہیں جنہوں نے گفتگو کے آرٹ کو زندہ رکھا ہے اور ان کی باتوں میں اب تک وہی چاشنی اور گھلاوٹ اور فرصت کا احساس موجود ہے جو پرانے لوگوں میں

پایا جاتا تھا لیکن زمانے کی تبدیلی نے زندگی کی نبض اور حرکت تیز کردی ہے، فرصت کا احساس باقی نہیں رہا اور باہمی داد وستد اور بات چیت تک میں بھی کاروباری رنگ غالب آگیا ہے۔ لہذا چیخ چیخ کر بحث اور بے مزہ گپ کرنے والے تو بہت مل جاتے ہیں۔ لیکن زبان کو دل کے خیالات کا مخلص ترجمان بنا کر، شیرینی اور بے تکلفی سے گفتگو کرنے والے نہیں ملتے۔ ذاکر صاحب کا انداز گفتگو ان کا اپنا ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف پرانے لوگوں کا آرٹ ہے وہاں دوسری طرف وہ جوش اور سرگرمی بھی ہے، وہ ذہنی جودت اور بیساختہ ظرافت بھی ہے، دلیل میں وہ تلوار کی سی کاٹ بھی ہے جس کے بغیر اس دور میں کسی ذہین، طباع اور باخبر شخص کا کام نہیں چل سکتا۔ پرانے لوگوں کی بات چیت زیادہ تر عشق و محبت، آرٹ اور فلسفہ، ادب اور تہذیب کی لطیف بحثوں تک، آپ بیتی اور جگ بیتی کے واقعات اور تجربات تک محدود تھی۔ لیکن ذاکر صاحب کی گفتگو میں مذہب، سیاست، معاشرت، رومان، قصے کہانیاں، لفظی کارٹون، طب، دنیا کا انجام، انسان کا آغاز غرض ہر قسم کے مباحث آجاتے ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی طرح انہیں ہر موضوع پر جو کچھ کہنا ہوتا ہے اس میں مضمون اور انداز بیان دونوں کے اعتبار سے ایک خاص تازگی، جدّت اور دل لبستگی کا سامان ہوتا ہے۔ ان کا علم بہت وسیع ہے لیکن اس کا بار نہ ان کی شخصیت پر پڑتا ہے، نہ ان کی تحریر پر، نہ ان کی تقریر اور گفتگو پر، ان کے آرٹ اور خلوص اور بے ساختگی کی سیل ان کی علمیت کی سیل کو تھام لیتی ہے۔ ان کی انسانیت اس قدر وسیع ہے کہ اس میں چھوٹے اور بڑے کا کوئی امتیاز نہیں خواہ وہ جامعہ کے کسی بڑھئی یا معمار سے گفتگو کر رہے ہوں یا وائسرائے کی کونسل کے کسی ممبر سے مخاطب ہوں یا مدرسے کے بچوں کو کوئی بات سمجھاتے ہوں یا کسی قومی مجمع کے سامنے خطبہ دے رہے ہوں، ہر موقع پر ان کی شخصیت میں ایک مخصوص سادگی اور خلوص، معقولیت اور خود اعتمادی، سچائی اور شرافت کا جلوہ نظر آتا ہے جو مخاطب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی بحث کا ایک دلچسپ انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے مخالف کی تمام باتیں تسلیم کر کے اس کے ہتھیار رکھا لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کے تمام مبادیات سے وہ نتائج نکال کر دکھا دیتے ہیں جو اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں! جب ان پر اطمینان اور فرصت کی کیفیت طاری

ہو (جو غم عشق اور غم روزگار کی بدولت ذرا کم ہوتا ہے، عشق بھی دوسروں کی خاطر اور غم روزگار بھی !)
اس وقت ان کی گفتگو، ان کے دوستوں کے لئے ایک بے بہا ذہنی نعمت ہوتی ہے۔ اس وقت وہ ایسی
ایسی باتیں نکالتے ہیں، ایسے نکتے پیدا کرتے ہیں، مذاق مذاق میں ایسی گہری، حقیقت آشکار چیزیں
بیان کر جاتے ہیں جو دوسرے ذہین اور طباع لوگ مغز کھپا کر بھی نہیں کر سکتے، اور یہ بھی ممکن ہے
کہ اگر اگلے روز صبح آپ ان سے کہیں کہ ذاکر صاحب کل جو اسکیم آپ نے بیان کی تھی وہ بہت خوب تھی
ذرا اس کے فلاں پہلو کی تشریح تو کر دیجئے تو وہ نہایت سادگی سے جواب دیں گے" وہ تو مجھے یاد
نہیں۔ آپ کہیں تو ایک اور اسکیم پیش کر دوں !"

اس مضمون پر نظر ڈالتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید ذاکر صاحب کو اچھی طرح نہ جاننے
والے یہ کہیں کہ اس شخص نے ان کے بارے میں مبالغہ سے کام کیا ہے اور غالباً ذاتی مراسم قوت تنقید
پر غالب آگئے ہیں۔ دوسری طرف یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ ان کو قریب سے جاننے والے کہیں گے
کہ اس شخص نے اتنا لکھا لیکن ان کی جیتی جاگتی، حساس اور روشن، نرم و گرم، بااصول اور گداز شخصیت
کو "قلم بند" نہیں کر سکا۔ ان دوستوں کو میرا جواب یہ ہے کہ آپ خود یہ کوشش کر دیکھئے اور اگر آپ
زیادہ کامیاب ہوں تو شاید مجھے آپ سے کم خوشی نہ ہوگی۔ مبالغہ کا الزام لگانے والوں کی خدمت میں
یہی معذرت پیش کر سکتا ہوں کہ یہ ایک ایسے شخص کے تاثرات ہیں جو طبعاً بیشتر نام نہاد "بڑے آدمیوں"
سے متاثر نہیں ہوتا جس کو بارہا یہ اندازہ ہوا ہے کہ عوام جن مقدس یا طلائی بتوں کو پوجتے ہیں ان کے
نفس میں اکثر خود غرضی اور تنگی چھپی ہوئی ہوتی ہے اور ان کے پاؤں گندی مٹی کے ہوتے ہیں۔ میں
اس کا کیا علاج کروں کہ ذاکر صاحب کو قدرت نے جس سانچے میں ڈھالا ہے اور ان کو جن ذہنی اور
اخلاقی صفات سے مالامال کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ اگر ایک شخص بہترین مقرر بھی ہو اور
مصنف بھی، ماہر تعلیم بھی ہو اور ماہر اقتصادیات بھی، شفیق دوست بھی اور راہبر بھی، اگر وہ میر کارواں
کی "نگہ بلند، سخن دلنواز، جان پرسوز" رکھتا ہو لیکن لیڈری کی تنگ نظری اور خود پسندی سے پاک ہو،

اگراس کی اصول پسندی اس کی انسانیت کے گداز اور دردمندی کو کند نہ کرسکے اور اس کی مروت اور دوستی اس کی اصول پسندی کے راستے میں حارج نہ ہو۔ اگر وہ اپنی بیشتر زندگی فقر وایثار کی حالت میں گذار دے اور قوم کو اس کی سزا نہ دے۔ قوم پر اس کا احسان نہ رکھے، اگر ایک شخص میں یہ تمام باتیں جمع ہو جائیں تو تنقید کیا کرے؟ جب اقبال کے وہ اشعار پڑھتا ہوں جس میں انھوں نے مرد مومن کی شان بیان کی ہے تو ان کی ذہنی تفسیر ذاکر صاحب کے خدوخال سے کرتا ہوں۔ یہ بہت بڑی تعریف ہے لیکن ان کے استحقاق سے بڑھ کر نہیں!

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز!
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم — اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز!
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز!
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز!

○

حصّہ سویم

مستقبل کی پرچھائیاں

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

(اقبال)

آدمی سے انسان

قطرے سے گہر بننا آسان ہے لیکن آدمی سے انسان بننا بہت مشکل۔ میں یہاں آدمی کا لفظ اس کے لغوی معنی میں استعمال کر رہا ہوں یعنی یہ حیوان ناطق جو آدم کی اولاد ہے یا سائنس کی اصطلاح میں ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ ورنہ مروجہ معنی میں تو آدمی اور آدمیت انسان اور انسانیت کے مرادف ہیں۔ اسی معنی میں اقبال نے کہا ہے

آدمیت احترامِ آدمی   باخبر شو از مقامِ آدمی

ادیب، فلسفی، مورخ، سائنس داں، ماہر معاشیات، معلمین اخلاق، ماہرین تعلیم، غرض ہر قسم کے اہلِ فکر کو اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اس مسئلے میں دل چسپی رہی ہے کہ آدمی کس طرح ذہنی اور اخلاقی شعور کی منزلیں طے کرتا، ہر طرح کی کڑیاں جھیلتا "انسان" کے بلند مقام تک پہنچتا ہے۔ اسی بحث کے دوران میں بعض لوگوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ حقیقت میں آدمی نے تاریخ کے گذشتہ پانچ چھ ہزار برس میں ترقی کی ہے یا نہیں یا یہ محض ایک سراب، ایک نظر کا دھوکا ہے۔ بعض لوگ تو اپنے زمانے سے بیزار ہو کر ماضی قدیم کے "شریف وحشی" کو دور حاضر کے مہذب انسان پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کی تائید میں اسی بربریت اور ظلم کی مثالیں پیش کرتے ہیں جو باوجود تہذیب کی ظاہری ترقی کے انسانوں نے ایک دوسرے پر

روا رکھا ہے۔

کئی سال ہوئے ہالینڈ کے ایک نامور جرنلسٹ پیرفاں پاسن نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے "ہمارے سالوں کے دن" اور ذیلی نام ہے "انسان نے انسان کے ساتھ کیا کیا" کتاب میں اس نے ان ظلموں اور ستم آرائیوں کا جستہ جستہ ذکر کیا ہے جو مہذب قوموں نے نہ صرف محکوم قوموں پر بلکہ خود اپنی اقلیتوں پر یا عام روش سے ہٹے ہوئے افراد اور گروہوں پر توڑے ہیں اگر ان کے ساتھ اس بربریت کو بھی شامل کر لیا جائے جو مذہب کے نام پر صدیوں تک اور فاشزم اور کمیونزم اور نسلی جنون اور ملوکیت کے نام پر اس صدی میں جائز سمجھی گئی ہے تو واقعاً انسان کے خلاف فرد جرم بہت سیاہ ہو جاتی ہے اور اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ترقی کا اصلی مفہوم کیا ہے، آدمی نے دراصل ترقی کی ہے یا نہیں، اور اس ترقی کی رفتار قابل اطمینان ہے یا باعث تشویش۔

اپنی افتاد طبیعت کے اعتبار سے بہت سے لوگ تو بغیر کسی تامل کے یہ جواب دیں گے کہ انسانی ترقی ایک بدیہی امر ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور اس کی شہادت میں وہ یقیناً اس کے ذہنی کمالات اور اخلاقی شعور کے بہت سے کارنامے پیش کر سکتے ہیں لیکن اتنی ہی آمادگی اور دیانت داری کے ساتھ دوسرے لوگ اس سے انکار کریں گے۔ وہ تاریخ انسانی کی سیاہ کاریوں پر زور دیں گے اور بالخصوص سائنس کی اس بے پناہ ترقی کا حوالہ دے کر (جو دور حاضر میں ہوئی ہے) پوچھیں گے کہ انسان نے اس قوت کو کس طرح استعمال کیا، اور اس کا ردِّ عمل عام لوگوں کی زندگی اور ان کی خوشی اور خوشحالی پر کیا ہوا۔ لیکن یہ سوال انسان کے مستقبل کے لئے اس درجہ ضروری ہے کہ اس کا جواب محض اپنی ذاتی میلان طبع کی بنیاد پر دینا ٹھیک نہ ہوگا۔ ایک مصنف کا قول ہے کہ امید پرور لوگوں کو ہر مصیبت میں عمل کا ایک امکان نظر آتا ہے اور یاس پرستوں کو ہر موقع

لہ STEPHEN VINCENT BENET

لہ DANIEL WEBSTER

کے اندر ایک تباہی جھانکتی نظر آتی ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ زندگی کے مرقع ہیں، اگر اس کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھا جائے، امکانات اور تباہیوں کی اضافی اہمیت کیا ہے اور انسانیت کے مستقبل کے بارے میں ایک محتاط رجائیت کہاں تک جائز ہے۔

میں نے تین سوال اٹھائے ہیں۔ پہلا یہ کہ ترقی کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس بحث کو پھیلایا جائے تو شاید دنیا کے تمام علوم، اس کی تاریخ اور فلسفہ اور مذہب کے بہت سے مسائل اس میں سمٹ آئیں گے۔ اس کا یہاں موقع نہیں۔ اس بحث کا مرکز زیادہ تر یہ رہا ہے کہ ترقی دراصل جسم کی ہے یا روح کی، مادی ہے یا اخلاقی، تمدنی ہے (جس کا تعلق زیادہ تر زندگی کے بیرونی مظاہر اور مسائل سے ہے) یا تہذیبی جس کا تعلق ملک معنی سے ہے۔ اس بارے میں بعض مفکروں نے جو انتہائی پوزیشن اختیار کی ہے وہ دراصل حقیقت کے صرف ایک پہلو کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ انسان کے سامنے دوراہہ نفس پرستی یا تلاش مسرت، رہبانیت یا ترک دنیا کا نہیں۔ نظری اعتبار سے جو دلیلیں بھی دی گئی ہوں عملاً اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ فطرت کا گہرا مطالعہ کرے اس کے قوانین کو سمجھے اس کے مادی وسائل اور ذرائع کو تسخیر کرے اور پھر ان کو صالح مقاصد کی خدمت میں استعمال کرے۔ زندگی کے اس جہاد میں ایک زبردست ہتھیار تو سائنس کا ہے، (سائنس اپنے حقیقی معنوں میں) جو محض صنعت وحرفت کی ترقی ہی کے لئے لازم نہیں بلکہ جس نے انسان کو وہ طریقہ کار، وہ ذہنی منہاج بھی بخشا ہے جس کی مدد سے انسان نے اس حیرت کدہ عالم میں اپنا راستہ تلاش کیا ہے۔ زندگی کا دوسرا بڑا مسئلہ صحیح مقصدوں کا تعین ہے جو اخلاقی شعور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لئے مذہب، فلسفہ اور مختلف سماجی علوم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جو اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ 'صالح' مقاصد کون سے ہیں۔ 'صالح' کا مفہوم کیا ہے اور وہ کون سی کسوٹی ہے جو ہمیں اعلیٰ قدروں میں، شریف اور گھٹیا اغراض ومقاصد میں تمیز کرنا سکھا سکتی ہیں۔ لہٰذا عام طور پر جسم اور روح کے تقاضوں اور مادی روحانی ترقی کے مطالبات میں جو تضاد مانا گیا ہے اس کے لئے

کوئی موثر جواز پیش کرنا مشکل ہے۔ مذہب کی اصطلاح میں کہا گیا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو یہاں بوو گے وہاں کاٹو گے یعنی دین اور دنیا میں ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ اس کو مسترد کرنا زندگی کے بیش بہا اور متنوع امکانات کو ٹھکرانا ہے۔ لہذا صالح مقاصد وہ ہوئے جن کی خدمت کرنے سے انسانوں کے دماغ میں روشنی، ان کے دل میں گداز اور ان کے تصور زندگی میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو۔ جب تک ہم ان مقصدوں کو مضبوطی کے ساتھ پیش نظر نہ رکھیں اور ان کے بنیادی اصولوں اور قدروں کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا جزو نہ بنائیں ہم مشیت الٰہی کی تکمیل میں اپنا شایان شان حصہ نہیں لے سکتے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اصولوں کو صرف اخلاقی اور مذہبی فرائض ہی تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ روزمرہ کے کاروبار میں تجارت، صنعت و حرفت، سیاست، سماجی تنظیم، غرض ہر چیز میں ان کی کارفرمائی ہو۔ "ہفتے میں چھ دن دنیا کے اور ایک دن خدا کا،" یہ اصول جس پر بہت سے لوگ مختلف شکلوں میں عمل کرتے ہیں محض اپنے نفس کو (اور شاید دنیا کو) دھوکا دینے کا ایک طریقہ ہے اور بس۔ زندگی تو اس طرح گذارنی چاہیئے گویا سارا کرۂ زمین ایک مسجد یا مندر یا گرجا ہے جس میں ہر کام عبادت ہے۔ مشکل مطالبہ ہے؟ بے شک، لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں۔ یہی سعادت کی راہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ سرے سے نہ خدا کے وجود کے قائل ہیں نہ روح کے تصور کے۔ مگر ان کے نقطۂ نظر سے بھی مسئلہ کا انداز بیان بدل جائے گا اس کی نوعیت نہ بدلے گی۔ وہ "مشیت الٰہی" کی تکمیل کی بجائے اس کو اپنے ضمیر کی تسکین کا ذریعہ سمجھیں گے اور انسان کے اندر حسن، خیر اور حق کی جستجو کا جو جذبہ کارفرما ہے اس کا حوالہ دیں گے۔ لیکن بہر حال کوئی شخص جس میں اخلاقی شعور بیدار ہو چکا ہے اس سے انکار نہیں کرے گا کہ انسان کی زندگی اس کی مادی ضرورتوں کی تشفی تک محدود نہیں بلکہ اس کے بہت سے اور اہم تقاضے بھی ہیں جو اس کو معنویت بخشتے ہیں۔ لہذا جب ہم انسان کی ترقی کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں ان دونوں پہلوؤں کو شامل کرنا ضروری ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا آدمی نے دراصل گذشتہ پانچ ہزار سال میں ترقی

کی ہے یا نہیں؟ ترقی کا جو مفہوم میں نے پیش کیا ہے اس کے اعتبار سے یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے تہذیب اور تمدن دونوں کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں۔ جب تاریخ سے پہلے کا آدمی اپنے دل چسپ، ہمت آزما اور دشوار گذار سفر پر روانہ ہوا تو اس کے پاس محض اپنے جسم اور دماغ کی کمزور، ناتربیت یافتہ قوتیں تھیں اور اپنی جبلتوں اور میلانوں کا زادِ راہ۔ اس بے سروسامانی کے باوجود اس نے ان چند ہزار برسوں میں کیا کچھ نہیں کیا؟ سائنس کی کنجی سے ان بے شمار بھیدوں کو کھولا جن کی حفاظت کا فطرت کو سودا رہا ہے، زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی طاقتوں کو تسخیر کیا، ذہن کی کاوش سے طب، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ریاضی، فلکیات کی بنیاد ڈالی۔ اور ہر دور میں علوم و فنون کی دنیا میں نئے گُل کھلائے۔ اپنے جذبات اور قوت تخلیق کا اظہار ادب اور شاعری، مصوری اور موسیقی، تعمیر اور سنگ تراشی اور رقص کے حسین روپ میں کیا۔ گاؤں اور قبیلے کی تنگ زندگی سے آگے بڑھ کر دنیا کی وحدت کا خواب دیکھا اور اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے بہت سی (نا کام!) تدبیریں اختیار کیں۔ اس نے اپنے خلاق دماغ کو ہر قسم کی مادی پیداوار کے بڑھانے اور انسانوں کا دکھ درد گھٹانے کے لئے استعمال کیا اور اس طرح غریبی، بیماری اور جہالت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ باوجود ظلم اور شقاوت کی کارفرمائی کے رفتہ رفتہ افراد اور جماعتوں میں آزادی، مساوات اور جمہوریت کے تقاضے بیدار ہوئے اور انھوں نے کوشش کی کہ اس بیدردی اور حق تلفی کا انسداد کریں جو مختلف جماعتوں اور قوموں نے ایک دوسرے کے خلاف روا رکھی ہے۔

لیکن یہ تصویر کا ایک پہلو ہے اور اگر ہم صرف اسی رُخ کو دیکھیں تو مستقبل کس قدر روشن نظر آئے گا! لیکن حق گوئی اور سمجھداری کا تقاضا اس داستان کی کوتاہیوں اور گمراہیوں کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے؟ اس نصف صدی کے اندر اندر ہماری نسل نے دو عالمگیر جنگوں کے عذاب کو جھیلا ہے اور ان کے بیچ میں اور ان کے بعد ہم ایک ایسے "امن" کے سائے میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں جس کے لئے انسانی ذہن نے "سرد جنگ" کی اصطلاح ایجاد کی اور جس کی عملی اور ذہنی تباہیاں "گرم جنگ" سے شاید کچھ ہی کم ہوں۔ اسی زمانے میں رنگ و نسل کے

تعصب نے بھی ایسی شدید صورت اختیار کی جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اور یہ کس وقت ہوا ؛ جب انسان کی امید پروری سمجھتی تھی کہ بربریت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ایچ۔ جی ویلز کی قسم کے اہل علم اور اہل فکر ایک مسلسل ترقی کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن باوجود ہر قسم کی پیداوار اور مادی وسائل اور ذرائع میں بے اندازہ اضافہ ہونے کے دولت کی تقسیم میں ابھی تک انصاف اور مساوات کی کارفرمائی نہیں اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں بھوک، بیکاری اور محتاجی، بے اندازہ دولت در عیش فراواں پر خندہ زن ہیں۔ مشرق و مغرب میں ابھی تک تصرف اور تغلب کا رشتہ ختم نہیں ہوا۔ جیسا میں نے اوپر ذکر کیا ہے سائنس نے قدرت کے بہت سے ایسے بھیدوں کو پالیا ہے جن کو اس نے کروڑوں برس تک چھپا رکھا تھا۔ لیکن جب اس نے قوت کے اتھاہ خزانے انسان کے قدموں میں لاکر ڈال دیئے اور نظری حیثیت سے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ ان کا ٹھیک استعمال کرکے دنیا کو اپنے لئے راحت اور سکون کا گھر بنالے وہ اس بخشش کا اہل ثابت نہ ہوا اور اس نے سائنس کی طاقتوں کا غلط استعمال کرکے اپنی ہلاکت کے لئے نہایت خوفناک ہتھیار ایجاد کئے۔ اس بے راہ روی کے بہت سے نتیجے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور جو نہیں ہیں وہ چشم تخیل پر روشن ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان ایک شتر مرغ کی طرح اپنا سر ریت میں چھپانا، یا یوں کہئے کہ عقل کی آنکھوں کو بند کر لینا چاہتا ہے اس خوش فہمی میں کہ آنکھیں بند کر لینے سے وہ خطرہ دور ہو جائے گا جو اس کے سامنے کھڑا اس کو بے رحمی کے ساتھ گھور رہا ہے !

یہ عالمی جنگ کا چیلنج، یہ عالمگیر تباہی کی بشارت دراصل ایک ڈرامائی انداز میں اس گہری نفسیاتی بیماری کو پیش کرتی ہے جو عصر حاضر کی ذہنی اور اخلاقی صحت کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ اور جس کا اظہار مختلف صورتوں میں اس کی روزمرہ کی زندگی میں ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا انسان سے تعصب، ان کی باہمی نفرت، ان کے دل اور دماغ کی تنگی جو نہ زندگی میں وحدت کی قائل ہے، نہ نسل انسان کی وحدت کی، نہ سچائی کی وحدت کی اور جس کی وجہ سے افراد اور جماعتیں خودغرضی، لالچ اور حلب قوت کی بھوک سے بے بس ہو کر انسانیت کی جڑیں کھود رہی ہیں۔ اقبال نے اس صورت

حال کو اپنی ایک نظم "فرشتوں کے گیت" میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں بظاہر فرشتوں کی زبان سے بارگاہِ الٰہی میں شکوہ ہے لیکن دراصل یہ خود انسانوں کے خلاف ایک فردِ جرم ہے جو فرشتوں کی طرف سے عائد کی گئی ہے اور اس میں نہ صرف مرض کی تشخیص ہے بلکہ نظم کے آخر میں اس کے علاج کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:-

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند مقام ابھی

کتنی دل نشین لیکن بے باک تنقید ہے یہ عصرِ حاضر پر۔ عقل کی باگ ڈور انسان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور محبت کا چراغ جو اس کے دل میں روشن ہونا چاہیئے تھا بجھا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے انسانوں کے باہمی رشتوں میں انصاف اور رواداری اور شیرینی باقی نہیں رہی۔ قوموں کے باہمی تعلقات میں اب بھی ایک حد تک جنگل کا قانون رائج ہے اور قوت، انصاف کے سامنے جھکنے سے انکار کرتی ہے جیسے وہ خود اپنے لئے ایک قانون ہو، جو کسی بین الاقوامی قانون کو ماننے پر تیار نہیں۔ لارڈ لوتھین نے اپنے "آزاد لیکچرز" میں ایک عمدہ تشبیہ کے ذریعے اس صورت حال کو واضح کیا تھا۔ دنیا کی ذہنیت آج کل ایسی ہے جیسے ایک شہر میں تمام مکان لکڑی کے ہوں اور ہر وقت آگ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اس کے باشندے نہ اس بات کے لئے آمادہ ہوں کہ شہر میں فائر بریگیڈ کا انتظام کیا جائے، نہ ایسا قانون بنانے اور منظور کرنے کو تیار ہوں جس کے ذریعے آگ جلانے پر مناسب پابندیاں لگائی جائیں بلکہ اس امید پر زندگی بسر کریں کہ اول تو آگ لگے گی نہیں اور اگر اس نے اتنی جرأت کی تو کوئی دوسرا اس کو بجھا دے گا! افراد کے تعلقات کی یہ صورت ہے کہ جن لوگوں کو دیانت داری کے ساتھ قیادت کا فرض انجام دینا چاہیئے وہ عوام کو اپنے ذاتی اغراض کا آلۂ کار بناتے ہیں اور ان کو سیدھے راستے سے بھٹکانا چاہتے ہیں۔ اس سازش میں کون کون شریک نہیں، صوفی اور مُلّا اہلِ دولت

اور اہل حکومت، اہل علم اور اہل فن سبھی تو اس ذیل میں آجاتے ہیں ذات پات، جاہ و منصب کی جو دیواریں انسانوں کے درمیان کھڑی کی گئی تھیں وہ ابھی تک قائم ہیں اور ہر قسم کی قوت کو، خواہ وہ علم کی ہو یا مذہبی ٹھیکہ داروں کی، ہوس کی تسکین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام خرابیوں اور تباہیوں کا بنیادی علاج ایک ہی ہے جو پہاڑوں سے زیادہ قدیم ہے اور صبح صادق کی شبنم سے زیادہ تازہ، یعنی انسانوں کی دنیا میں پریم کا پرچار اور پریم پر عمل۔ وہی بقول شاعر "طبیب جملہ علت ہائے ما" ہے اور اسی کی طرف فرشتوں کے گیت کے آخری دو شعروں میں اشارہ ہے

عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
دانش و دین و علم و فن، بندگیِ ہوس تمام

آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیِ نیام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی

اور یہی خیال اس دوسرے معنی خیز شعر کے اندر جھلکتا ہے۔

عقل کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے

میں نے جان بوجھ کر اور "پریم کے پرچار" کے ساتھ "پریم پر عمل" کی شرط لگائی ہے۔ اگر اس کے تقاضے ہماری روزمرہ کی زندگی میں راہ نہ پائیں تو پریم کے سندیسے کو زبان سے ادا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا جب محض "رام نام" جپنے سے بھی کوئی نجات کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا تو محبت کے اسم اعظم کو دہرانے سے کیا حاصل ہوگا؟ جب تک دل میں ایمان اور عقیدے کی پختگی نہ ہو اور ہاتھ پاؤں اور دماغ اس پر عمل نہ کریں زندگی میں کوئی بنیادی انقلاب کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کی تفسیر کا تو یہاں موقع نہیں لیکن اتنا تو ظاہر ہے کہ محبت کا دعویٰ بیکار ہے جب تک آدمی دوسروں کے لئے وہ تمام بھلائیاں اور سعادتیں نہ چاہے جو خود اپنے لئے چاہتا ہے اور ان کے لئے بھی اسی خلوص اور مستعدی کے ساتھ (بلکہ زیادہ مستعدی کے ساتھ) جدوجہد نہ کرے لیکن یہ یاد رہے کہ محبت کے رشتے انصاف کی قیمت ادا کئے بغیر قائم نہیں ہو سکتے۔ یہ امید کرنا خود فریبی ہے۔ ظالم اور مظلوم ہیں، دولت مند اور محتاج ہیں، "اونچ" "ذات" اور "نیچ" "ذات" ہیں،

کالے اور گورے ہیں، ایشیائی اور مغربی میں محبت کیا، مفاہمت بھی اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک وہ برتری اور کمتری کے احساس کو خلوص سے رد نہ کریں اور آپس کے تعلقات کی بنیاد انصاف اور برابری پر نہ رکھیں۔ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا ایک امیر اور غریب شخص میں ایک "اونچی" ذات کے مرد اور "نیچ" ذات کی عورت میں، ایک فرانسیسی اور حبشی میں دوستی یا محبت نہیں ہو سکتی؟ یقیناً ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ محض جنسی کشش نہیں، عارضی اور دکھاوے کی دوستی نہیں تو دونوں کو انفرادی حیثیت سے ان غلط قدروں کو رد کرنا ہوگا جو مروجہ اختلافات کی تہ میں کارفرما ہیں۔ یہی اصول جماعتوں اور قوموں کے بارے میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ وہاں بھی جب تک انصاف اور مساوات کے مطالبوں کو کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا جائے گا، دوستی اور بھروسا پیدا نہیں ہو سکتا۔ تاریخ نے بار بار دیکھا ہے کہ جو سیاسی ناتے عارضی مصلحتوں اور مشترک خوفوں کی بنیاد پر قائم کئے گئے ان میں استحکام پیدا نہیں ہوا اور ان کے ذریعے قوموں کے اجتماعی مسئلے حل نہیں ہو سکے۔ جو لوگ خود سیاست کے میدان میں کام نہیں کرتے یا ان کی ذاتی حیثیت ایسی نہیں کہ وہ بین الاقوامی معاملات پر براہ راست اثر ڈال سکیں لیکن ان کے دل میں احساس ہے اور اچھی قدروں کی لگن، وہ یہ تو ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنی زندگی میں ان اصولوں کو برتیں، اپنے حلقے میں ان کا پرچار کریں اور اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کریں۔ ادیب اور مصنف کے دماغ میں فکر صالح کی قوت ہے جس کو وہ نہ صرف جنگ کے ہتھیاروں کے خلاف بلکہ جہالت اور تعصب اور ظلم کے مقابلے میں بھی ڈھال اور تلوار بنا کر استعمال کر سکتا ہے۔ جو لوگ ایسا کر سکتے ہیں اور نہ کریں وہ ملک اور قوم اور انسانیت کے مستقبل کے ساتھ غداری کرتے ہیں!

تیسرا سوال یہ ہے کہ ترقی کی جو رفتار اور روش رہی ہے وہ قابل اطمینان ہے یا نہیں۔ گذشتہ بحث کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا یقینی جواب دینا آسان نہیں۔ تصویر کے بہت سے پہلو ہیں اور ہر ایک میں کوئی خاص رنگ ابھرتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جہاں تک علمی اور عملی ترقی کا تعلق ہے۔ تہذیب کی تاریخ کے گذشتہ ہزار برس میں، جو

حیاتِ انسانی کا ایک مختصر سا لمحہ ہے۔ انسان نے واقعتاً بہت نمایاں ترقی ہے۔ تمدن کے بے شمار مظاہر اور اس کے ذہنی کمالات اور کارنامے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ پتھر کے زمانے کا غاروں میں رہنے والا انسان جس کا گھر جانوروں کے بھٹوں سے بہتر نہ تھا اور یقیناً مکڑی کے جالے جیسا نفیس اور نازک یا شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح منظم نہ تھا صنعت گری کے اس مقام تک پہنچ گیا کہ اس کی انگلیوں کے نیچے تاج محل کے خواب مرمریں نے جنم لیا اور اس کا ٹٹو لنے والا دماغ ترقی کرتے کرتے آئن سٹائن کا منور ذہن بن گیا جس کی جودت نے ان تاریکیوں کا سینہ چاک کر دیا جس میں آفرینش عالم کے بے شمار بھید چھپے ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اخلاقی شعور نے بھی اتنی ترقی کی کہ جس دنیا میں جنگل کا قانون نافذ تھا وہاں سقراط، مسیح، بدھ اور محمدؐ جیسے انسان پیدا ہوئے جنھوں نے زندگی کو شرافت، سچائی اور نیک عمل کی نئی جہتوں سے آشنا کیا اور ہر زمانے اور ہر ملک میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جن کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کیا بن سکتا ہے۔ لیکن ان مہاپرشوں اور نیک انسانوں کی حیثیت روشنی کے میناروں کی سی ہے یا وہ پہاڑ ہیں جو زندگی کی شاہراہ پر جا بجا کھڑے ہیں اور زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ زمین پر رینگنے یا گڑھے میں گرنے کے بجائے اس بلندی کی طرف آؤ جس کی جڑیں زمین پر قائم ہیں اور چوٹی آسمان کی طرف نگران۔ ان کے برخلاف بیشتر انسانوں کا قد اس قدر چھوٹا، ان کے دل اور دماغ اس قدر تنگ ان کی حرکتیں ابھی تک بربریت کے اس درجہ نزدیک ہیں کہ شاعر حیران ہو کر پوچھتا ہے

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل   کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

اور کس درجہ ارزانی؟ پنجاب کے ایک صوفی منش ادیب برہم ناتھ دت قاصر نے اپنے مجموعۂ خطوط "ڈال ڈال، پات پات" میں بڑے دل نشیں انداز میں آدمی کی رذالت کی تصویر یوں پیش کی ہے:

"انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ خدا نے آدمی کو اپنی مثل بنایا اور اس میں زندگی کی روح پھونک دی! مگر اس اشرف المخلوقات کی شکل و صورت تو دیکھنا۔ وہ کتے سے زیادہ شہوت پرست، لومڑی سے زیادہ مکّار، شیر سے زیادہ خونخوار، ہاتھی سے زیادہ پیٹو، گدھے سے زیادہ بے دماغ،

خچر سے زیادہ ضدی، سانپ سے زیادہ زہریلا، اونٹ سے زیادہ کینہ پرور، "مگرمچھ سے زیادہ نسل کش، بلی سے زیادہ چور، بکری سے زیادہ بزدل اور بچھو سے زیادہ نیش زن ہے۔ ان جانوروں میں یہ برائیاں انفرادی ہیں۔ کسی میں ہیں کسی میں نہیں۔ مگر یہ اشرف المخلوقات، خدا کا بیٹا سب برائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور نسلاً بعد نسل اپنی اولاد کو ورثے میں دے جاتا ہے۔ خدائے کریم نے دوسرے جانوروں کے لئے نہ کوئی رسول بھیجا نہ کوئی پیغامبر ان کے گناہوں کے کفارے کے لئے نہ کوئی مصلوب ہوا، نہ کوئی شفاعتی آیا۔ مگر اس لاڈلے کے لئے خدا نے نہ جانے کتنے پیغمبر بھیجے۔ یہاں تک کہ خود بھی اس نے انسانی جامے میں آنے کی زحمت گوارا کی اور اپنے "اکلوتے بیٹے" کو بھی دار پر کھنچوایا۔ اس اشرف المخلوقات نے دنیا کی ہر برائی کو فروغ دیا۔ زمین و آسمان کو زیر و زبر اور سمندروں کو متھ کر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ چرند، پرند، اشجار، حیوان، حتیٰ کہ کل ارض و سما گریاں اور نالاں ہے خود زمانہ بھی اس کے ہاتھوں تنگ ہے۔ . . اگر یہی انسان اشرف المخلوقات ہے تو خدارا سوچ کر بتاؤ کہ ارزل مخلوقات کس کو کہو گے؟"

ایک زمانہ تھا جب تہذیب کی کسوٹی یہ سمجھی جاتی تھی کہ اس کے بہترین عالموں، مفکروں، ادیبوں، صناعوں، دستکاروں، مصوروں، رقص و سرود کے ماہروں، سنگتراشوں نے اپنے اپنے میدان عمل میں کیا کیا کارنامے انجام دئے ہیں۔ اس کے ارباب دولت و ثروت کا تمدنی معیار کس قدر اونچا ہے۔ چنانچہ جب ہم یونانی تہذیب پر حکم لگاتے ہیں اور اس کی افضلیت کا اعتراف کرتے ہیں تو ہماری نظر اس کے اس روشن رُخ پر ہوتی ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ اس شگفتہ و شاداب چمن کی آبیاری بے شمار غلاموں، محتاجوں، مظلوموں کے خون جگر اور آنسوؤں نے کی تھی۔ اور یونانی تہذیب ہی کا کیا ذکر ہے یہ تو محض ایک مثال ہے۔ زیادہ تر ملکوں اور قوموں اور تہذیبوں کی تاریخ میں یہی اندھیرے اجالے کا کھیل پایا جاتا ہے۔ لیکن آج ہم اس ناقص، یک طرفہ کسوٹی کو قبول نہیں کر سکتے۔ دراصل بہترین انسانوں کے ضمیر نے تو کبھی بھی اس کو قبول نہیں کیا اور باہمی رشتوں میں ہمیشہ انصاف اور مساوات کی تلقین کی ہے۔ لیکن اس زمانے میں جب جمہوریت

کے اصول کو کسی نہ کسی شکل میں تقریباً سب نے قبول کر لیا ہے، صورت حال بہت کچھ بدل گئی ہے خواہ بعض قومیں اور جماعتیں اس اصول سے محض زبانی عقیدت کا اظہار ہی کریں اور ان کی عملی زندگی اور پالیسی میں اس کی کارفرمائی نہ ہو، چنانچہ سرمایہ دار، سوشلسٹ، کمیونسٹ غرض سب سماجوں کا اپنی اپنی جگہ یہ دعویٰ ہے کہ وہ اپنے طور پر (اور اپنے خیال میں بہترین طریقے پر) جمہوریت کو قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لئے اگر اس عالمی ماحول میں ہم انسان کی ترقی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہیں تو ہماری کسوٹی یہی ہو سکتی ہے کہ بحیثیت مجموعی انسانوں نے ہر اعتبار سے کس قدر ترقی کی ہے اور "اچھی زندگی" کی نعمتوں کو کس درجہ انصاف اور کامیابی کے ساتھ پورے سماج میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس معیار سے دیکھا جائے تو منزل کس قدر دور معلوم ہوتی ہے!

امریکہ کے ایک پادری نے کچھ عرصہ ہوا ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "عیسائیت کی پسپائی" اور اس میں یہ خیال پیش کیا تھا کہ کرسمس کے موقع پر اس قدر "جشن کی ذہنیت" کا اظہار نامناسب ہے کیونکہ جشن تو فتح کا اعلان ہوتا ہے اور دنیا کی حالت کو دیکھیں تو دو ہزار برس میں مسیحی قدروں کی جیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس ضمن میں اس نے موجودہ صورت حال کے چند بدیہی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ مثلاً گرجا جانے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے لیکن عیسائی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کہ ہم ایک پاکباز اور نیک عمل قوم ہیں یا پادریوں کو دیکھئے۔ ان میں سے کتنوں میں جرأت ہے کہ وہ اپنے دولت مند ممبروں کے سامنے بغیر جھجک کے حرف حق زبان پر لائیں۔ کتنے چرچ جانے والے ہیں جو مسیح کی تعلیم کے خلاف نسلی امتیاز کو قائم رکھنے کی حمایت کرتے ہیں۔ کتنے ہیں جو ایک ہی مذہب کو مانتے ہیں لیکن فروعی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہیں۔ ہم نے مذہب کی روح کو بھلا کر خدا کے بجائے آدمی کو اس کا مرکز بنا دیا ہے۔ پھر یہ کرسمس میں اس قدر شادمانی کس بات پر؟ اس مضمون کے بارے میں امریکہ کے مشہور رسالے 'نیو لیڈر' کے اڈیٹر نے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں اس نے پادری صاحب کی اس تنقید سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دلیل ہی غلط ہے۔ کیونکہ اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ ایک زمانے میں ہماری اخلاقی

حالت بہت بہتر تھی ہم مسیحی تعلیم کے زیادہ قریب تھے اور یہ تشدد، خود غرضی اور برادرانِ یوسف کی سی بدسلوکیاں جو ہماری زندگی کا جزو بن گئی ہیں زمانہ حاضر کی خصوصیت ہیں۔ اس نے نسل انسانی کی ابتدائی حالت کی طرف توجہ دلا کر بتایا ہے کہ ہمارے پیش رو لاکھوں برس تک بالکل حیوانوں کی سی وحشیانہ زندگی بسر کرتے رہے جس میں چھین جھپٹ اور خوں ریزی عام تھی اور ان میں سرے سے سمجھداری اور اخلاقی شعور کا وجود ہی نہ تھا۔ یہ تو گزشتہ چند ہزار برس کی بات ہے کہ آدمی کی نئی صلاحیتیں ظاہر ہوئیں۔ اس نے لکھنا پڑھنا اور اپنے خیالوں کو مرتب کر کے پیش کرنا سیکھا۔ گویا تہذیب کی یہ مختصر سی مدت وقت کے سمندر کی سطح پر ایک ہلکی سی لہر ہے اور بس! اس عرصے میں کبھی کبھی نیک اور شریف آدمی بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً دو ہزار برس ہوئے مسیح نے اپنا محبت، رواداری اور بھائی چارے کا پیغام ان انسانوں کو سنایا جن کے باپ دادا مدت مدید تک جنگل کے قانون پر عمل کرتے آئے تھے۔ تعجب یہ نہیں کہ یہ پیغام دنیا میں عام نہیں ہوا۔ تعجب تو یہ ہے کہ انہیں بارہ ایسے حواری کیسے مل گئے جنھوں نے اس تعلیم کو سمجھا اور اس پر عمل کرنے کی جرأت کی! ان کے بعد لوگوں نے ان کے پیغام کو بھلا دیا اور اس کی معنویت کو پس پشت ڈال کر عیسائیت کو ایک بے جان اور رسمی چیز بنا دیا۔ انہوں نے اپنی عقیدت کا اظہار خوبصورت عمارتوں، تصویروں، نظموں اور موسیقی کی شکل میں کیا جو دراصل محبت کی ترجمان نہیں بلکہ انسان کی خود پسندی اور غرور کی ذہنیت کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن باوجود ان سب باتوں کے مسیحیت نے آدمی کو انسان بنانے میں کتنا کچھ نہیں دیا! مقالہ نگار کی رائے ہے کہ انسان پر فردِ جرم لگانے میں مبالغہ سے کام نہیں لینا چاہیے۔ دنیا اتنی بری نہیں جس قدر مصنف، مبلغ اور اخباروں کے اڈیٹر اس کو ظاہر کرتے ہیں۔ حبشیوں ہی کے مسئلے کو لیجیے۔ بے شک ان کی مکمل آزادی اور مساوات کی لڑائی میں کامیابی کی رفتار بہت سست معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ بالآخر سپریم کورٹ نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا اور نیچے کی عدالتیں بھی اس کی حمایت کر رہی ہیں۔ امریکی قوم کی اکثریت اس کی تائید کرتی ہے اور دیر یا سویر وہ ملک کا قانون بن کر رہے گا۔ کانگریس نے ۱۸۶۳ء میں حبشیوں کی ''آزادی کا عام اعلان'' منظور کیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں یہ قانون پاس ہوا کہ کالے اور گورے

سکولوں میں ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس ایک سو برس کے اندر حبشیوں نے ہر طرح کی ذلتیں اور محرومیاں جھیلیں لیکن اب آزادی کی اس جنگ نے زور پکڑا ہے اور منزل نظر کے سامنے ہے۔ یہ صورت حال صرف امریکہ تک محدود نہیں بلکہ ساری دنیا میں پائی جاتی ہے۔" جہاں کہیں مشکلیں پیدا ہوتی ہیں وہ اصلاح اور ترقی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ لوگ جاہل ہیں۔ کام کرنے کے ڈھنگ نہیں جانتے۔ قوت کو کفایت کے ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ فضول خرچی کرتے ہیں لیکن ان کی آگے بڑھنے کی کوشش جاری ہے۔ ان کے قدم منزل کی طرف رواں ہیں۔ . . . اس لئے بہت کچھ جواز ہے کرسمس ہی جشن منانے کے لئے!"

میں نے اس بحث کا خاصی تفصیل کے ساتھ حوالہ دیا ہے کیونکہ اس میں ایک با اثر نقطہ خیال کو مضبوطی اور معقولیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سوال باقی رہتا ہے کہ انسانی ترقی کی یہ امید پرور تصویر کہاں تک قابل قبول ہے؟ مانا کہ انسان میں نفسیاتی تبدیلیاں بہت دیر میں پیدا ہوتی ہیں، اینٹوں اور پتھروں کی عظیم الشان عمارتیں بنانا آسان ہے اور ایک بچّے کی ٹٹولتی ہوئی جبلّتوں اور امکانات کو شکل دینا اور ان کو عدل اور حسن کے سانچے میں ڈھالنا مشکل اور صبر آزما۔ لیکن آج کی دنیا کے سامنے ایک ایسا بے صبر چیلنج ہے اس وقت کہ ہماری نسل اس اطمینان اور بے فکری کے ساتھ اپنی زندگی بسر نہیں کر سکتی جیسے ازل اس کے پیچھے ہو اور ابد سامنے! تبدیلیوں کی رفتار جو ایک معنی میں وقت کی رفتار ہے اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ مہینوں کے سفر پلوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ چیزوں کی نقل و حرکت ہو یا انسانوں کی یا خیالات کی۔ زندگی کی پرانی روش میں فرصت کا احساس تھا۔ انقلاب اس طرح دھیرے دھیرے ہوتا تھا کہ اکثر تبدیلی کے جھٹکے بھی محسوس نہ ہوتے تھے۔ مروجہ رسم و رواج اور انداز فکر و عمل میں ٹھیراؤ تھا۔ بہت سے راستے جانے بوجھے تھے اور جو نئے تھے ان میں بھی غیر معمولی خطرے پیش آنے کا امکان کم تھا۔ یہ روش جس پر موجودہ نسل نے اپنا بچپن گزارا تھا اب ایک یاد بن کر رہ گئی ہے اور واپس نہ آئے گی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں ہم ہر طرف تیز رفتاری دیکھتے اور تیز رفتاری چاہتے ہیں آدمی کو انسان بنانے کے

بارے میں اس قدر فرصت اور اطمینان قلب کا اظہار کیوں؟ اس کی اخلاقی اور ذہنی کوتاہیوں کی طرف سے ایک فلسفی یا مورخ کا یہ استغنا کہاں تک جائز ہے کہ وقت کے ناپید اکنار سمندر میں کچھ نہ کچھ ہو رہے گا؟ جانتا ہوں کہ اس انداز فکر کے لئے ایک حد تک جواز پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک محقّق اور عالم کے لئے، جس کو محض ریسرچ سے دلچسپی ہو، مناسب ہو سکتا ہے۔ اس سے ایک مبلغ اور سرگرم مصلح کی ہمت بھی مضبوط ہو سکتی ہے جب شکست اور ناکامی اس کے حوصلے کو پست کرنے کی دھمکی دیں۔ لیکن کام کرنے والوں کے لئے صحیح طریقہ وہ ہے جس کو حالی نے بڑی سادہ بلاغت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو | دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو | پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا

یعنی بڑا کام کرنے میں ہر گزرتے سانس کو اتنی اہمیت دینی چاہیئے گویا وہ عمر جاوداں کا حامل ہے۔ اس بارے میں ایک گہری حقیقت کو مہاتما بدھ نے بڑی بصیرت کے ساتھ اس طرح سمجھایا تھا کہ اگر ہم نیکی کرنے کی کوشش آہستہ آہستہ کریں تو بدی فوراً بہت شدت کے ساتھ زندگی کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ حبشیوں یا اچھوتوں کو ان کے حقوق یا محکوم قوموں کو آزادی دلانے میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ بے شک اس کا یہ مطلب نہیں کہ اجتماعی اور سیاسی مسائل میں مصلحت اندیشی اور عملی مشکلات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عملی تدبیریں اختیار کرنے میں سمجھداری سے کام لینا پڑے گا۔ لیکن ہماری نیت اور پالیسی بالکل صاف ہونی چاہیئے اور اس بات کا ذہنی عزم کہ ان خرابیوں کا انسداد جلد سے جلد ہونا ضروری ہے۔ ان کے ساتھ معاملہ کرنا ان کو مفاد مخصوص کی خاطر طرح دینا کسی لحاظ سے جائز نہیں۔

اس جہاد میں ہر نیک نیت شخص کو شریک ہونا ہے اس عقیدے کے ساتھ کہ دوسروں کی محرومی میری محرومی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بہت سے لوگ، جو بد باطن نہیں، جو جان بوجھ کر

شر کی حمایت یا علم برداری کرنے کو تیار نہیں عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ بدباطنوں اور شر پرستوں کی مخالفت مول نہ لیں۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ کھلم کھلا کلمۂ حق زبان پر لائیں یا جھوٹ اور ظلم کے خلاف کسی عملی تحریک میں شریک ہوں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شر پسندوں اور فتنہ پھیلانے والوں کی ایک چھوٹی سی تعداد پوری جماعت یا قوم کے ضمیر کو مفلوج کر دیتی ہے اور اس طرح ان کی اخلاقی زندگی کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ اس قسم کا فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ خطرناک اور قابل ملامت ہے!۔ اس کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ خود ہمارے دیس میں تقسیم ہند کے موقع پر اور اس کے بعد بھی ہندوستان اور پاکستان میں نفرت اور شر کے پرچار کا یہ کھیل بار بار کھیلا جا چکا ہے۔ ایسا ہونا ناگزیر نہ تھا۔ اس میں انسان دشمنوں کو کامیابی نہ ہونی چاہئیے تھی اور نہ ہوتی اگر ملک کے رہنما اور عوام اپنا فرض مضبوطی کے ساتھ انجام دیتے لیکن ایسا نہ ہوا اور اڈمنڈ برک کی یہ پیشین گوئی جو ایک طرح مہاتما بدھ کے قول کی تفسیر ہے، پوری ہوئی کہ "شر کی کامیابی کے لئے صرف اتنی شرط ہے کہ اچھے آدمی کچھ نہ کریں" یعنی اُن کا ترک عمل ہی اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس لئے ہمارے سامنے دو کام ہیں۔ ایک تو عام لوگوں کے اخلاقی اور ذہنی معیار کو بلند کرنا تاکہ وہ آدمی سے انسان کی منزل تک پہنچ سکیں یا کم سے کم ان کے قدم اسی طرف بڑھتے رہیں۔ دوسرے شرافت اور انصاف کے حق میں ایک مضبوط رائے عامہ پیدا کرنا جو ان افراد اور جماعتوں اور تحریکوں کی سختی سے مخالفت کرے جن کی خواہش زندگی کو نیچے گرانے اور اس کی شرافتوں کو مجروح کرنے کی ہے۔ غالب نے کہا تھا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۔۔۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب کا دعوے صحیح لیکن دلیل کمزور ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر دنیا کے تمام کام بھی آسان ہوتے جب بھی آدمی کا انسان بننا مشکل تھا کیونکہ یہ تو کائنات کا سب سے کٹھن تخلیقی کاروبار ہے۔ کم سے کم آدمی کے نقطۂ نظر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سارا عالم کائنات اور اس کی طاقتیں اس شاہکار کے بنانے میں لگی ہوئی ہیں۔ شیخ سعدی نے کہا ہے کہ ابر اور ہوا، چاند اور سورج

سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں تاکہ آدمی اپنی روزی کمائے اور اس کو غفلت کے انداز میں نہیں۔ بلکہ سمجھداری اور شرافت کے ساتھ کھائے (اور کھلائے) یہ سب انسان کی خاطر فضائے آسمانی میں سرگرداں ہیں اور فرمان الٰہی کی تعمیل کر رہے ہیں۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ سب اپنا اپنا فرض ادا کریں اور آدمی اپنے فرض کی طرف سے غافل رہے لیکن شاعر نے اس نکتہ کو واضح نہیں کیا کہ اجرام فلکی اور ابر اور ہوا کا معاملہ آسان ہے کیونکہ وہ قدرتی قانون کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کی حرکت میں کوئی پیچیدگی یا گمراہی اس وجہ سے پیدا نہیں ہوتی کہ ان کو قوتِ ارادی یا عمل کی آزادی نہیں دی گئی۔ انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ "ہم نے اس کو راستہ دکھایا ہے اب اس کا کام ہے کہ وہ شکر کا طریقہ اختیار کرے یا کفر کا۔" یعنی اس کو ارادہ دیا گیا ہے جو اس کا سب سے بڑا شرف ہے اور اسی میں اس کے لئے بہت سے خطرے اور آزمائشیں بھی پوشیدہ ہیں۔ اگر وہ اس کا صحیح استعمال نہ کرے تو اس کی انفرادی اور اجتماعی کامیابی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ جوں جوں آدمی کا علم اور عمل کی صلاحیت بڑھتی جاتی ہے خیر و شر کی پرکھ اور مقصدوں کا صحیح انتخاب زیادہ ضروری ہوتا جاتا ہے۔ آج سے تین چار ہزار برس پہلے آدمی کی قوت محدود تھی۔ اس لئے اگر وہ غلط راستہ اختیار کرتا تھا تو سماجی نقطۂ نظر سے اس کے بُرے نتیجے بھی محدود ہوتے تھے۔ مثلاً اگر دو قبیلوں میں لڑائی ہوتی تو ہتھیار مقابلتہً معمولی قسم کے ہوتے تھے جن سے امن عالم خطرے میں نہ پڑ سکتا تھا۔ بلکہ اب سے چند سال پہلے تک بھی جنگ نے وہ عالمی صورت نہ اختیار کی تھی جو اب پیدا ہو گئی ہے۔ یہ نتیجہ ہے انسان کی قوت کے اس حد تک بڑھ جانے کا کہ سائنس داں بھی اس کا پورا پورا اندازہ نہیں لگا سکتے، عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ قوت ایک دو دھاری تلوار ہے جس کو تعمیر اور تخریب دونوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بدھ مت کے شاستروں میں کہا گیا ہے کہ ہر انسان کو جنت کے دروازے کی کنجی دی جاتی ہے اور وہی کنجی دوزخ کے دروازے بھی کھول سکتی ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انسان وہ کنجی ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے لیکن اس میں اتنی عقل نہیں کہ یہ فیصلہ کر سکے کہ کس دروازے کو کھولنا چاہیئے۔ یہ وہ عقل نہیں جو محض واقفیت

یا علم کے بڑھنے سے پیدا ہوتی ہے یا ذہانت سے عبارت ہے بلکہ وہ عقل جو ادب خوردہ دل ہو، جس کو کسی نے "علم کی برکت" سے تعبیر کیا ہے جو آگے پیچھے دونوں طرف دیکھتی ہے لیکن بڑھنا آگے کی طرف چاہتی ہے جو اپنے فائدے کے ساتھ دوسروں کا فائدہ اور فرد کی بھلائی کے ساتھ سماج کی بھلائی بھی چاہتی ہے، جو زندگی کے مختلف تقاضوں میں عدل اور توازن قائم رکھتی ہے، جو چھوٹی چیزوں کو بڑی چیزوں پر، چھوٹے مقصدوں کو بڑے مقصدوں پر ترجیح دیتی ہے۔ فلسفہ اور مذہب اور تعلیم و تہذیب کے مختلف ادارے اس عقل جہاں بیں کے تصور کو اجاگر کرنے اور پھیلانے کی کوشش نہ کریں گے تو انسان اپنی زندگی اور صلاحیتِ عمل کو اچھے مقصدوں کا خادم نہ بنا سکے گا۔ اور بے دین قوت اور بے فیض مقاصد کا جوڑ اس کے مستقبل کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن جائے گا۔

اس قسم کا انسان پیدا کرنے کے لئے یعنی اس قطرے کو گہرے ہونے تک کن منزلوں سے گزرنا ہوگا؟ اس ان گھڑ پتھر کو ایک حسین مجسمے میں تبدیل کرنے کے لئے سنگ تراش کو کیا کیا کاوشیں کرنی ہوں گی؟ اس حسن آفرینی کے لئے جن فن کاروں کی خاص ضرورت ہے وہ نہ مصور ہیں نہ سنگ تراش، نہ مغنی نہ شاعر۔ یہاں تلاش ہے معلموں، فلسفیوں، مصلحوں، سماج سیوکوں اور 'مردانِ خدا' کی جو آدمی کو ایک بہتر سانچے میں ڈھالنے کے فن سے آشنا ہوں اور اس کے لئے اپنا خون جگر صرف کرنے کو تیار۔ کوئی میدان بھی ہو کمال پیدا کرنے کے لئے خون جگر کھپانے کی شرط ناگزیر ہے۔

رنگ ہو یا ہو خشت و سنگ چنگ ہو یا ہو حرف و صوت   معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!

اس لئے ظاہر ہے کہ "یہ حیوان ناطق" بھی بغیر کٹھن کڑیاں جھیلے بغیر ضبط نفس کی منزلوں سے گزرے "انسان" کے بلند مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ 'آدمی' دنیا میں تو اربوں ہیں لیکن 'انسانوں' کی تعداد مقابلتہً کم ہے۔ اتنی کم کہ کبھی کبھی کوئی انسان بارگاہ الٰہی میں نیازمندانہ گستاخی کے ساتھ شکایت کر بیٹھتا ہے (یہ شکایت جو اس سے پہلے بھی میں انسان کی طرف سے پیش کر چکا ہوں)

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل　　　　کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

لیکن یہ شکایت شاعر نے خطیبانہ انداز میں کی ہے۔ اسے سوال کا جواب بھی معلوم ہے اور اسی صورت حال کی مصلحت بھی۔ دنیا کا کارخانہ اس اصول پر نہیں بنایا گیا کہ یہاں ہر چیز مکمل ہو بلکہ اس میں صنعت یہ رکھی ہے کہ ہر چیز نامکمل اور ناتمام ہو تاکہ انسان خود اس کی تکمیل کا بار اٹھائے اس کی بے رنگی میں رنگ بھرے اور اس طرح صانع ازل کا شریک کار بن کر اس کی مشیت کو پورا کرے۔ یہی شاعر جس کو آدم کی ارزانی کا گلہ ہے جانتا ہے کہ فطرت کو، جس نے اس ناتمام نقش کو بنایا ہے فکر ہے کہ خود انسان کی مدد سے اس کو ایک حسین تر قالب میں ڈھالے۔ ظاہر بیں نگاہیں نہ دیکھ سکیں لیکن نقاب کے پیچھے وہ آئینہ سامنے رکھے اس کی آرائش جمال میں مصروف ہے۔ شاعر نے جہاں شکوہ کیا ہے وہاں امید بھی دلائی ہے، ہمت بھی بڑھائی ہے۔

مشو نومید زیں مشت غبارے　　　　پریشاں جلوۂ ناپائدارے

چو فطرت می تراشد پیکرے را　　　　تمامش می کند در روزگارے

دنیا کی ساخت میں یہ حکمت رکھی گئی ہے کہ اس میں کمال نہیں تکمیل کی صلاحیت ہے جو اندرونی تقاضوں کے زور اور انسان کی کوشش سے وجود میں آتی ہے۔ اس کا شرف یہ ہے کہ وہ پوشیدہ امکانات کو عملی شکل دے۔ مٹی سے جام تیار کرے۔ صحرا اور بیاباں کو گلزار بنائے۔ پتھر میں آئینے کی جلا پیدا کرے۔ زہر کے سینے میں تریاق کو تلاش کرے۔ اس طرح اگر اس کی تمام ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کی تربیت کی جائے تو وہ نہ صرف کائنات کی قوتوں کو تسخیر کر سکتا ہے بلکہ شاید ایسا وقت آجائے کہ دوبارہ فرشتوں کا مسجود بن جائے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بہ یک وقت رفتار کی تیزی اور صبر کا مطالبہ کر رہا ہوں اور یہ ایک حد تک ٹھیک بھی ہے۔ لیکن اسمیں کوئی بنیادی تضاد نہیں۔ عمل میں تیزی اور مستعدی درکار ہے اور فکر میں صبر کا تقاضہ۔ کام کرو۔ مگر فوری نتیجہ کی راہ نہ دیکھو۔ درخت کا لگانا تمہارا کام ہے، پھل دینا قدرت کی مشیت پر منحصر۔

اس مقام پر پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدمی کو انسان بننے کے لئے خود میں کون سی صفتیں پیدا کرنی لازمی ہیں۔ یہاں ان غیر معمولی خوبیوں کا ذکر نہیں جو کبھی کبھی خدا اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے یعنی میرا روئے سخن رشیوں، نبیوں اور اولیا، اللہ کی طرف نہیں بلکہ میرے آپ کے جیسے معمولی روزمرہ کے انسانوں کی طرف ہے۔ ولی یا جینیس (Genius) بننا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ وہ تو خدا کی دین ہے۔ لیکن ایک اچھا انسان بننا بہت لوگوں کے لئے ممکن ہے اگر وہ اس کی شرطوں کو پورا کریں اور اس راستے میں جس ذہنی اور اخلاقی جدوجہد کی ضرورت ہے اس سے جی نہ چرائیں۔ اس جدوجہد کی ضرورت کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اس لئے کہ آدمی کی فطرت میں خیر و شر، بلند پروازی اور تنزل، ستاروں کی جستجو کا حوصلہ اور سہل پسندی دونوں طرح کے امکانات رکھے گئے ہیں اور ان میں ہمیشہ رسہ کشی ہوتی رہتی ہے۔ اس میں بعض جبلتیں اور رجحانات ایسے ہیں کہ اگر ان کی نگرانی اور ہدایت نہ کی جائے تو اس کی فطرت سستی اور آرام طلبی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر انہیں اچھی قدروں کا خادم بنایا جائے اور اس کی ذہنی اور عملی صلاحیتیں اس کے اخلاقی شعور کی ہدایت میں کام کریں تو اس کی فطرت کے حقیقی جوہر کھل جاتے ہیں اور انسان برتر کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ مگر پہاڑ کی چڑھائی مشکل ہے اور اتار آسان، دل شکن حد تک آسان، خصوصاً جب بہت اونچے پہاڑ سے نیچے اترنا ہو! اس لئے بہت سے لوگ تو اخلاقی شعور کی منزل تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ ہمت کی کمی یا قدم کی لغزش کی وجہ سے پھسل کر نیچے گر پڑتے ہیں۔ بہرحال زندگی کے سفر کے لئے صحیح منزل اور صحیح راستے دونوں کا تعین ضروری ہے تاکہ آدمی اسی منزل کی طرف چلے۔ ایسا نہ ہو کہ کعبہ کی بجائے ترکستان کی راہ اختیار کرے یا راستہ ترکستان کا ہو اور سمجھے کہ کعبہ جا رہا ہوں! جو لوگ کعبۂ انسانیت تک پہنچنا چاہتے ہیں انہیں خود میں بعض ایسی صفات پیدا کرنی ہوں گی جن کے بغیر اس حریم قدس میں داخلہ ممکن ہی نہیں۔ میرے نزدیک ان میں اولیت کا شرف اس صفت کو حاصل ہے جس کے لئے میں صرف آدمیت یا انسانیت ہی کی اصطلاح استعمال کر سکتا ہوں۔ اس کی بنیادی شرط ہے۔ دل میں دوسروں کے لئے گنجائش، ان کے دکھ سکھ اور نفع نقصان کا زندہ

احساس۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی زندگی کا مرکز خود ان کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ خود غرضی کو ایک کمبل بنا کر اپنے گرد لپیٹ لیتے ہیں تاکہ اپنے "نازک" جسم کو سرد ہوا سے محفوظ رکھیں۔ انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اس طوفان میں دوسروں پر کیا گزرتی ہے وہ ایک کنجوس زر پرست کی طرح اپنی زندگی کو اپنے ذاتی آرام یا نفع کی خاطر سینت سینت کر خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی سے، دنیا سے، اپنے عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں، کام شریکوں سے "لینا" چاہتے ہیں، انہیں کچھ "دینا" نہیں چاہتے۔ ان کا اصول تصرف ہے، خدمت نہیں۔ ان کو قوت کی تلاش ہے، وہ محبت کے معجزے سے ناآشنا ہیں جو لینے والے اور دینے والے دونوں کو مالا مال کرتی ہے۔ میں ایسے لوگوں کو انسان نہیں مانتا۔ میری نظر میں انسان وہ ہے جو خود غرضی کی تنگ نائے سے نکل کر انسانی ہمدردی کے سمندر میں اپنی ناؤ چلائے، جو آدمی آدمی میں اس وجہ سے فرق نہ کرے کہ ایک کا رنگ کالا ہے، ایک کا گورا، ایک کی ناک چپٹی ہے، ایک کی ستواں، ایک خطِ استوا کے شمال میں پیدا ہوا ہے، دوسرا جنوب میں، ایک مسیح کو مانتا ہے، دوسرا گوتم بدھ کو۔ اس کے دل میں ہر آدمی کی قدر ہوگی کیونکہ وہ آدمی ہے، عام اس سے کہ وہ کس ظاہری لباس میں ملبوس ہے۔ وہ ہر شخص کی خدمت کو آمادہ ہوگا (جس حد تک ممکن ہو) کیونکہ اس کی نگاہ حقیقت شناس کو اس کے حریم دل میں جلوۂ الٰہی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی مدھم پڑ گئی ہو۔ اس کو ہر قسم کا تعصب، بے انصافی اور دوسروں کی محرومی ناگوار ہوگی، اسی طرح جیسے اپنی محرومی۔ اس وجہ سے میں ہندوستان میں "اچھوتوں" کو اچھوت سمجھنے والوں کو، امریکہ میں حبشیوں کو زندہ جلا دینے والوں کو، کونگو کے سفید و سیاہ ظالموں اور بربریت پسندوں کو اور جنوبی افریقہ کے سفید فام وحشیوں کو انسان نہیں سمجھتا۔ اسی لئے میں ان مال مست دولت مندوں کو، ان برخود غلط عالموں کو، ان خود پسند جمال پرستوں کو، ان گوشہ نشین، مردم بیزار ریاضت گزاروں کو بھی انسان نہیں سمجھتا جو اپنی دولت یا علم یا فن یا عبادت پر نازاں اور مطمئن ہیں اور انہیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ ان کے کروڑوں ہم جنس، روشنی کے اس محدود دائرے سے باہر، افلاس

جہالت، بدذوقی اور خدا ناشناسی کی تاریکی میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ ایک طرح کے سرمایہ دار ہیں۔ حرفِ حق کے پیامبر نہیں کہ اس کو دوسروں تک پہنچائیں۔ وہ ان پر باہر سے برتری کے انداز میں حکم لگا سکتے ہیں، ان کی زندگی میں شریک نہیں ہوتے، ان کے دل میں نہیں اُترتے، ان مجبوریوں اور محرومیوں کو نہیں دیکھتے جو ان کے نصیب میں آئی ہیں کسی خارجی تقدیر کے ہاتھوں نہیں بلکہ سماج کی سنگ دلی یا بے اعتنائی کی وجہ سے۔ انہیں "آدمیت" کے اس مقام سے آشنا کرنے کی ضرورت ہے کہ

آدمیت احترام آدمی — باخبر شد از مقامِ آدمی
حرفِ بد بر لب برآوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست
بندۂ حق از خدا گیرد طریق — می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل — دل اگر بگریزد از دل وائے دل

انسانیت کے اسی تصور میں سے انصاف پسندی، روا داری اور عالمگیر محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ بعض لوگ جو خود کو دنیاوی اعتبار سے بہت عقل مند کہتے ہیں خیال کرتے ہیں کہ ان صفات پر زور دینا معلمین اخلاق کی وعظ پسندی ہے اور بس اور دنیا ان اصولوں پر نہیں چلتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال ایک بڑی خطرناک غلطی پر مبنی ہے۔ ہم انسانی ارتقا کے جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں ان کے بغیر کام چل نہیں سکتا۔ انسانوں کی بھلائی برائی، ان کا نفع نقصان اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے کہ جب تک ہم زندگی میں ان صفات کو برتنا نہ سیکھیں ہمارا بیڑا پار نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں قتل و خون، نفرت اور تعصب کی اس قدر گرم بازاری کیوں ہے اور ہماری علمی صلاحیتیں کھلم کھلا تخریب کے لئے کیوں استعمال ہو رہی ہیں؟ اسی وجہ سے اب تک ہمارے دماغوں نے پرانے اور بے معنی عقیدوں اور اوہام کا دامن نہیں چھوڑا۔ رہتے ہیں بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب سائنس اور صنعت و حرفت اور فنی ترقیوں نے ساری دنیا کو گویا ایک چھوٹی سی بستی بنا دیا ہے جہاں سب ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں، لیکن

خیالات اور جذبات پر ابھی تک ایک ایسی پرانی دنیا اور فکری تنظیم کا تسلط ہے جو ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی۔ وہی قومی اور نسلی تعصب، وہی رنگ اور مذہبی اختلافوں کی پیچ، وہی ٹھٹھرا ہوا دماغ، وہی تنگ اور بے فیض دل جس کی دھڑکن کا دور حاضر کی لہروں سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں ایک طرف سورج کی کرنوں کو گرفتار کرنے، ستاروں کی گزرگاہوں کو تلاش کرنے اور ان تک پہنچنے کا حوصلہ ہے اور دوسری طرف اپنے معمولی نفع ونقصان کی سمجھ بوجھ نہیں اور اپنی رات کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اسے سحر نہیں کر سکتے! اس کے لئے ضرورت ہے اس عقل کی جس کو قرآن کی ایک آیت میں "حکمت" کہا گیا ہے "اور جس کو حکمت دی گئی اس پر خیر کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں"۔ اور اس دل کی جس میں عشق کی شمع روشن ہو۔ لیکن ہم ہیں کہ عشق کی شمع جلانے کی بجائے زہریلی گیس کے بادل پھیلاتے ہیں اور انسان کے مستقبل کو اٹیم بم کی بھینٹ چڑھانے پر آمادہ ہیں! معلم کا کام ہے کہ موجودہ نسل کے دل ودماغ میں اس حقیقت کو بٹھائے کہ بہت سی صداقتیں جو پرانے زمانے میں صرف مذہب اور اخلاق کے معلمین سکھاتے تھے آج مصلحت شناسی، دوراندیشی، دنیاداری، سمجھ داری، خود غرضی سبھی ان کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان کے بغیر چارہ نہیں۔ راستے صرف دو ہیں۔ ایک اِن ابدی قدروں کا راستہ اور دوسرا، جو باوجود سیاسی بازی گروں کی خود فریبی اور دنیا فریبی کے سیدھا تباہی کے گھاٹ کی طرف جاتا ہے۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں!

علاوہ رواداری اور انسان دوستی کے دو اہم صفات اور ہیں جن کے بغیر ایک صالح اور کامیاب زندگی کی بنیادیں مستحکم نہیں ہو سکتیں۔ ایک تو جرأت جس کے بغیر آدمی دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ ایک بزدل آدمی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے دنیا کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھے اور اپنا راستہ چھوڑ کر دوسروں کے راستے پر چلے کہ اسی میں امن اور عافیت ہے! اس میں ایک عنصر جسمانی جرأت کا ہے جس کے بل پر وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی تکلیفیں اور خطرے جھیلنے کو تیار ہو جاتا ہے اور دوسرا ذہنی جرأت کا، جو تنقید اور اجتہاد کا سرچشمہ ہے، جو رائے کے معاملے میں بھیڑ چال کو جائز نہیں سمجھتی اور عقیدے کے گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر آزادی

فکر وعمل کے خطروں کا خیر مقدم کرتی ہے ۔ اس کا ایک پہلو اخلاقی جرأت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کے سہارے انسان اپنے ضمیر کی آواز پر چلتا ہے اور جب اس میں اور سماج کے مطالبوں میں صریح اختلاف ہو، سماج کی مخالفت کی پروا نہیں کرتا ۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی کے نوے فی صدی کاموں میں ایسا موقع نہیں آتا کہ اسے اس قسم کا کٹھن فیصلہ کرنا پڑے ۔ لیکن ہر شخص کے لئے خواہ اس کی ظاہری حیثیت اور حلقۂ عمل کتنا ہی معمولی ہو، کبھی نہ کبھی اس قسم کے مقام آتے ہیں جو اس کے انسانی شرف کو کسوٹی پر کس کر دیکھتے ہیں ۔ اگر وہ اس امتحان میں پورا نہ اترے تو اپنی نظر میں بھی گر جاتا ہے اور نگاہ حقیقت شناس کے سامنے ذلیل ہوتا ہے ۔ تیسری صفت ، جو دل کی گرمی اور نرمی اور جرأت کے ساتھ مل کر انسانی سیرت کی تکمیل کرتی ہے ذہنی بیداری ہے جس کی شمع ہاتھ میں لیکر ہم اپنی پیچیدہ زندگی کی بھول بھلیوں میں سیدھا راستہ تلاش کر سکتے ہیں ۔ ہماری دنیا اتنی تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے اور اس میں آئے دن ایسے نت نئے اور کٹھن مسئلے ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں کہ ہم اب روایت اور تقلید کی بیساکھیوں کے بل دور تک نہیں چل سکتے ۔ اس میں اپنا صحیح مقام تلاش کرنے اور اپنا راستہ متعین کرنے کے لئے ایک روشن ذہن کی ضرورت ہے جو معاملات کو سمجھ سکے ، اصل اور نقل میں ، اہم اور غیر اہم میں تمیز کر سکے ، جو سیدھی شاہراہ پر چلے ۔ ایسی پگڈنڈیوں میں بھٹکتا نہ پھرے جو اسے منزل سے دور لے جاتی ہیں ۔ اگر اس کی معلومات علم نہ بنیں گی ، اگر اس علم کا رشتہ اس کی روزمرہ کی زندگی سے قائم نہ ہوگا اور یہ علم حکمت کی روشنی سے منور نہ ہوگا تو انسان موجودہ زندگی کی گتھیوں کو ہرگز نہ سلجھا سکے گا ۔

اگر کسی آدمی میں بقدر توفیق یہ تین صفتیں جمع ہو جائیں تو وہ انسان بن جاتا ہے یا بن سکتا ہے ایسا انسان جو بڑی حد تک تعصب اور تنگ دلی جہالت اور وہم پرستی ، بے انصافی اور حق تلفی سے پاک ہو اور انسان دوستی ، حق پسندی ، فراخ دلی ، رواداری اور محنت اس کا شیوہ ہو اس انسان کے لئے نہ قارون کی دولت درکار ہے نہ افلاطون کا علم ، نہ یوسف کا حسن ، نہ سکندر کی حکومت ، اس کا سرمایہ حیات اقبال کے الفاظ میں محض "ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستی شوق" ہوگا اور بس !

ہندوستان کا مستقبل

بعض لوگوں کو ہمیشہ تصویر کا تاریک پہلو نظر آتا ہے بلکہ انہیں اس کو دیکھنے اور اس پر افسوس کرنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ شاید ان کو اس طرح کسی قسم کی مریضانہ تسکین حاصل ہوتی ہے! میں اپنا شمار ایسے لوگوں میں نہیں کرتا۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ تصویر کے روشن پہلو کو پیش نظر رکھنا زیادہ مفید ہے بشرطیکہ ہم حقیقت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر کے "ساون کے اندھے" کی ذہنیت نہ پیدا کرلیں۔ جب میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں تو اس کی طرف سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ فکر، کوشش، ذہنی چوکسی یہ سب یقیناً ضروری ہیں لیکن مایوسی جائز نہیں۔ باوجود ان تمام مشکلوں اور خرابیوں کے، ان اختلافات اور تنگ نظری کے مظاہروں کے جو ہماری زندگی کے ہر گوشے پر چھائے ہوئے ہیں ہمارے قومی تمدن میں ایسی قوتیں کام کر رہی ہیں اور ہمارے ہاں ایسے وسائل اور ذرائع موجود ہیں جو اس کے مستقبل کو روشن بنا سکتے ہیں۔

ان میں سے ایک قابل ذکر چیز ہمارے تمدن کا تسلسل اور اس کی زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ اگر ہم اس کے تاریخی پس منظر پر سرسری نظر بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ تہذیب ہزاروں برس کی کوشش اور بہت سے فکری دھاروں کے میل کا نتیجہ ہے۔ وہ گویا ایک سمندر ہے جس کی گود میں بہت سے دریاؤں اور ندیوں نے دور دور سے آکر اپنے خزانے ڈال دیئے

ہیں۔ یونان اور مصر اور روم کی تہذیبیں بنیں اور بگڑ گئیں لیکن ہندی تہذیب کا سلسلہ ہزاروں برس سے اسی طرح قائم ہے بلکہ اس کے خمیر میں نئے عناصر کے مل جانے سے زیادہ قوت اور شگفتگی پیدا ہوتی رہی ہے۔ یہ تہذیب اگر کسی چیز پر بجا طور پر ناز کر سکتی ہے تو وہ اس کی فراخ دلی مختلف اثر ول کو قبول کرنے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ تنگ نظری ہر قسم کی برائیوں کی جڑ ہے اور ہماری تہذیبی جنیس (Genius) سے کسی طرح میل نہیں کھاتی " دوسری قوموں کو وسعت نظر حاصل کرنے کے لئے شاید نئے سبق سیکھنے کی ضرورت ہو لیکن ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ رواداری ہماری تہذیب کی بنیادی صفت ہے جس کا ہم نے ہزاروں برس پالن کیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں خیال کے اختلافات کی وجہ سے جنگ اور خونریزی کا بازار گرم ہوا لیکن ہندوستان میں ان کو (بالعموم) رواداری اور مفاہمت کی فضا میں حل کیا گیا ہے۔ یہاں مختلف مذہبوں اور تہذیبوں نے دوش بدوش زندگی بسر کی ہے... ہندوستان کے ذہن نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ سچ کے مختلف روپ ہیں اور باہمی نفرت اور مخالفتیں اس وقت سر اٹھاتی ہیں جب لوگ حق یا خیر کے میدان میں اجارہ داری قائم کرنا چاہتے ہیں"۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ یہ کس حد تک ہمارے عمل کی صحیح تصویر ہے لیکن یہ ہمارے انداز فکر کی یقیناً صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

تاریخ کے قدیم دور میں ہندو، بدھ، اور جین مت کے فکر اور فلسفے، اشوک اور چندر گپت جیسے بادشاہوں کی دانش مندانہ سیاسی تنظیم، صنعت و حرفت، دستکاری، فنون لطیفہ اور فن تعمیر کی مسلسل ترقی اور دوسرے علمی، ادبی اور ذہنی کارناموں کی بدولت اس ملک میں ایک زبردست تہذیب نے پرورش پائی جس کے بہت سے آثار اب بھی دنیا کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔ جب اس تہذیب پر زوال اور افسردگی کا زمانہ آیا، تو قدرت نے ایک نئی تہذیبی تحریک سے اس کا رشتہ جوڑا اور پچھلے ایک ہزار برس میں اس کے اندر مسلمانوں کی تہذیبی دولت بھی شامل ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اس میں ایک نئی زندگی اور قوت پیدا ہوئی۔ مسلمانوں نے رفتہ رفتہ حکومت کے نظم و نسق

میں نئے اصول شامل کئے۔ علوم و فنون کی سرپرستی کی۔ دستکاریوں کو فروغ دیا، فن تعمیر اور باغ بانی کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ زبانوں اور ادب کو ترقی دے کر ملک کی علمی زندگی کو مالا مال کیا اور سماجی مساوات اور اخوت کے اصول کا پرچار کیا۔ اس طرح ہندو مسلم اثرات کے سنگم سے ایک نئی ہندوستانی تہذیب پیدا ہوئی جس نے مختلف مذہبوں، تہذیبوں اور قوموں کے خزانے سے بہت سی اچھی چیزیں لیں اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ سمو کر وہ حسین ہم آہنگی آراستہ کی جو کہیں تاج محل اور موتی مسجد کی شکل میں چمکتی ہے، کہیں تان سین کی موسیقی اور مغل مصوری میں جھلکتی ہے۔ کہیں کبیر اور نانک کی بھگتی اور چشتی کے تصوف میں ظاہر ہوتی ہے، کہیں حالی اور نظیر، ٹیگور اور اقبال کی شاعری اور سرشار اور پریم چند اور آزاد کی نثر بن کر دل کے تار ہلاتی ہے اور کہیں اکبر اعظم کی گنگا جمنی تہذیب کا روپ اختیار کرتی ہے۔ اور اگر ہم دور حاضر کی حدود میں داخل ہوں تو اس کا جلوہ گاندھی کی انسان دوستی اور جواہر لال کی بین الاقوامی سیاسی پالیسی کی صورت میں اجاگر ہوتا ہے جو نسل اور قوم اور جغرافیہ کی حدود کو توڑتی ہوئی انسانی ایکتا کی علم برداری کرتی ہے۔ اس پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ بعض لوگ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں اور حرکتیں کرتے ہیں جیسے ہندوستانی تہذیب کسی خاص مذہب یا جماعت یا ذات یا قوم یا نسل یا زمانے کی ملکیت ہو جس میں بعض غیر ملکی اجزا زبردستی شامل ہو گئے ہیں اور اس کی عفت کو قائم رکھنے کے لئے ان کو خارج کرنا ضروری ہے! ہر انصاف پسند اور معقول شخص کا فرض ہے کہ وہ مضبوطی کے ساتھ اس رجعت پسندانہ نظریے کو مسترد کرے۔ قومی تہذیب پر عمل جراحی ناممکن ہے جب آپ انسان کے خون میں سے اس کے مختلف اجزا کو علیحدہ کر سکیں، جب آپ کسی نغمے میں سے اس کے زیر و بم کو جدا کر سکیں، کسی خوبصورت ریشم کے ٹکڑے میں سے تانا اور بانا الگ کر دکھائیں، قومی ادب کی شیرینی میں سے مختلف زبانوں اور گروہوں کا حصہ الگ الگ نکال کر رکھ دیں اور اس کے بعد بھی خون خون رہے، نغمہ نغمہ رہے، ریشم ریشم رہے، ادب ادب رہے اس وقت آپ قومی تہذیب کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوشش کریں اور اس کو پاک اور پوتر بنانے کا

خواب دیکھیں!

پھر دو سو برس گزرے جب اس ملی جلی تہذیب پر زوال کا دور آیا تو مشیت نے اس کا تعلق مغرب کی جدید تہذیب کے ساتھ قائم کیا۔ یہ میل ایک ٹکر کی شکل میں ہوا تھا۔ لیکن دو جیتی جاگتی تہذیبیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو وہ اجنبی نہیں رہ سکتیں اگرچہ یہ نئی تہذیب ایک انجانی تہذیب تھی اور اس کے لانے والے یہ نہ چاہتے تھے کہ اس ملک میں گھل مل جائیں۔ لیکن اس کا اثر ہندوستانی فکر اور زندگی پر بہت گہرا پڑا۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا، کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کی مہمان نواز تہذیب اس مغربی تہذیب کا اثر قبول نہ کرتی خصوصاً جب وہ ایک حاکم قوم کی تہذیب بن کر آئی ہو؟ عربی زبان کی مثل ہے کہ لوگ اپنے حاکموں کے راستے پر چلتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے لوگوں نے اسی مثل پر عمل کیا اور رفتہ رفتہ ان دونوں دھاروں میں لین دین بڑھتا گیا اور ہندوستانیوں نے مغرب کی بہت سی چیزوں کو مستعار لیا اور بعض کو اپنایا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نئی خوراک ہمیں پوری طرح ہضم نہیں ہوئی اور اس کا خون صالح بن کر ہمارے جسم میں نہیں دوڑا۔ لیکن اس کی ایک بڑی وجہ حاکم اور محکوم کا غیر فطری رشتہ تھا جو فریقین کے لئے باعث لعنت ہوتا ہے۔ لیکن اب کہ یہ صورت حال بدل چکی ہے۔ ہم زیادہ آزادی اور آمادگی، لیکن تنقیدی رکھ رکھاؤ کے ساتھ، اس کے بہترین عناصر کو اپنے اندر جذب کر سکتے ہیں۔ ہندوستان اور مغرب کے اس لین دین کی تاریخ دل چسپ ہے اور کئی منزلوں سے گزری ہے جس کی طرف مختصر سا اشارہ اس لئے ضروری ہے کہ اس سے ہمارے بعض موجودہ رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔

شروع میں جب مغربی تہذیب ہندوستان میں آئی اس کے لانے والے انگریز تاجر یا مشنری تھے اور اس کو وہ رسوخ حاصل نہ تھا جو حکومت کے ساتھ وابستگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ہندوستانی تمدن کی بہت سی روایتوں اور رسم و رواج کو اختیار کیا اور ایک حد تک ہندوستانیوں میں مل جانے کی کوشش کی۔ اس زمانے کے انگریزوں کی تصویریں، ان کی زبان دانی

ان کی شاعری کی کوششیں، ان کے رسم و رواج، اس بات کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔
اس وقت باوجود سیاسی زوال کے آغاز کے ہندوستانی اپنی تہذیب کو بہت بلند سمجھتے تھے اور مغرب سے آئے ہوئے یہ بدیسی، جن کی خوراک، لباس، رہنا، سہنا، بول چال سب ہم سے الگ تھی انہیں کچھ عجیب اور مضحک سے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے پادریوں کی طرف سے بہت سے لوگوں کو اندیشہ تھا کہ وہ انہیں ان کے آبائی مذہب کی طرف سے بدظن کر دیں گے۔ اگر آپ اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے ادب کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے بہت سے لکھنے والوں اور شاعروں نے ان کا مذاق اڑایا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان بدیسیوں کے ہاتھ میں سیاسی قوت آنے لگی۔ انہوں نے ملک کے ایک بڑے حصے پر اپنا اثر یا اقتدار قائم کر لیا۔ انہوں نے ہندوستانی رئیسوں کو آپس میں لڑایا اور ان کی باہمی مخالفتوں سے فائدہ اٹھا کر ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اب بہت سے لوگوں کی نظر میں ان کا "بے ڈھنگا" لباس شان اور امتیاز کی علامت بن گیا۔ ان کی زبان جس کو لوگ گوروں کی "گٹ پٹ" کہا کرتے تھے، حاکموں اور دفتروں کی زبان قرار پائی اور لوگ اس کی نقل کرنا ترقی کی شان سمجھنے لگے۔ چھری کانٹے سے کھانا، جس کو ہمارے بزرگ برا خیال کرتے تھے، فیشن میں شامل ہو گیا۔ رہنے سہنے کے طریقے، چال ڈھال، نشست و برخواست کے آداب سب ایک نئے سانچے میں ڈھلنے شروع ہوئے۔ پھر جب روزی کے پرانے سہارے ٹوٹنے لگے اور لوگوں کو نئے حاکموں کا منہ تکنا پڑا تو انہیں انگریزی زبان سیکھنے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی فکر ہوئی اور اس بدلتے ماحول میں تعلیم کا نظام اور مقصد دونوں بدل گئے۔ مقصد یہ قرار پایا کہ لڑکا انٹرنس یا بی اے پاس کر کے بابو یا تحصیلدار یا پولیس انسپکٹر یا قسمت یاوری کرے تو ڈپٹی کلکٹر بن جائے۔ اس لئے جو لوگ پہلے مغربی چیزوں کا مذاق اڑاتے تھے انہوں نے اب ان کی اندھا دھند نقالی شروع کر دی لیکن سب نے نہیں۔ بعض ایسے بھی تھے جو کسی داموں اپنی تہذیب اور تمدن کی قدریں اور وضع داریاں (اچھی ہوں یا بری) ہاتھ سے دینے کو تیار نہ تھے۔ خصوصاً مسلمانوں میں ایک با اثر طبقہ ایسا تھا جن میں بہت سے

عالم دین بھی شامل تھے، جو مغربی تہذیب کو عیسائی مذہب کا پیش خیمہ سمجھتے تھے اور اس وجہ سے چاہتے تھے کہ مسلمان حکومت کی زبان، نوکری اور طریقہ تعلیم سے الگ رہیں۔ چنانچہ اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری میں جا بجا بڑے پر لطف طنزیہ انداز میں اس نقالی پر تنقید کی ہے۔ اسی زمانے کی ایک اور مشہور ادبی تصنیف مولوی نذیر احمد کا ناول "ابن الوقت" ہے جس میں انہوں نے زیادہ سنجیدہ انداز میں ہندوستانیوں پر مغربی تہذیب کے مضحک اور مضر اثرات کو دکھایا ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد مقابلۃً کم تھی اور جوں جوں ملک پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی ان کا اثر بھی کم ہوتا گیا۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا درست ہوگا کہ انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستان کی تعلیم یافتہ، نوکری پیشہ جماعت انگریزی تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔ بہت سے لوگوں کو اس کی ظاہری چمک دمک اور مادی کامیابی نے اس قدر چکا چوند کر دیا تھا کہ انہیں اس کے مقابلے میں اپنی بیشتر چیزیں تہذیب، تمدن، زبان، اخلاق، رسوم و رواج، ہیچ معلوم ہونے لگے۔ ان میں سے بعض کی تو سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ انگریزی اس طرح زبان مڑوڑ کر بولیں کہ نیم تعلیم یافتہ ناواقف کو دھوکہ ہو جائے کہ وہ تازہ ولایت ہیں اور خاص آکسفورڈ کے کھیت کی مولی ہیں۔ لباس ایسا پہنیں کہ لندن کا سلا ہوا اور پیرس کا دھلا ہوا معلوم ہو، اور پتلون کی کریز بزرگوں کی تلوار سے زیادہ تیز ہو! اپنے دوستوں، عزیزوں، بزرگوں اور چھوٹوں سے میل جول کے جو طریقے اور آداب عرصے سے چلے آتے ہیں، ان کو بھلا دیں اور لوگوں سے اس طرح برتاؤ کریں کہ لوگ انہیں گویا انگریز ہی سمجھیں۔ یعنی میکالے کی وہ پیشین گوئی پوری کر دکھائیں کہ ہم ہندوستان میں ایک ایسی انگریزی تعلیم یافتہ جماعت پیدا کریں گے جو اپنے گفتار و کردار، خیالات اور جذبات، لباس اور وضع قطع، غرض رنگ کے سوا ہر چیز میں انگریزوں کی نقل معلوم ہو گی (اس نے یہ نہیں کہا، یہ نہیں سوچا کہ وہ کتنی بھدی نقل ہو گی!) چنانچہ قوم نے یہ نقالی کا دور بھی جھیلا۔ مگر اس کی سب سے بڑی خرابی یہ نہ تھی کہ لوگوں نے اپنا بیرونی لباس اور وضع قطع بدل لی تھی بلکہ اس خارجی تبدیلی کے ساتھ ان کی اندر سے بھی قلب ماہیت ہو چلی، وہ اپنی قومی خصوصیتوں، قومی خودداری اور عزت نفس کو بھلا بیٹھے اور اپنی ہر چیز کو گھٹیا

سمجھنے لگے اور مغرب کی ہر چیز کو برتر! یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اکثر قوموں کے اخلاق اور عادات پر غلامی کا ایسا ہی اثر ہوتا ہے جو قومی سیرت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ایک نئے محکوم نظام میں کامیابی، دولت، شہرت، رسوخ حاصل کرنے کے لئے لوگ عام طور پر ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں جو خود ان کے لئے بھی بُرے ہوتے ہیں اور ملک کے لئے بھی۔ ایک آزاد، خود مختار ملک میں جہاں سماجی انصاف کا تصور کار فرما ہو وہ لوگ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں جو سماج سیوا کرتے ہیں، دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، سائنس، ادب، فلسفہ، آرٹ، ایجاد اور تحقیق وغیرہ میں نام پیدا کرتے ہیں۔ انہیں کو اکثر نیک نامی اور عزت نصیب ہوتی ہے لیکن ایک غلام ملک میں ان چیزوں کی کوئی خاص پوچھ نہیں ہوتی۔ وہاں بڑائی اور ناموری ان لوگوں کے لئے ہے جو حاکم قوم کا آلۂ کار بنتے ہیں، ان کی قوت کو مستحکم کرتے ہیں، محکوم قوم کو دبانے میں مدد دیتے ہیں اور خوشامد، جھوٹ اور ناحق کے آزمودہ ہتھیاروں سے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ حاکم قوم ایسے لوگوں کی دل سے عزت نہیں کرتی لیکن اپنی غرض کے لئے انہیں آگے بڑھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس حکومت نے سالہا سال گاندھی اور موتی لال، داس اور لاجپت رائے، جواہر لال اور ابوالکلام، اجمل خاں اور انصاری کو جیل میں رکھا اور ان کے ساتھ سیاسی اچھوتوں کا سا سلوک کیا۔ اس نے بہت سے ایسے لوگوں کے اپنے بہترین انعاموں اور عہدوں سے نوازا جو لیاقت، دیانت داری، فرض شناسی، قوم پرستی اور سیاسی سوجھ بوجھ میں ان کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ اس لئے وہ تمام لوگ جن کے قدموں میں اصول پرستی اور دیش بھگتی کی استقامت نہ تھی، خود غرضی اور طلب جاہ کے آسان راستے پر پڑ لئے۔ شاید اسی وجہ سے ہمارے انگریزی طبقہ میں محب وطن اور با اصول کم اور ابن الوقت زیادہ پیدا ہوئے۔ ان میں جرأت کی بجائے خوف، سچائی کی جگہ مصلحت پرستی، صاف گوئی کی بجائے خوشامد، قومی خدمت کی لگن کی بجائے خود غرضی کی ذہنیت جڑ پکڑ گئی اور عوام کے ساتھ یک جہتی کا احساس باقی نہیں رہا۔ وہ خود کو ایک الگ ذات سمجھنے لگے اور بجائے جنتا کے دکھ سکھ میں شریک ہونے اور ان کا بوجھ بٹانے کے اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں پڑ گئے۔ لیکن یہ دور بھی زیادہ عرصہ قائم نہیں رہا اور جلد ہی باشعور افراد اور حلقوں میں اس کے خلاف

ردِ عمل شروع ہوا۔ سیاسی بیداری کے ساتھ ذہنی خودداری بھی ابھری اور ملک کے روشن نظر اہل فکر نے اس رجحان پر زبردست تنقید کی اور لوگوں کو یاد دلایا کہ انہیں مغرب کی اندھی تقلید چھوڑ خود اپنی قومی روایتوں اور تہذیب کے سوتوں میں قوت اور خودشناسی کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اس تحریک کے مختلف پہلوؤں کی علم برداری مختلف قسم کے لوگوں نے کی جن میں راجہ رام موہن رائے، سرسید احمد خاں، اروبندو گھوش، رابندر ناتھ ٹیگور، مہاتما گاندھی وغیرہ شامل ہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں۔ مثال کے طور پر دو تحریکوں کا حوالہ دینا کافی ہوگا جن میں سے ایک گاندھی جی کی ذہنی اور سیاسی تحریک تھی اور دوسری اقبال کی فکری تحریک جس کا اظہار ان کی اُردو اور فارسی شاعری میں ہوتا ہے۔

گاندھی جی نے مغربی تہذیب کے ان تمام اثروں کے خلاف اپنی ذاتی مثال اور تعلیم اور مختلف عملی تحریکوں کے ذریعہ جہاد کیا جنھوں نے ہندوستانی سیرت کو کمزور اور ہندوستانیوں کی قوت عمل کو شل کر دیا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو سبق دیا عیش پرستی کی بجائے سادگی، لالچ کی بجائے قناعت کا، خوشامد کی بجائے خودداری کا، جھوٹ کی عافیت کی بجائے سچ کے خطروں کو نوازنے کا بزدلی کی بجائے جرأت سے کام لینے کا اور عوام سے بیزاری یا بے تعلقی کی بجائے ان کی خدمت کا، انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ محض ضرورتوں کو بڑھانا اور ان کی تشفی کے لئے مادی پیداوار میں اضافہ کرنا تہذیب کی ترقی کا ثبوت نہیں۔ اس کا تعلق بڑی حد تک نفس انسانی کی باطنی دولت سے ہے۔ یعنی ان کی ہمہ گیر تحریک کا مرکزی مقصد قوم کی اسپرٹ کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا تھا تاکہ وہ آزادی کی ہمت طلب اور صبر آزما فضا میں سانس لینا سیکھیں۔ مگر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قومی سیرت کی یہ کمزوریاں ہم میں صرف مغرب کے اثر سے پیدا نہیں ہوئی تھیں بلکہ دو سو برس کی غلامی، سیاسی ابتری اور جاگیردارانہ نظام کا نتیجہ بھی تھیں۔ اس لئے ان کی ذمہ داری مغرب سے زیادہ خود ہم پر عائد ہوتی ہے۔ گاندھی جی اس بات کو خوب سمجھتے تھے اور انہوں نے اپنی بے باک تنقید کے ساتھ ساتھ اپنی حق پسندی کی وجہ سے مغرب کی خوبیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا اور ان سے سبق لینے کی ہدایت کی۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس تہذیب کے بعض

مشینی لوازمات کا سواگت نہیں کیا، نہ اس کی مذہب سے بے تعلقی، تکلف پسندی اور عیش و عشرت کی ذہنیت کو قبول کیا۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ کشمکش اور چھین جھپٹ کے خلاف ضرور سختی سے آواز اٹھائی لیکن مغربی قوموں کی محنت اور علمی جدوجہد کو، ان کی زبان اور ادب کو، ان کی سائنس اور فلسفے کی روح کو، ان کی جمہوری تحریکوں کو، ان کے لبرل اور سوشلسٹ تجربوں کو جن کا مقصد عوام کی زندگی کو بہتر بنانا تھا، ان سب کو انہوں نے سراہا اور ان سے اپنے کام میں مدد لی۔

اقبال خودی اور انفرادیت کے قائل تھے۔ افراد میں بھی اور قوم میں بھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک کوئی شخص یا کوئی جماعت اپنی تہذیبی میراث اور خودی میں ڈوب کر موتی کی سی آب اور سختی پیدا نہیں کرتی وہ کمزور اور بے فیض رہتی ہے۔ اس لئے انہوں نے ہمیشہ غلامی کی، تقلید کی، بھک منگوں کی طرح سوال کرنے کی برائی کی اور اپنے ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کو خود اعتمادی کی، خودی کو مستحکم کرنے کی، اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی تعلیم دی۔ ان کی ایک چھوٹی سی نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ "گلہ" جس میں انہوں نے ہندوستان کی غلامی کا رونا رویا ہے اور بتایا ہے کہ سیاسی غلامی کس طرح ذہنی غلامی کی پیش رو بن جاتی ہے۔

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک — بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
جاں بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر — افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے!

ان کی آرزو یہ تھی کہ ہم مغرب کی ذہنی غلامی کو چھوڑ کر اپنی سیرت میں فولاد کی سی سختی اور حریر کی سی نرمی پیدا کریں۔ تاکہ باطل کے سامنے سپر بن سکیں اور دوستوں، ساتھیوں اور عام طور پر شریف اور ضرورت مند انسانوں کے حلقے میں اور سوز و گداز سے کام لے سکیں۔ بیشتر لوگوں کی زندگی گھٹیا اغراض اور غلط مقصدوں کے چکر میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ تعلیم کا تقاضہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم ان کی بجائے بلند مقصدوں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑیں اور اپنی خودی میں انقلاب پیدا کر کے اس کے ذریعہ عالم خارجی میں انقلاب

کی بنیاد ڈالیں :۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر اس سے یہ ممکن ہے کہ تو بدل جائے!

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے!

یہی شراب یہی ہائے ہو رہے باقی طریقِ ساقی و رسم کدو بدل جائے!

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے!

ان کو شکایت تھی کہ اہل مشرق نے مغرب کی ظاہری اور سطحی چیزوں کی نقل کی لیکن اس کی گہری اور بنیادی حقیقتوں کو نہیں اپنایا۔ ان کے رقص و سرود، ان کے چنگ و رباب، ان کی عریانی اور بے شرمی کو اپنے لئے لائق تقلید سمجھا۔ ان کے علم وفن، ان کے ضبط اور خودداری، ان کی قومی یک جہتی اور سوشل سروس کو اپنی سیرت میں شامل نہیں کیا۔ اس لئے اقبال نے مشرق اور مغرب کے فکر صالح کے درمیان ایک پل بنانے کی کوشش کی اور سائنس اور مذہب، قوت اور نظر میں ربط پیدا کرنے کی تلقین کی۔ یہ وہ سبق ہے جو ہندوستان اور بیرون ہند کے بہت سے حساس مفکّر حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، مختلف انداز میں اس زمانے میں دہراتے رہے ہیں لیکن اقبال نے اس خیال کو اس قدر فنی کمال اور حُسن اور اثر کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ اس کی شاعری کے سچّے رمز شناسوں کے فکر کا ایک لازمی جزو بن گیا ہے۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ مغربی تہذیب بعض نہایت اہم قدروں کی حامل ہے اور اس نے ہماری سیاست، معاشرت، اخلاق و عادات پر بعض لحاظ سے اچھا اور گہرا اثر ڈالا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس سودے میں گھاٹا ہی گھاٹا رہا ہے وہ تنگ نظر اور رجعت پسند ہیں۔ اس کی بدولت ہم رفتہ رفتہ عہد وسطیٰ کے جاگیر دارانہ نظام کی زنجیروں سے رہا ہوئے جس کی دلچسپ لیکن عبرت ناک جھلک ہمیں مثلاً رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد میں ملتی ہے۔ اس میل جول کے واسطے سے ہم میں سے بہت سے لوگوں نے مل جل کر اور منظم طریقے سے سیاسی اور سماجی خدمت کرنے کے نئے ڈھنگ سیکھے۔ ہم نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور اس کے ذریعہ فکر مغرب کے

دروازے ہم پر کھل گئے۔ اس کے اثر سے ہماری صنعت وحرفت اور پیداوار کے نظام نے ایک نیا رُخ اختیار کیا، شہری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں اور مکان، لباس، خوراک، سیر و تفریح کے طریقے، ادبی مذاق سب اس سے متاثر ہوئے۔ اس تہذیب کے بہت سے لوازم ہماری زندگی کا جزو بن گئے جیسے ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ڈاک، تار اور اشاعت خیال کے جدید وسائل مثلاً ریڈیو، سینما، گراموفون، مطبوعہ کتابیں اور اخبار، علاج کے نئے طریقے، سرجری کے نئے آلات وغیرہ لیکن ان چیزوں کی اہمیت محض اتنی نہیں ہے کہ اب انسان اور اس کے خیالات اور سامان و اسباب زیادہ تیزی کے ساتھ سفر کر سکتے ہیں یا بعض پرانے لاعلاج مرضوں کا علاج ممکن ہو گیا ہے۔ دراصل ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کی حیثیت صرف ایک بیرونی آلہ یا مشین کی ہو، ان میں سے ہر ایک نے ہمارے خیالوں اور عادتوں پر اثر ڈالا ہے اور زندگی کے ایک بدلتے ہوئے تصور کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً جو آدمی بیل گاڑی کو چھوڑ کر موٹر یا ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے وہ صرف زیادہ تیزی کے ساتھ فاصلہ ہی طے نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی نظر میں زیادہ وسعت پیدا ہوتی ہے اور دوسرے صوبوں، ملکوں اور قوموں کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے "تم اس شخص کو جانتے ہو؟" "نہیں، مگر میں اس سے نفرت کرتا ہوں" "کیوں؟" "اس لئے کہ میں اس کو نہیں جانتا!" واقفیت سے دوستی لازم نہیں آتی لیکن یہ دوستی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ اخباروں اور رسالوں کو لیجئے۔ ان کی بدولت جہاں ہم ایک طرف دنیا کے حالات سے زیادہ باخبر رہتے ہیں۔ وہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اشاعت خیال کے یہ تمام جدید وسائل لوگوں کی ذہنی آزادی چھین لیتے ہیں اور وہ محض اپنے پسندیدہ اخباروں کے خیالات کا (خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط) گراموفون بن کر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ ریڈیو اور سینما جہاں انسان کی تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ ہیں وہاں وہ بسا اوقات اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو کم بھی کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان چیزوں کے اچھے اور بُرے اثرات ہم سب پر پڑے ہیں لیکن اب کہ مغربی تہذیب کا رشتہ سیاسی غلامی کے تصور کے ساتھ وابستہ نہیں رہا۔ ہمیں فراخ دلی کے ساتھ اس کے صالح عناصر کا خیر مقدم کرنا اور ماضی کی طرف لوٹ جانے کے خیال کو ترک کرنا چاہیئے۔ ماضی کی دولت سے فائدہ اٹھانا جائز بلکہ لازم ہے لیکن نظر مستقبل ہی کی طرف رہنی چاہیئے کیونکہ اس تیز رفتار دنیا میں الٹے قدم لوٹنا تو کیا اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہنا بھی زوال کو دعوت دینا ہے۔

ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت ہمیں اس بات کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کے قدرتی دولت کے خزانے اور دوسرے انسانی اور مادی وسائل کس قدر وافر ہیں۔ دنیا کی آبادی کا تقریباً ساتواں حصہ اس دیس میں بستا ہے اور ان میں بہت سی مختلف قوموں نسلوں اور مذہبوں کے لوگ شامل ہیں جن میں طرح طرح کی علمی، عملی اور جمالی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ اس لحاظ سے ہندوستان بجائے خود دنیا کی گوناگونی کا ایک نمونہ ہے۔ اگر ان صلاحیتوں کو مناسب طریقے پر پھلنے اور پھولنے کا موقع مل جائے اور جو رکاوٹیں نوے فیصدی لوگوں کے راستے میں حائل ہیں وہ دور کردی جائیں تو ہم کیا کچھ نہیں کرسکتے۔ دوسری طرف اس کے مادی وسائل کو دیکھیے۔ اس کے پہاڑوں میں ہر قسم کے زر و جواہر اور معدنیات، اس کے جنگلوں میں ہر قسم کی لکڑی اور جڑی بوٹیاں، اس کے دریاؤں میں پانی اور بجلی کے خزانے، اس کی دھرتی کے سینے میں کھیتوں کی سرسبزی اور شادابی پنہاں ہیں۔ اگر ہم جدید سائنس اور ٹکنولوجی کی غیر محدود قوت سے کام لیں تو ملک کی دولت، زراعت، صنعت و حرفت میں کتنا کچھ اضافہ نہیں ہوسکتا؛ غرض نہ آدمیوں کی کمی ہے نہ قدرتی وسائل کی۔ کمی ہے صرف تعلیم کی، امنگ اور حوصلے کی، جو باوجود سیاسی آزادی حاصل کرنے کے، اب تک بیشتر لوگوں میں پیدا نہیں ہوا، ڈسپلن اور میل جول کے ساتھ کام کرنے کی اور کام کو سعادت سمجھنے کی، سیرت کی پختگی کی تاکہ ہم چھوٹے اور گھٹیا مقصدوں کی تلاش میں بڑے بڑے انفرادی اور قومی مقصدوں کو قربان نہ کریں۔ کیا کہا میں نے؟ کمی ہے "صرف" ان چیزوں کی؟ یہی تو دراصل قوموں کی بنیادی کمزوریاں ہیں جن کو دور کرنا تعلیم اور سماج کا اہم ترین فرض ہے۔ کمیت کبھی کیفیت کا بدل نہیں ہوسکتی، یعنی خواہ ہماری تعداد کتنی ہی بڑی اور مادی ذرائع کتنے ہی وسیع ہوں، جب تک ہم افراد کی صحیح تربیت کرکے انہیں باشعور، ہنرمند اور فرض شناس انسان نہیں بنائیں گے، کسی روشن مستقبل کی تعمیر نہیں کرسکتے۔ ایک مبصر کا قول ہے کہ ہندوستان ایک دولت مند ملک ہے مگر اس کے باشندے مفلس ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ انہوں نے ابھی تک اپنے اندر اور باہر کی دولت یعنی اپنی صلاحیتوں اور وسائل سے پوری طرح کام لینا نہیں سیکھا اور دونوں بڑی حد تک بیکار جا رہے ہیں۔

ہیں نے ان خرابیوں کا ذکر نفسیاتی اصطلاحوں میں کیا ہے ۔ اگر ان کی تفسیر سماجی اصطلاحوں میں کی جائے تو ملک کی موجودہ سماجی تصویر سامنے آجاتی ہے ۔ ہمارے سماج میں ابھی تک لوگ بہت سی محرومیوں اور ناانصافیوں کا شکار ہیں ۔ ذات پات کے بھاری بندھن ابھی تک ہمارے ہاتھ پاؤں اور گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں ، ان کے بھی جو ذات پات کو مانتے ہیں اور ان کے بھی جو بظاہر اس کے قائل نہیں ۔ ہمارے امیر اب تک حال مست ہیں لیکن حال کے تقاضوں سے بے خبر اور ہمارے فقیر کھال مست ہیں اور ذوق سعی و عمل سے ناآشنا ۔ اُن کو دولت کے نشے سے ہوشیار اور ناجائز رعایتوں کی زنجیروں سے آزاد کر کے سماجی خدمت کے لئے تیار کرنا ہے اور انہیں جھوٹی قناعت کے پھیر سے نکال کر ناکام زندگی پر صبر کر لینے کی بجائے ایک بہتر زندگی کی جدوجہد کے واسطے آمادہ کرنا ہے ۔ یوں تو مرد اور عورت دونوں جہالت کے چکر میں گرفتار ہیں لیکن عورتوں کی تعلیمی اور سماجی حالت مردوں سے بھی بدتر ہے ۔ اس وجہ سے ان کی طرف زیادہ توجہ ضروری ہے ۔ باوجود سائنس کی ترقی اور علاج کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کے اب تک بیماری ہمارے ملک میں عام اور صحت کم یاب ہے ۔ اکثر لوگ تو کسی خاص بیماری کے نہ ہونے کو صحت سمجھتے ہیں گویا وہ ایک محض منفی کیفیت ہے ۔ زندگی کی رگوں میں حوصلے اور بشاشت کا خون دوڑنے کا نام نہیں !) چاروں طرف دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے بچوں میں بچپن کی شگفتگی اور جوانوں میں جوانی کی رونق اور امنگیں نہیں اور بالغ وقت سے پہلے بڑھاپے کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ ملک کی اوسط عمر ۲۵ سال کے قریب ہے ۔ چونکہ زراعت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے سائنس کی نئی دریافتوں سے پوری طرح کام نہیں لیا گیا ۔ اس لئے غریبی اور بے کاری کا ابھی تک دور دورہ ہے ۔ غربت کا تو یہ عالم ہے کہ بیشتر لوگوں کو دو وقت پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملتا اور بیکاروں کے زمرے میں نہ صرف وہ کروڑوں افراد شامل ہیں جنہیں کرنے کو کام نہیں (اور کس قدر ہمت شکن اور اخلاق دشمن ہے یہ حالت !) بلکہ وہ تمام کسان اور مزدور بھی جو سال کے کچھ حصے میں مصروف اور کچھ حصے میں بیکار رہتے ہیں اور اس طرح اپنی صلاحیت عمل سے نہ خود پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں نہ سماج کو فائدہ

پہنچا سکتے ہیں۔ان کے علاوہ ایک خاص بڑی جماعت ان پیشہ ور بھیک مانگنے والوں، مذہب کے نام پر خیرات کھانے والوں اور بےکار دولت مندوں کی ہے جو کوئی مفید سماجی کام نہیں کرتے، سماج کی دولت میں کچھ اضافہ نہیں کرتے بلکہ طفیلیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان سب کو ایک باعمل اور کارکن سماج کے دائرے میں لانے کی ضرورت ہے۔عام لوگوں، خصوصاً نئے تعلیم یافتہ طبقے کے دل اور دماغ سے خود غرضی کی ذہنیت کو نکال کر اس خیال کا بیج بونا ہے کہ علم، ذہانت، دولت اور اثرورسوخ کے تمام عطیے بےکار اور بےفیض ہیں اگر انہیں اپنے ہم جنسوں کی خدمت میں استعمال نہ کیا جائے۔ان سب کے علاوہ ملک کی مختلف جماعتوں، مذہبی گروہوں اور علاقوں میں جذباتی ہم آہنگی، دوستی اور مفاہمت پیدا کرنی ہے جن کے بغیر ہر کامیابی ایک ناکامی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔یہ کام نہ چھوٹا ہے نہ آسان۔ بقول ایک شاعر کے زندگی میں چھوٹی چیزوں کی تلاش اس بات کا ثبوت ہے کہ بدن میں جان باقی نہیں رہی:

سہل راجستن دریں دیرِ کہن ۔۔۔ ایں دلیلِ آں کہ جاں رفت از بدن

اگر ہمیں ایسے سماج کی بنیاد ڈالنی ہے جس میں ہندوستان کے باشندے محرومیوں سے رہائی حاصل کر کے آزادی اور خودداری کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں تو ہم کو مذکورہ بالا مسئلوں کا حل تلاش کرنا ہوگا۔سب سے اہم شرط یہ ہے کہ اس سماج کی عمارت سماجی انصاف کے ستون پر قائم کی جائے اور ملک کی مادی اور کلچرل دولت سے سب جماعتوں کو پورا پورا اور مناسب فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے تاکہ حقوق و فرائض میں صحیح توازن قائم ہو سکے۔ابھی تک تو امیروں اور غریبوں، خواص اور عوام کی زندگی میں ایک ایسا فصل ہے جیسے وہ ایک ملک کے باشندے ہی نہ ہوں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے لازم ہے کہ دولت کی بہتر اور منصفانہ تقسیم کی جائے اور تعلیمی اور تہذیبی وسائل کو اس طرح عام کیا جائے کہ سب لوگ ان سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق مستفید ہو سکیں۔میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ایک ایسے سماج کا قیام ناممکن نہیں۔ یہاں ابھی تک سرمایہ داری نے اتنی ترقی نہیں کی اور اس کی پکڑ اس قدر مضبوط نہیں ہوئی کہ

اس کے مورچے اکھاڑے نہ جاسکیں۔ علاوہ اس کے کہ ہمارے ملک کی موجودہ پالیسی کا عام رجحان سوشلزم کی طرف ہے، شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ ابھی تک ہمارے دلوں میں روپے کی محبت اتنی مستحکم نہیں ہوئی کہ اس کو نکالنے کی کوشش بالکل ہی بے کار ہو، ہمارے فلسفے اور مذہبوں کی تعلیم بھی زیادہ تر یہی رہی ہے کہ دولت سے دل نہ لگاؤ، یہ سرمایہ دار کی ملکیت نہیں، امانت الٰہی ہے۔ اس کو خرچ کرنے میں خدا کے خوف اور اس کے بندوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھو۔ میں یہ جانتا ہوں کہ گزشتہ سو دو سو برس میں چاندی سونے کے سکّے ہماری زندگی میں بھی بہت زیادہ چالو ہو گئے ہیں اور لوگ اکثر چیزوں بلکہ افراد کو بھی اس غلط کسوٹی پر پرکھنے لگے ہیں۔ لیکن عام لوگوں کے دل میں غالباً چاندی اور سونے کے بتوں کو پوجنے کی خواہش اتنی شدید نہیں جتنی بعض دوسرے ملکوں میں ہے۔ اس لئے مقابلتہً یہاں ایک ایسے سماجی نظام کا قائم کرنا زیادہ آسان ہے۔ جہاں دولت سماج کے سر پر بھوت بن کر مسلط نہ ہو جائے بلکہ سماج کی خدمت کرنا اپنی سعادت سمجھے۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام میں ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ جب سرمایہ داری کا دل و دماغ صنعت وحرفت اور اقتصادی مشین کو چلاتا ہے تو اس کا فائدہ سماج کو مجموعی حیثیت سے نہیں پہنچتا بلکہ دولت بعض افراد یا چھوٹے چھوٹے گروہوں کے ہاتھ میں سمٹ آتی ہے اور عام لوگوں کی محرومیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن اگر اس مشین کو چلانے والوں میں سمجھ داری، شرافت، مل جل کر کام کرنے اور بانٹ کھانے کی صلاحیت ہو تو دولت ایک بہتر سماج قائم کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔

اِس زمانے میں کسی سماج میں انصاف اور مساوات کے اصولوں کی کارفرمائی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک عام لوگوں کے معیار زندگی کو بلند نہ کیا جائے اور انہیں افلاس اور جہالت کے پنجے سے رہا نہ کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں سائنس سے کام لینا ہوگا جو دورِ جدید کا سب سے زیادہ قابل قدر اور انقلاب آفریں عطیہ ہے۔ ہندوستان اس کو کسی طرح رَد نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے دستِ فیض میں نہ صرف مادی پیداوار کا اضافہ ہے بلکہ انسانی دماغ کی صحیح تربیت اور اس کو جہالت، وہم پرستی، تعصب اور خوف کی زنجیروں سے آزاد کرنا بھی ہے۔ جو

لوگ اس دور جدید میں بھی دستکاری کا پرانا نظام قائم رکھنا چاہتے ہیں اور نئی ایجادوں سے فائدہ اٹھانے کو تیار نہیں وہ یا تو لکیر کے فقیر ہیں یا سائنس کی ترقی کے بعض اتفاقی نتیجوں سے ڈر کر (جو زیادہ تر انسان کی حماقت کی وجہ سے مرتب ہوئے ہیں) سرے سے سائنس ہی کو رد کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسا کرنا علمی اور اخلاقی جرأت کی توہین اور ترقی کے راستے میں روڑے اٹکانا ہے۔ دراصل کسی مشکل کا حل اس سے گریز کرنا نہیں بلکہ جرأت اور سمجھداری کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ سائنس جو مسائل پیدا کرتی ہے وہ ان کے حل کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہے۔ اس نے ہماری مادی دولت میں بے اندازہ اضافہ کیا ہے۔ ہماری نقل وحرکت کی رفتار کو بڑھا کر فاصلے کے تصور کو بالکل بدل دیا ہے اور ملکوں اور قوموں کے مفاد کو ایک دوسرے کے ساتھ اٹل طور پر وابستہ کر دیا ہے۔ اس نئی دنیا میں پرانے دماغ کا چراغ لے کر سفر کرنا ممکن نہیں۔ ان نئے مسئلوں کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے لئے ایک بیدار، ایک سائنٹیفک ذہن کی ضرورت ہے جو معاشی میدان میں باہمی چھین جھپٹ اور سیاسی میدان میں نسلی خودکشی کی پالیسی کو رد کر سکے اور ان بے پناہ جدید طاقتوں اور مشینوں کو جو اس کے قبضے میں آگئی ہیں تخریب کی بجائے تعمیر کے واسطے استعمال کرے۔ مثلاً دنیا کی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی نے جو ایک حد تک علاج کے بہتر طریقوں اور اوسط عمر میں اضافہ کا نتیجہ ہے، مدبرین کو بہت پریشان کر دیا ہے لیکن سائنس جو بالآخر اس نتیجہ کی ذمہ دار ہے یہ بھی سکھاتی ہے کہ آبادی کی مناسب روک تھام کے کیا طریقے ہیں اور زمین کے علاوہ سمندر اور ہواؤں سے بھی خوراک کے بے اندازہ ذخیرے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا سائنس کی پیدا کی ہوئی "بیماریوں" کا علاج سائنس کی کمی نہیں بلکہ اس کا بہتر اور بیشتر استعمال ہے۔ اس کے ذریعہ ہمیں نہ صرف مادی کارکردگی کا معیار بلند کرنا ہے بلکہ انسانی ذہن کو، اس کی جہالت اور وہم پرستی اور خوفوں سے نجات دلا کر زندگی کے جدید معرکوں کے لئے مسلح کرنا ہے سائنس کی تمام ترقی کا انحصار اس کی تلاش حق کی ذہنیت پر ہے جو وہم وگمان، روایت پرستی اور ہر قسم کے تعصب کو رد کر کے حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتی ہے۔ یہ ذہنیت اب سائنس کے خاص میدان میں جہاں قوانین قدرت کا مطالعہ اور مادی اشیاء کی ساخت کی کھوج کی جاتی ہے، بڑی حد تک عام ہو گئی

ہے لیکن ہمارے عام انداز فکر پر ابھی اس کا کافی اثر نہیں پڑا اور سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسئلوں میں ابھی تک ہم بے معنی بلکہ خطرناک تعصبوں اور غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ لہٰذا ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ سائنس کا انداز فکر ہماری زندگی کے ان تمام پہلوؤں میں راہ پائے جہاں اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ دوسرے مادی ترقی اور اخلاقی افلاس کی یک جائی کی وجہ سے جو خطرے پیدا ہوں ان کا مقابلہ کرنا ہے انسانی دماغ نے غیر معمولی ترقی کر کے انسان کو اپنے مقصدوں کو حاصل کرنے کے حیرت انگیز طریقے سمجھائے ہیں اور اب کونسا "معجزہ" ہے جو اس کی دسترس سے باہر ہے؟ آج صبح ہی ان سطروں کے لکھنے سے ذرا پہلے میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ روس نے تاریخ عالم میں پہلی بار ایک شخص کو بیرونی فضا میں "طواف ثابت وسیار" کے لئے کامیابی کے ساتھ بھیجا اور سلامتی کے ساتھ واپس بلایا۔ یہ بالکل ہی نئی دنیا کی تسخیر کا پہلا قدم ہے:

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست　　کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است!

لیکن اس طاقت کے اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاقی شعور میں شایانِ شان ترقی نہیں ہوئی۔ اس لئے اچھے مقصدوں کا تعین اور ان کی جستجو اور خدمت کا ولولہ، جو اس اخلاقی شعور کی برکت ہے ابھی تک ہمارے دل اور دماغ کا جزو نہیں بنا۔ قوت کی زیادتی اور نظر کی کمی، علم کی جولانی اور عشق کی سرد بازاری کی وجہ سے دورِ جدید کا سب سے اہم اور کٹھن مسئلہ یہ ہے کہ اس فصل کو کس طرح دور کیا جائے اور ان کے درمیان کس طرح ایک پل بنایا جائے تاکہ سائنس اور قوت انسان کے لئے زحمت نہیں، رحمت بن سکیں۔ مغرب اور مشرق اور خود ہمارے ملک کے مستقبل کا دارومدار اس گتھی کو معقولیت کے ساتھ سلجھانے پر ہے تاکہ دل اور دماغ دونوں مل جل کر انسانیت کے فروغ کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ پنڈت نہرو نے اپنے "آزاد لکچرز" میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"کیا ہم دماغ اور روح کی اس ترقی کے ساتھ سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی کو جمع کر سکتے ہیں؟ ہم سائنس سے منہ نہیں موڑ سکتے کیونکہ یہ زندگی کی ایک بنیادی حقیقت کو ہمارے

سامنے لاتی ہے۔ لیکن اپنے ان اصولوں کو بھی جو صدیوں سے ہماری زندگی کا حصہ ہیں، کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں صنعتی ترقی کے راستے پر اپنی تمام طاقت کے ساتھ چلنا چاہیئے لیکن یہ یاد رہے کہ دنیا کی تمام دولت، رواداری، رحم اور عقلمندی کے بغیر راکھ کا ڈھیر ہے اور "مبارک ہیں صرف، وہ لوگ جو امن کا پرچار کرتے ہیں"!

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم زندگی کے مادی اور روحانی تقاضوں کے باہمی رشتے کو سمجھیں اور ان میں باہمی تضاد کا جو غلط مفروضہ ہزاروں برس سے چلا آتا ہے اس کو تنقیدی نظر سے دیکھیں۔ بہت سے قدیم مفکروں اور معلمین اخلاق نے یہ تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی کہ دنیا کی دھن دولت اور قوت اور اس کی مادی ترقی کے لئے جدوجہد ایک نیک اور شریف آدمی کے شایان شان نہیں (جس کی تفسیر بہت سے ہوشیار دنیادار لوگوں نے اس طرح کی کہ یہ مادی وسائل کی فراوانی "دوسروں" کے لیے حقیر اور غیر ضروری ہیں اور اگر دوسرے ان سے محروم ہوں تو اس محرومی کو ہمت اور صبر کے ساتھ گوارا کر لینا چاہیئے!) اس کا فرض تو یہ ہے کہ وہ گیان دھیان، ریاضت اور عبادت میں مصروف رہے۔ اس تعلیم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں نے بیماری جہالت، افلاس وغیرہ کو نظام کائنات کا ایک لازمی جزو سمجھ کر قبول اور ان کو دور کرنا غیر ضروری یا ناممکن خیال کر لیا۔ لیکن یہ توقع کہاں تک جائز یا قرین قیاس ہے کہ جس شخص کو دو وقت پیٹ بھر روٹی بھی میسر نہیں وہ علم اور اخلاق کے اعلیٰ مسئلوں یا فنون لطیفہ کے شاہکاروں میں دلچسپی لے سکے گا میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ بعض رشی منی، مہاتما، ولی، پیغمبر ایسے ہوئے ہیں، جنھوں نے دنیا کی مادی دولت اور عیش و آرام کو ٹھوکر مار کر اعلیٰ اقدار کی تلاش اور خدمت میں تسکین حاصل کی ہے لیکن یہاں تو سوال عام لوگوں کا ہے جن میں تہذیب کی قدروں کی سچی لگن پیدا کرنے سے پہلے تمدن کی مادی بنیادوں کو درست کرنا ضروری ہے۔

مستقبل کا جو سماج ہم تعمیر کرنا چاہتے ہیں اس کی تصویر ہمارے ذہن اور ہمارے دستور میں ایک جمہوری سماج کی ہے جس میں تمام افراد کو ترقی کے یکساں موقعے حاصل ہوں اور خود ترقی

کے تصور کی ایک ایسی ہمہ گیر تعبیر کی جائے جس میں مادی خوش حالی، ذہنی تخلیق اور سماجی انصاف کے لئے جگہ ہو، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر اختصار کے ساتھ جمہوریت کے اہم تقاضوں کو واضح کر دیا جائے۔

ہماری آزادی کی یاترا کی ایک منزل ۱۹۴۷ء میں تمام ہوئی اور اس کے بعد ایک دوسری اور میرے خیال میں زیادہ اہم منزل شروع ہوئی جس کا مقصد ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کیلئے ایک بہتر زندگی اور بہتر سماج کی عمارت بنانا ہے۔ یہ منزل پہلی منزل سے زیادہ اہم بھی ہے اور زیادہ کٹھن بھی۔ اہم اس لئے کہ سیاسی آزادی تو ایک ذریعہ ہے اس حسین سماجی خواب کی تعبیر کا جس کو ہمارے بہترین نیتاؤں، خصوصاً گاندھی جی نے دیکھا تھا۔ وہ بجائے خود کافی نہیں جب تک اس کی بوتل میں زندگی کے ایک بہتر اور مکمل تصور کی شراب چھلکتی نظر نہ آئے۔ اس تصور میں سماجی آزادی، اقتصادی آزادی اور آزادی فکر سبھی شامل ہیں۔ یہ بڑے بڑے لفظ ہیں جو ہم تحریر و تقریر میں اثر اور زور پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ سیدھے سادھے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بہتر سماج کے قیام کے لئے ایک تو آپس کے بھید بھاؤ اور چھوت چھات کو دور کرنا اور ان دیواروں کو گرانا ضروری ہے جو اندھے تعصب کی وجہ سے مختلف جماعتوں اور گروہوں کے درمیان کھڑی ہو گئی ہیں۔ دوسرے دولت کی تقسیم اس طرح کرنی چاہیئے کہ سب لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور کوئی ایک گروہ دوسروں کی حق تلفی نہ کر سکے، عزت کی کسوٹی مفید کام ہو اور ہر شخص کو اپنے پسینے کی کمائی سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملے حضرت عیسٰی کا یہ قول ایک ابدی حقیقت کا حامل ہے کہ "جو محنت نہیں کرے گا اس کو روٹی نہیں ملے گی"۔ تیسرے انسانی تہذیب کا قیمتی ورثہ جس میں ادب، آرٹ، موسیقی، فکر، فلسفہ، تعلیم وغیرہ شامل ہیں کسی مخصوص طبقے کی اجارہ داری نہ بن جائے بلکہ اپنی بساط کے موافق سب اس میں شریک ہوں۔ ان حالات کا پیدا کرنا اور تینتالیس کروڑ سے زیادہ بندگان خدا کو ایک ایسی زندگی میں حصہ دار بنانا سیاسی آزادی حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ ان کے بغیر سیاسی آزادی محض رائے شماری کا ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ منزل زیادہ کٹھن اس وجہ سے ہے کہ اس میں بڑے صبر اور محنت اور

دل سوزی کے ساتھ کام کرنے اور ان کمزوریوں اور خود غرضیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے جو قومی ایکتا اور سماجی انصاف کے راستے میں حائل ہیں۔ اب ہماری یاترا اس منزل مقصود کی طرف ہے!

ایسے جمہوری نظام کا حقیقی جواز یہ ہے کہ اس میں تمام افراد کو اپنی قدرتی صلاحیتوں کی تربیت کا مقابلتہً زیادہ موقع مل سکتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک فسطائی یا کلیتی (Totalitarian) نظام کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ آپس کے فرقوں کو دور کرکے (خواہ وہ طریقہ زندگی کے ہوں یا رائے کے یا عمل کے)، تمام لوگوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالا جائے اور کم سے کم بنیادی مسائل میں ان کے فکر و نظر پر اندھیریاں لگا دی جائیں۔ یہ آزادی فکر انسان کا سب سے بڑا شرف ہے جس کے ظلّ ہمایونی میں اس کی روح اور تخلیقی قوتیں اپنے کمال کو پہنچتی ہیں۔ اس پر نامناسب پابندیاں لگانا فرد اور جماعت دونوں کی خودداری کو مجروح کرنا ہے۔

پس جمہوریت کے دو بنیادی ستون ہوئے، ایک آزادی فکر و عمل، بشرطیکہ اس کے ساتھ ساتھ سماجی ذمہ داریوں کا صحیح احساس بھی ہو اور وہ بے راہ روی کی صورت اختیار کرکے قومی وحدت کے ٹکڑے نہ کر دے۔ آج کل اپنے دیس میں ہم اس بھیانک خطرے سے دوچار ہیں۔ (میں نے اس کتاب میں کہیں اور اس مسئلے سے بحث کی ہے)۔ اس کا دوسرا ستون سماجی انصاف ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کی جو اچھی چیزیں ہیں خواہ وہ مادی ہوں یا ذہنی، اخلاقی ہوں یا جمالی ان میں سب لوگ شریک ہو سکیں اور رنگ و نسل، ذات پات، مذہب، سکونت کی بنا پر کوئی شخص اپنے جائز حق سے محروم نہ کیا جائے۔ ہمارے دستور میں ان بنیادی اصولوں کو بہت کھول کر بیان کیا گیا ہے اور گزشتہ دس سال میں بہت سی کوششیں کی گئی ہیں کہ ان کو خیال اور خواہش کی دنیا سے عمل کی دنیا میں لایا جاتے لیکن ابھی تک دلوں میں صفائی اور جماعتوں میں یک جہتی کا احساس پیدا نہیں ہوا اور پھوٹ کی زہریلی تحریکیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ دراصل جیسا کسی نے کہا ہے کہ لوگوں کی اصلاح صرف قانون کے ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ اس کا اصلی طریقہ ان کو زیادہ "مہذب" بنانا ہے جو تعلیم کا منصب ہے۔

ہمارے ہاں جمہوریت کو قائم ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں اور ہر بڑے اور نئے کام کو انجام دینے میں شروع میں بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں اور کوشش کے نتیجے آسانی سے نظر بھی نہیں آتے۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس آزادی اور جمہوریت سے تو وہ غلامی کا زمانہ بہتر تھا جب چیزیں سستی مل جاتی تھیں اور غلام ذہنیت کے خوشامدی لوگ آسانی سے نوکریاں اور خطاب حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تھوڑے سے عرصہ میں بھی ہماری پوزیشن میں خاصا فرق آیا ہے۔ ہمارے بہت سے بھائی بند اور ہم وطن جو صدیوں سے اپنے بنیادی حقوق سے محروم تھے اب کم سے کم قانون کی رو سے دوسروں کی طرح آزاد اور ان کے برابر ہیں۔ تعلیم کو پھیلانے کی زیادہ منظم کوشش جاری ہے تاکہ ہمارے کروڑوں بچوں کی صلاحیتیں فروغ پا سکیں اور وہ بڑے ہو کر انہیں قوم کی سیوا کے لئے استعمال کر سکیں۔ ہمارے گاؤں کی پس ماندہ آبادی کو بھی سائنس تعلیم اور تہذیب کی دولت میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ ملنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے پانچ سالہ منصوبوں کے ذریعے ملک کی دولت کو بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ لوگ غریبی، جہالت اور بیماری کے چکر سے نکل سکیں۔ دولت آفرینی کے ساتھ ساتھ اس کی بہتر تقسیم کے لئے بھی بعض تدبیریں اختیار کی گئی ہیں اور نئے قوانین بنائے گئے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا پورا یقین نہیں کہ اس پہلو پر ابھی تک کافی زور دیا گیا ہے۔ ایک سچے جمہوری نظام میں کسی کو نہ بے کمائی دولت جمع کرنے یا لٹانے کی اور دوسروں کی حق تلفی کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے نہ سماجی ذمہ داریوں سے آزادی مل سکتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں سماجی عدل اور مساوات کے تقاضے کے خلاف ہیں۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ پہلے قوم کو محض دولت بڑھانے کی فکر کرنی چاہئے، اس کے بعد بہتر تقسیم کی طرف توجہ کی جا سکتی ہے۔ یہ راستہ خطرناک ہے اور جن قوموں نے اس کو اختیار کیا ہے انہوں نے اس کا خمیازہ بھگتا ہے۔ ہم بھی اس پر چل کر ایک بہتر سماج اور بہتر زندگی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس عرصے میں ہم نے بین الاقوامی معاملات میں ایک ایسی پالیسی اختیار کی ہے جس کی وجہ سے ہماری آواز جو امن اور شانتی اور رواداری کی آواز ہے، توجہ کے

ساتھ سنی جانے لگی ہے اور ہم ایک حد تک دوسرے ملکوں کے سامنے سر بلند کر کے چل سکتے ہیں اس لئے بحیثیت مجموعی، جہاں تک قومی تعمیر کے اصولوں کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ عمل میں جو مشکلیں ہیں اور بے راہ روی کی گنجائش وہ ایک لمبی اور مختلف داستان ہے جس کے صرف ایک پہلو کی طرف یہاں اشارہ کرنا کافی ہے۔

آزادی اور جمہوریت کوئی بخشش یا باپ دادا کا چھوڑا ہوا سرمایہ نہیں جس کے سود پر قوم اپنا گذارہ کر سکتی ہے۔ اس کو قائم رکھنے کے لئے کڑی شرطیں ہیں اور ہر نسل کو از سر نو اس کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اور وہ ہے ذہنی بیداری، دل کی فراخی، سچائی اور انصاف کی سیوا، ضبط نفس اور ان تاریک قوتوں کے خلاف مسلسل جنگ جو آزادی کے حسین قلعہ کو مسمار کر کے اس کی بجائے خود غرضی، ظلم اور تصرف کی بنیادوں پر قومی زندگی کی عمارت کھڑا کرنا چاہتی ہیں۔ ابھی تک ایسی طاقتیں ہمارے قومی جسم کے اندر کام کر رہی ہیں۔ مجھے ان کی قوت اور خطروں کا پورا احساس ہے۔ ملک میں رجعت پرستی اور ترقی پسندی کے درمیان پوشیدہ اور کھلم کھلا جنگ جاری ہے جس کی شدت کچھ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ دراصل صالح قدروں کی اشاعت پہاڑ کی چڑھائی ہے اور فاسد قدروں کا پرچار پہاڑ کا اتار۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو گھٹیا مقصدوں کے محاذ پر آسانی سے جمع کیا جا سکتا ہے اور ذات پات نسل رنگ مذہب کے تعصب کا واسطہ دے کر اُن کی حمایت حاصل کی جا سکتی ہے جمہوریت چاہتی ہے کہ لوگوں کے بنیادی مقصدوں اور قدروں میں یک جہتی ہو اور اپنے مشترک اعلیٰ مقاصد کی خاطر ہم اپنی چھوٹی غرضوں کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن جو لوگ سستی اور اوچھی ہر دل عزیزی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا نامبارک طریقوں سے قوت کی تلاش کرتے ہیں۔ کبھی صوبائی جھگڑے کھڑے کرتے ہیں کبھی زبان کے فساد اٹھاتے ہیں۔ کبھی ذات پات کی بنا پر انتخاب کی مہم چلانا چاہتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں سرے سے جمہوریت کی روح کے منافی ہیں اور جب تک تعلیم اور رائے عامہ اور جمہوریت کے تمام حامی ان کی مخالفت نہ کریں گے جمہوریت کی جڑیں کسی طرح اس ملک میں مستحکم نہیں ہو سکتیں۔

دراصل ہر منصوبے کی کامیابی، ہر اچھے خیال اور اصول کی جیت کا انحصار آخر میں افراد کی سیرت اور ان کی شرافت نفس پر ہوتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں تمام بڑے بڑے منصوبے اور مستقبل کے خواب تعلیم کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ مقصد کتنا ہی اعلیٰ ہو۔ اگر ذریعہ گھٹیا ہے، اگر کارکن بددیانت ہیں تو اس کو حاصل کرنا یا تو سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتا یا دوران تحصیل میں وہ آلودہ ہو جاتا ہے۔ قومی زندگی میں جن مقصدوں کو ہم نے مشعل راہ بنایا ہے ان کو حاصل کرنے کا ذریعہ افراد ہیں اور جب تک ان میں صحیح دل اور دماغ پیدا نہ ہو جو تعلیم کا کام ہے ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واضح سی حقیقت ابھی تک ہماری قوم اور حکومت اور منصوبہ بنانے والوں کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آئی یا اگر سمجھ میں آئی تو محض نظری طور پر ان کے عمل اور پالیسی کا جزو نہیں بنی۔ اس وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ آئے دن ہمیں نت نئی مشکلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور افراد کی خودغرضی، تنگ نظری، تعصب، اقرباپروری، کمال کی بےقدری، بےکمالی کے ساتھ رواداری، ذات پات کی پاسداری کی خاطر قومی مفاد کی قربانی، ہماری کامیابی میں ہمالہ کی سی مضبوطی کے ساتھ سدراہ ہیں۔ اس لئے اصل سوال کیرکٹر کی صحیح تشکیل اور اچھی اور بری قدروں کی پرکھ کا ہے۔ کسی شخص نے کہا تھا ہم جس نازک دور سے گذر رہے ہیں وہ "قیامت خرد" کی وجہ سے نہیں بلکہ "قیامت سیرت" کا نتیجہ ہے۔ ہمارا علم پہلے سے بہت زیادہ ہے تعلیم مقابلتہً زیادہ عام ہوتی جاتی ہے۔ طلبہ اور معلموں کی ذہانت میں کوئی خاص فتور پیدا نہیں ہوا۔ لیکن نیک و بد، خیر و شر، برتر اور کم تر کی پرکھ یعنی قدروں کے اندازے درہم برہم ہو گئے ہیں۔ شاید تبدیلی کے دور میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن اب جب کہ ہم سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک حد تک اپنی تقدیر کے مالک اور خالق بن گئے ہیں ہمارے لئے سختی کے ساتھ احتساب نفس اور قومی سیرت کی شیرازہ بندی کرنا لازم ہو گیا ہے۔ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں

اکثر اہل کمال اور صاحبان اصول کے مقابلے میں اُن مصلحت پرستوں اور مطلب نوازوں کی قدر کی جاتی تھی جو حکومت کے اغراض کے لئے مفید آلہ کار ثابت ہوتے تھے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس ذہنیت میں ابھی تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ اب بھی بالعموم قدر "کامیاب" لوگوں کی ہے، ملک معنی کے خادموں اور مالکوں کی نہیں۔ اثر اور رسوخ اور عزت کی کسوٹی یہ نہیں کہ کون شخص سماج کو کس قدر فائدہ پہنچاتا ہے یا پہنچا سکتا ہے بلکہ وہ کس قدر نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے گاؤں کے معلم کو اکثر سماج میں وہ مقام حاصل نہیں جو مثلاً پولیس مین یا پٹواری کو جو ناجائز فائدہ بھی پہنچا سکتا ہے اور ناجائز نقصان بھی۔ سرکاری ملازمت اب تک اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کی نظر میں معراج زندگی ہے اور ہمارے بہترین طلبہ اور ذہین نوجوان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرف رُخ نہیں کرتے بلکہ دفتروں اور ملازمتوں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ اب بھی لوگوں کی شناخت ان کے نام یا ذہنی کارناموں یا سیرت کی بلندی سے نہیں ہوتی بلکہ ان کے منصب یا عہدوں سے ہوتی ہے۔ کسی امریکن سیاح نے حال ہی میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جس حد تک "یہ منصب پرستی" اس نے ہندوستان میں دیکھی اتنی شاید کسی دوسرے ملک میں نہیں دیکھی اور منصب سے مراد منصب علم و فضیلت نہیں بلکہ منصب حکومت ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بیان کس حد تک صحیح ہے اور در اصل ہندوستان میں یہ ذہنیت دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اس قدر زیادہ نمایاں ہے یا نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم اخباروں کے عنوانات پڑھیں یا تصویریں دیکھیں یا ریڈیو کی خبریں سنیں تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں (چوری، فساد، ڈاکہ، قتل، اغوا وغیرہ کو چھوڑ) جس قدر قابل ذکر باتیں ہوتی ہیں ان میں سے نوے فیصدی کا تعلق وزیروں یا سرکاری حکام سے ہے جب آرٹ، سائنس، فلسفہ، تاریخ، تعلیم و تہذیب وغیرہ کا ذکر بھی آتا ہے تو عام طور پر اس شکل میں کہ فلاں وزیر یا سکرٹیری یا کمشنر یا ڈائرکٹر نے اس قسم کی تحصیل حاصل تقریر کی۔ یہ ذہنیت ہر منزل پر پائی جاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی کو ٹیلیفون کریں اور وہ آپ کا ذاتی دوست نہ ہو تو یہ نہ پوچھے گا کہ آپ کون ہیں بلکہ کس دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اگر آپ محض سی۔ وی۔ رامن یا آر۔ کے۔ نراین یا

غلام یزدانی ہیں تو اس کے نزدیک آپ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ہاں اگر آپ مخاطب کو یہ بتا سکیں کہ میں فلاں دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہوں یا فلاں افسر کا پرسنل اسسٹنٹ ہوں تو اس کی تشفی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے انداز سخن کا آتار چڑھاؤ بڑی حد اس بات پر منحصر ہوگا کہ آپ کتنے بڑے افسر یا کس افسر کا ضمیمہ ہیں! ناواقفیت تو بہت سی کوتاہیوں کا عذر بن جاتی ہے اور مجھے ان لوگوں سے خاص شکایت نہیں جو اپنی بدقسمتی یا بدتوفیقی سے، مثلاً سر سی۔ وی۔ رامن کے نام اور کام ہی سے ناواقف ہیں لیکن اس کی کیا معذرت ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار کی نظر میں بھی ایک سکول کے معلم یا ہیڈ ماسٹر بلکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تک کی وہ عزت نہیں جو معمولی انتظامی عہدہ داروں کی ہے اور اس کی وجہ سے رستم بالائے ستم!) خود ان کی نظر میں بھی اپنی عزت اور خودداری کی سربلندی نہیں رہی "آپ کون ہیں؟" "جی، میں تو صرف سکول ٹیچر ہوں۔" 'صرف ایک سکول ٹیچر' 'صرف'، کیوں؟ جس شخص کے سپرد نژادِ نو کے دل و دماغ کی تربیت کی گئی ہے جس کا کام ہے بچوں کے دماغ میں روشنی، دل میں گداز اور اچھی قدروں کی لگن پیدا کرنا وہ 'صرف' ایک ٹیچر ہے جو اپنا نام معذرت کے ساتھ لیتا اور کام انکسار کے ساتھ بتاتا ہے۔ مجھے ایک ایسی ریاست کا علم ہے جہاں کی یونیورسٹیاں اور ان کے وائس چانسلر، وہاں کے حاکم اعلیٰ کے تابع فرمان تھے اور ان کارفرمایان تعلیم نے جن کے ہاتھ میں نوجوانوں کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست اور بالواسطہ اعلیٰ ترین اقدار کا تحفظ اور ان کی تنقید تھی، اپنی ذمہ داریوں اور ذہنی دیانت کے تقاضوں کو بغیر کسی خاص احتجاج کے دوسروں کے سپرد کر دیا تھا۔ ہمیں اپنی علم دوستی اور علم پرستی کی روایت پر ہمیشہ ناز رہا ہے اور ہم نے علم کو بحیثیت ایک قدر کے دولت اور قوت سے کہیں اعلیٰ سمجھا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ عمل کے میدان میں ہمارا شیوہ بالکل مختلف ہے اور ہم نے شاعر کے اس تیزابی طنز کو خاطر نشان نہیں کیا۔

گوہرے را کہ تو با اہرمناں باختۂ ہم بہ جبریل امینے نتواں کرد گرو!

اس ذہنیت کی تہ میں بھی وہی قدروں کی غلط پرکھ، دولت اور حکومت کی خاطرداری، خودناشناسی

اور خودی کی کمزوری پوشیدہ ہے جو قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں یہ کمزوری خاص طور پر قابل افسوس اور خطرناک ہے کیونکہ اگر ہماری تعلیم گاہیں اور معلم ہی قدروں کے امین اور محافظ نہ بنیں گے تو یہ فرض کون ادا کرے گا۔ یعنی اگر نمک ہی اپنی نمکینی کھو بیٹھے تو پھر کس طرح اس میں نمکینی پیدا ہو گی!

لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود میں ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں کیونکہ ہماری قوم میں بہت سی شرافت کی چنگاریاں ہیں جو ابھی تک راکھ کے اندر پوشیدہ ہیں، بہت سی بجلیاں ہیں جو بادلوں میں آسودہ ہیں۔ ضرورت راکھ کو کریدنے، بادلوں کو ٹٹولنے کی ہے۔ میں نے اوپر بتایا ہے کہ ابھی تک ہم پر سرمایہ داری کی گرفت ناقابل علاج حد تک مضبوط نہیں ہوئی۔ ابھی تک ہم میں قومیت کے جذبے نے خطرناک شکل اختیار نہیں کی اور ہم میں دوسری قوموں (خصوصاً مظلوم قوموں) کے ساتھ جو اپنی آزادی اور انسانی حقوق کے ساتھ جدوجہد کر رہی ہیں۔ ہمدردی کا جذبہ مقابلتہً زیادہ عام ہے اور ہماری بین الاقوامی پالیسی میں ٹیگور اور گاندھی، نہرو اور آزاد کی ذہنی اور اخلاقی میراث کا پرتو ہے۔ ہم کسی دوسرے ملک یا قوم پر قبضہ کرنا یا اس کی دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے۔ ہماری زندگی کے فلسفے، ہمارے مذہبوں کی تعلیم، ہمارے بہترین لیڈروں کی ذہنیت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس زبردست سماجی اور اخلاقی انقلاب کے راستے میں سختی کے ساتھ حائل ہو۔ اس انقلاب کے لئے کوشش کرنا، اس کے راستے کی رکاوٹوں کو صبر اور محبت، سمجھداری اور جرأت کے ساتھ دور کرنا ہر ہندوستانی کا فرض اور اس کے لئے سعادت ہے۔

اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو ایک ایسا سماج قائم کر سکیں گے جس کا خواب مختلف شکلوں میں مہاتما بدھ سے لے کر حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ اور افلاطون سے لے کر کارل مارکس تک بے شمار انسانوں نے بہ قدر ظرف دیکھا ہے . . . . نہیں، میں ہندوستان کے مستقبل کی طرف سے ہرگز مایوس نہیں ہوں۔ اس بارے میں میرے عقیدے کی ترجمانی اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے اور میں اس انقلاب

کے لئے چشم براہ ہوں جس کی انہوں نے پیشین گوئی کی ہے :

من دریں خاک کہن گوہر جاں می بینم — چشمِ ہر ذرّہ چو انجم نگراں می بینم!
دانۂ را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز — شاخ در شاخ و تنومند و جواں می بینم!
کوہ را مثل پر کاہ سبک می یابم — پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم!
انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیرِ افلاک — بینیم و ہیچ نہ دانم کہ چساں می بینم!

○

قوموں کی تقدیر

اگر ہم تاریخ کی ورق گردانی کریں تو بار بار یہ تماشا نظر آتا ہے کہ قومیں پیدا ہوتی ہیں، عروج حاصل کرتی ہیں۔ تمدن کے سرمائے میں کچھ اضافہ کرتی ہیں، پھر رفتہ رفتہ ان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں صرف ان کا افسانہ عبرت تاریخ کے صفحوں میں محفوظ رہ جاتا ہے کیا یہ بھی انسان کے مرنے جینے اور سورج کے نکلنے ڈوبنے کی طرح ایک اٹل اور ناگزیر فطری حادثہ ہے جس میں انسان کے دست قدرت کو کوئی دخل نہیں۔ یا اس میں کسی سماجی اور اخلاقی قانون کی کارفرمائی ہے۔ میرے خیال میں قوموں کے عروج و زوال کو کسی بیرونی طاقت کا تابع قرار دینا نا فہمی کا ثبوت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قومیں خود اپنے عمل سے اپنا حال اور مستقبل بناتی ہیں اور اپنی ہی بداعمالیوں سے تباہ ہوتی ہیں۔ قدرت کا قانون تو انصاف پر مبنی ہے۔ وہ نہ کسی قوم پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی بے جا ناز برداری۔ قرآن شریف کے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے" خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی اندرونی صلاحیتوں کو تبدیل نہ کرے۔" حالی نے اس نکتہ کو اپنی مسدس میں یوں بیان کیا ہے۔

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت — شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے
دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت — سچ ہے کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہے

لہٰذا مسئلے کی یہ صورت بن جاتی ہے کہ قوموں کے لئے نیک عملی اور بدعملی کے معیار

کیا ہیں؟ کون سے اسباب ہیں جو ان کی زندگی میں قوت اور حُسن پیدا کرتے ہیں، اور کون سے کمزوری بداخلاقی اور زوال کی طرف لے جاتے ہیں؟ قدرت نے افراد اور جماعتوں کو مختلف قسم کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی قوتیں اور مادی وسائل عطا کئے ہیں اور کامیابی کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ ان کو ضائع نہ کریں بلکہ ایک قیمتی امانت سمجھ کران سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ مذہب کی اصطلاح میں کسی نعمت کے مناسب استعمال کو "شکر" کہتے ہیں۔ جو قومیں شکر کا فرض ادا کرتی ہیں اور اپنی دولت، علم اور وقت کو کفایت اور معقولیت کے ساتھ استعمال کرتی ہیں ان کی قوتیں فروغ پاتی ہیں اور دنیا میں کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے جو قومیں ان نعمتوں کا غلط استعمال کرتی ہیں ان کی قوتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہی مکافاتِ عمل یا جزا اور سزا کا قانون ہے "اگر تم شکر کروگے تو تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ لیکن کفرانِ نعمت کروگے تو میرا عذاب بھی سخت ہے"۔ مگر یہ عذاب خدا کی طرف سے براہِ راست نازل نہیں ہوتا۔ قوانینِ قدرت کا نتیجہ ہوتا ہے جو آتش فشاں پہاڑ کی طرح چپ چاپ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ قومیں جو بظاہر خوش حال اور طاقت ور معلوم ہوتی ہیں، دفعتاً قانون کی زبردست پکڑ میں آکر خاک میں مل جاتی ہیں۔ اس تعزیر میں دیر لگ سکتی ہے مگر اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ جوں جوں کسی قوم میں جدوجہد، فکر و عمل اور سعی و طلب کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ اس کے عبرتناک انجام کا سایہ بڑھنا اور پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوم میں حیاتِ صالح کی بنیاد ڈالنے کے لئے کیا شرائط ضروری ہیں۔ میرے خیال میں قومی ترقی کے لئے سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ قومی زندگی کی بنیاد سماجی انصاف کے اصولوں پر رکھی جائے۔ اس بنیادی صفت کے بغیر اور تمام کمالات بے کار ہیں یا بے کار ہو جاتے ہیں۔ جس سماج میں انصاف نہیں ہوتا وہاں تلوار اور قلم، ادب اور آرٹ، دولت اور تجارت، قوت اور حکومت سب کو کوئی چیز اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایک روز یہ ساری عمارت نیچے آپڑتی ہے۔ قدیم یونانیوں کی تہذیب جس میں علم اور آرٹ کی ہم آہنگی نے ایک خاص شان دلفریبی پیدا کر دی تھی اور قدیم رومی تہذیب جو اپنی وسیع

مملکت تدبر اور سیاسی قوت پر نازاں تھی کیوں تباہ ہوئیں؟ اس لئے کہ ان میں تمام انسانوں کا بحیثیت انسان کے احترام نہ تھا اور ان کی دیدہ زیب سطح کے نیچے بے شمار ایسے غریبوں اور مظلوموں کی تاریک زندگیاں دبی ہوئی تھیں جو تہذیب کی روشنی اور عام انسانی حقوق دونوں سے سراسر محروم تھے۔ مگر مثالوں کے لئے ماضی میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آج بھی مغربی تہذیب کی ناکامی کا عبرت انگیز نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے، وہاں ایک طرف سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی اور انسانی دماغ کی خلاقی نے انسان کی کام کرنے اور دولت پیدا کرنے کی صلاحیت کو سینکڑوں گنا بڑھا دیا ہے اور دوسری طرف سرمایہ داری کے مظالم اور انسان دشمنی کی بدولت بڑے بڑے گروہ بلکہ ملک کے ملک، مفلسی، جہالت اور بے کاری میں گرفتار ہیں۔ انسان کے پاس آج ایسے علمی اور مادی وسائل موجود ہیں جن کی مدد سے وہ غربت اور بے کاری کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ بیماریوں کا انسداد کر سکتا ہے۔ لوگوں کے لئے رہنے کو مکان، پہننے کو کپڑا، پڑھنے کو کتابیں مہیا کر سکتا ہے لیکن چونکہ سماجی رشتوں میں انصاف کی کارفرمائی نہیں اس لئے سائنس کی ترقی بڑی حد تک بے کار اور خوش حالی اور امن و امان مفقود ہیں۔ اسی صنعت و حرفت کی ترقی اور نقل و حرکت کی آسانی اور تیزی کی وجہ سے قوموں میں باہمی وابستگی اور انحصار کلّی کا ایک نیا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ ان حالات میں دولت اور دوسرے مادّی اور تہذیبی وسائل کی مناسب تقسیم نہ صرف انصاف اور اخلاق کی رو سے ضروری ہو جاتی ہے بلکہ عملاً بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب قوم کے تمام افراد میں ایکا ہو اور ان میں سے ہر ایک جماعت کی عزت میں اپنی عزت اور جماعت کی ذلت میں اپنی ذلّت سمجھے اور نفسی نفسی کے بجائے انصاف کے اصول پر عمل کرے۔ ورنہ خود غرضی، تعصب اور نفاق کا دور دورہ ہو جاتا ہے جو زوال کا یقینی پیش خیمہ ہے۔

قومی ترقی کے لئے دوسری اہم شرط محنت، جفاکشی اور کسب حلال کی عادت ہے۔ افراد کی طرح جماعتوں کی صحت کے واسطے بھی حرکت اور جد و جہد ضروری ہے۔ جب کوئی قوم عمل اور جد و جہد کی زندگی سے جی چرانے لگتی ہے اور اس کے افراد عیش و عشرت یا گوشہ نشینی کو ترجیح

دیتے ہیں تو اس کی قوتیں معطل ہو جاتی ہیں اور جسمانی اور ذہنی کاہلی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ لوگ کام کو عار سمجھنے لگتے ہیں اور محنت کر کے روزی کمانے کی بجائے پیری، مریدی، درویشی اور مجاوری کے پھیر میں پڑ جاتے ہیں یا رئیسوں کی مصاحبت اور درباداری اور خوشامد کے ذلیل پیشے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح "مقدس گداگروں" کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو کوئی عملی یا تخلیقی کام کام کرنے کے بجائے مختلف بہانوں سے خدا کے نام پر دوسروں کی کمائی بٹورتے ہیں۔ ان میں سوال کی عادت پیدا ہو جاتی ہے جو خودی اور خودداری کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ اس ناکردہ کار جماعت میں ان سب کے علاوہ وہ دولت مند طبقہ بھی شامل ہے جو بن کمائی دولت پر عیش کرتا ہے اور کسی شکل میں بھی جماعت کا قرض ادا نہیں کرتا۔ جوں جوں قوم میں ایسے تن آسان اور بے کار افراد کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے زوال کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ اسی لئے انصاف اور دانشمندانہ خودغرضی دونوں کا تقاضا ہے کہ قومی زندگی کی تنظیم میں سب سے مقدم جگہ ان بندگان خدا کو دی جائے جن کی محنت اور جفاکشی پر ہماری تہذیب و تمدن کا انحصار ہے اور گرمیٔ محفل کے لئے نہیں بلکہ درحقیقت سیاست کا اصول یہ ہو کہ جس کھیت سے خود محنت کش دہقان کو روزی میسر نہ ہو اس کے ہر دانۂ گندم کو جلا دیا جائے۔

یونان، مصر اور روم کی قدیم تہذیبیں بڑی شان و شوکت کے ساتھ اٹھیں۔ ان کے زوال کا ایک سبب تو میں اوپر بیان کر چکا ہوں یعنی سماجی رشتوں میں انصاف کی کمی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ کچھ مدت تک قوت اور شوکت کی زندگی بسر کرنے کے بعد یہ قومیں کاہلی، عیش و عشرت اور بے کاری میں پڑ گئیں اور سعی و عمل کی گرمی کے بجائے ارباب نشاط کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہو کہ قدرت کے اٹل قانون نے کروٹ لی اور دیکھتے دیکھتے ان کی قوت اور عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ میں نے کچھ عرصہ ہوا برما کے متعلق ایک کتاب پڑھی تھی جس کا نام مجھے بہت پسند آیا تھا A WORLD THAT WORKS (ایک ایسی دنیا جو کام کرتی ہے) دراصل یہ عنوان قوموں کی زندگی اور موت کے لئے ایک کسوٹی ہے جو قومیں کام کریں گی زندہ رہیں گی۔

جو کام سے جی چرائیں گی اور اس کو ایک بار سمجھ کر دوسری جماعتوں یا قوموں پر ڈالنے کی کوشش کریں گی وہ فنا ہو جائیں گی اور کم از کم میں ان پر آنسو بہانے کو تیار نہیں ہوں! کام تو زندگی کی قیمت ہے اور جو شخص یا جو جماعت اس قیمت کو ادا کرنے سے گریز کرتی ہے اس کی میرے دل میں اتنی ہی عزت ہے جس قدر کسی چور یا اچکے کی۔

جب انصاف، محنت، سادگی اور کفایت شعاری کی بنیادوں پر قومی زندگی کی عمارت کھڑی ہو جائے تو اس میں قوت، حسن و خوبی اور نظم و ترتیب پیدا کرنے کے لئے افراد قوم میں تین صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جرأت، رواداری اور ڈسپلن۔ جرأت زندگی کی علامت ہے۔ اس کی بدولت قوم میں حوصلہ اور مشکلات کو جھیلنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے برخلاف اس کے خوف جو جرأت کی ضد ہے، زندگی کے پر قینچ کر دیتا ہے۔ دوسری صفت رواداری ہے جس کے بغیر انفرادیت کی تکمیل ناممکن ہے اور قومی زندگی میں تنوع کی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔ خدا کی دنیا میں یکسانیت نہیں اور اختلافات انسانی فطرت کا جزو ہیں۔ اگر کسی قوم میں رواداری کا جذبہ نہ ہو تو یہ اختلافات مخالفت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہر گروہ دوسروں پر زبردستی ایک خاص قسم کی یکسانیت عائد کرنا چاہتا ہے جو ترقی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ڈسپلن اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی کام نظم و ترتیب اور خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا اور افراد اور جماعتوں میں خواہ مخواہ رسہ کشی ہوتی رہتی ہے جس میں ان کی قوت ضائع ہوتی ہے لیکن اصلی ڈسپلن وہ ہے جو کوئی بیرونی طاقت یا کوئی جابر حاکم قوم پر باہر سے عائد نہ کرے بلکہ وہ آزادی کی فضا میں خوش دلی کے ساتھ کام کرنے اور اتحاد مقاصد کا نتیجہ ہو۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ ان سب صفات کی اہمیت تسلیم لیکن ان کی تربیت کیسے کی جائے۔ میرے خیال میں بڑے پیمانے پر قومی اور شخصی کیرکٹر کی تشکیل کے لئے چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جن میں سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی بڑا نصب العین ہو، جس کو بیشتر لوگ خوشی سے مانیں اور جو ان کی تنظیم اور وحدت کے لئے ایک مرکز کا کام دے

اوران کے فکر و عمل پر حاوی ہو جائے۔ جب کبھی کسی قوم نے عروج حاصل کیا ہے ایسے ہی کسی آدرش نے اس کے لئے قوتِ محرکہ کا کام دیا ہے۔ مثلاً پرانے زمانے میں ہندوؤں کے سامنے معرفت حق کا نصب العین تھا یعنی اس ابدی اور ازلی حقیقت تک رسائی کی کوشش جس کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کی حقیقت ایک پرچھائیں سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ بدھ مت نے تہذیب نفس کو اپنا مطمح نظر بنایا تھا۔ قدیم یونانیوں نے اپنی زندگی اور تہذیب میں خیر، حق اور حسن کے تصورات کو سمونے کی کوشش کی تھی۔ رومیوں نے انسانی تمدن کے سرمائے میں قانون، انصاف اور سیاسی امن کے تصورات کا اضافہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے سامنے انسانی وحدت، انصاف، اخوت اور مساوات کا نصب العین رکھا تھا اور تاریخ کے اس تاریک دور میں ایک شمع روشن کی تھی جس کی چھوٹ آج تک ہم پر پڑتی ہے لیکن ان تمام آدرشوں کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ بعض خاص علمی، اخلاقی سماجی یا جمالی قدروں کے حامل ہیں . . . ورنہ محض دولت یا سیاسی طاقت پیدا کر لینا اور اس کے ذریعے دوسری قوموں کو غلام بنا کر خدا کی زمین میں فتنہ و فساد پیدا کرنا عظمت کی دلیل نہیں، حیوانیت کا ثبوت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یونانی سقراط، افلاطون اور ارسطو سے زیادہ سکندر پر فخر کرتے، چنگیز خاں کے وحشی مغل ہمارے احترام کے مستحق ہوتے اور ہٹلر کی جہانگیری کا جنون اور انگریزوں کی عالمگیر سلطنت کا قیام، گوئٹے اور شکسپیر، حافظ اور نیوٹن کے علمی اور ادبی کارناموں سے کہیں زیادہ قابل قدر شمار کیا جاتا!

لیکن محض ایک نصب العین کا تعین کافی نہیں۔ کیونکہ عام لوگوں کے لئے کسی مجرد تصور میں کافی جاذبیت نہیں ہوتی۔ خواہ وہ قوت و شوکت کا ہو یا حسن و جمال کا یا انصاف اور خدمت کا۔ اس تصور کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہے کہ قوم کو ٹھیک وقت پر کوئی ایسا لیڈر میسر آجائے جس کی تمام زندگی اور عمل اس نصب العین کی تفسیر ہو، کیونکہ ایک سچے اور پر خلوص اور بے لوث انسان کی ذات ہی میں وہ کشش ہوتی ہے جو لاکھوں آدمیوں کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔

چڑھتی ہے جب عشق کی سان پہ تیغِ خودی ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ!

اس کے فیضِ صحبت سے رفتہ رفتہ قوم میں ایسے مخلص کارکنوں کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو نیکی اور سچائی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں۔ جاہ و منصب کی رشوت اور دولت و قوت کا لالچ ان کی نیت میں خرابی اور ان کے قدم میں لغزش پیدا نہیں کر سکتے۔ تاریخ عالم میں آج تک کوئی سیاسی یا سماجی یا مذہبی تحریک کامیاب نہیں ہوئی اور نہ کسی قوم کو عروج حاصل ہوا جب تک اس میں کوئی ایثار پیشہ جماعت عوام کی بے غرض خدمت کے لئے کمربستہ نہ ہوئی ہو۔ کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ ایسے ہی لوگوں کی برکت سے زمین اپنے محور پر قائم ہے، لیکن جب کسی قوم میں نیک اور بے نفس خدمت کرنے والوں کی جماعت باقی نہیں رہتی تو ان کا اخلاقی اور مادی زوال شروع ہو جاتا ہے یہاں تک قانونِ قدرت کے مطابق کوئی دوسری قوم ان کی جگہ لے لیتی ہے جس میں جد و جہد، خدمتِ خلق اور شکرانِ نعمت کی بہتر صلاحیت ہوتی ہے۔ فطرت اکثر ایسی قوموں کو لمبی مہلت بھی دیتی ہے لیکن رفتہ رفتہ جب بداعمالیوں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے جزائے عمل کا قانون دفعتہً ان کو پکڑ لیتا ہے جب کہ وہ غفلت میں سرشار ہوتے ہیں "قوموں نے اپنے ہاتھوں سے جو کچھ کمایا تھا آج اس کی پاداش میں خشکی اور تری میں فتنہ و فساد برپا ہو گیا ہے تاکہ لوگ اپنے اعمال کا پھل چکھیں۔ شاید ان کو اس سے عبرت ہو اور وہ راہِ راست کی طرف آجائیں"۔ (قرآن شریف)

ظاہر میں ہمارے زمانے کی موجودہ کشمکش میں قوت کی کشمکش معلوم ہوتی ہے یعنی جس قوم یا جن قوموں کے پاس زیادہ سامانِ جنگ اور دولت اور صنعت و حرفت کے وسائل ہوں گے وہ اس مقابلے میں کامیاب ہوں گی گویا کامیابی کا مطلب محض وسائل کی فراوانی یا جنگ کی کامیابی ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ بیسویں صدی میں ہتھیاروں کی جنگ میں کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس میں تو فاتح اور مفتوح دونوں کی ہار ہے اور دنیا کی تباہی۔ لہٰذا اگر مقابلہ اس محاذ پر ہوا تو ہار جیت کے الفاظ بے معنی ہوں گے لیکن اگر صورتِ حال کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اصلی مقابلہ قدروں کا مقابلہ ہے، اخلاقی اصولوں کا مقابلہ ہے۔ مقابلہ اسی میدان

میں ہے (یا ہونا چاہیئے) کہ کون سا نظام انسانوں کے لئے ایک بہتر اور بھرپور زندگی مہیا کر سکتا ہے جس میں انہیں اپنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع ملے۔ اس نظام کی ترتیب میں دورِ حاضرہ کے جدید تقاضوں سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ دنیا کے حالات بہت تیزی کے ساتھ بدلے ہیں اور بدل رہے ہیں۔ اب لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کے بجائے منصوبہ بندی اور اجتماعیت کا دور دورہ ہے جس کے نقوش سوشلسٹ ملکوں میں بہت واضح اور نمایاں ہیں اور دوسرے ملکوں مین بھی رفتہ رفتہ ابھرتے جاتے ہیں۔ ہم ان مطالبات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تبدیلی اور انقلاب زندگی کی فطرت میں شامل ہیں جس قوم یا جماعت میں انقلاب سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہیں رہتی وہ زندگی کی دوڑ میں مات کھا جاتی ہے اور بازارِ عالم میں اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

یاں نکلے ہیں سودے کو درم لے کے پرانے　　　　اور سکہ رواں ملک میں مدّت سے نیا ہے!

لیکن اجتماعیت بھی بجائے خود ہر مرض کی دوا نہیں۔ اس میں بھی ظلم، حق تلفی، انسان دشمنی اور بے جا تصرف کی گنجائش ہے۔ نسلی غرور تحکم اور ملوکیت اس کو بھی مسخ کر سکتے ہیں۔ انصاف اور آزادی اور امن اس بت کی بھینٹ بھی چڑھائے جا سکتے ہیں۔ اصلی سوال یہ ہے کہ کون سی قوم یا قومیں اس نئے نصب العین کی روشنی میں سائنس اور صنعت و حرفت کی حیرت انگیز طاقتوں کو تمام بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے استعمال کریں گی؟ کیا ہندوستان ایسا کر سکے گا؟ کیا امریکہ میں اس کی صلاحیت ہوگی؟ کیا روس کی سماج سیوا اور سماجی مساوات کی کوشش شہنشاہیت کی لعنت سے محفوظ رہیں گی؟ کون کہہ سکتا ہے؟ وقت ہی اس کا جواب دے گا۔ لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ قوموں اور افراد کی زندگی میں امن اور خوشی صرف اسی صورت میں راہ پا سکتی ہے جب وہ اخلاق اور شرافت کے بنیادی اصولوں کو برتنا سکھیں۔ کوئی دوسری چیز بھی قوت ہو یا دولت یا سائنس، اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے لکھا ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے　　　　شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر!

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کے اقبال کا آغاز جد و جہد اور سعی و طلب سے ہوتا ہے اور اس کا انجام عیش و عشرت پر۔ البتہ اتنا یاد رکھئے کہ اقبال کی "شمشیر و سناں" میں خونریزی کی تلمیح نہیں، جفاکشی، سخت کوشی اور خدمت خلق کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لئے ان کے استعمال پر ایک بہت کڑی شرط عائد کی گئی ہے

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید　　　　تیغ او در سینۂ او آرمید

یعنی اگر دولت اور ملک گیری کی ہوس میں تلوار اٹھائی جائے تو انشاءاللہ وہ تلوار خود ان کے سینے میں اتر جائے گی اور شاید اس سے کہیں بہتر ہو گا کہ قوم طاؤس و رباب کے بے کار شغل ہی میں الجھی رہے!

○

تہذیب کی حفاظت

میں نے اس کتاب کے گذشتہ بابوں میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہماری بہترین قدروں کو بعض رجعت پسند اور انسانیت دشمن تحریکوں کی وجہ سے خطرہ درپیش ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان قدروں کی حفاظت یا دوسرے لفظوں میں تہذیب کی حفاظت کے لئے مناسب تدبیریں اختیار کریں، ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں جس قدر اہل فکر اور خیر کے طالب ہیں، ان سب کے سامنے یہ سوال ایک چیلنج کی شکل میں موجود ہے۔ اس انقلابی دور میں جب سائنس کی ناقابل یقین ترقی اور جنگ کے بھیانک ہتھیاروں نے زندگی کو نئی اور خطرناک جہتوں سے آشنا کر دیا ہے، ہمیں ذہنی اور اخلاقی طور پر اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہونا چاہیئے اور جو نئے مسئلے پیدا ہو رہے ہیں ان کو معقول طریقے پر حل کرنے کی صورتیں نکالنی چاہئیں۔ ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ ہم نہ اپنی آزادی قائم رکھ سکیں گے نہ اس میں معنی پیدا کر سکیں گے نہ مادی اور اخلاقی اعتبار سے ترقی کر سکیں گے، نہ دنیا کے سامنے کوئی قابل قدر چیز پیش کر سکیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مسئلوں کا حل بہت کچھ اہل قوت و سیاست اور حکومتوں کے ہاتھ میں ہے لیکن ان کو اس کی پوری ذمہ داری سپرد کرنا یا اس قابل سمجھنا کہ وہ اس فرض کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں بڑی غلطی ہوگی۔ وہ زیادہ سے زیادہ انسانی ضمیر میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ایک سازگار ماحول مہیا کر سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ ذمہ داری عالموں، ادیبوں، شاعروں، معلموں اور دوسرے

اہل فکر کی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ سوال کریں کہ اس دنیا میں جہاں ہر طرف قوت کی کشمکش اور جبر وتشدد کی حکمرانی ہے اور دنیا کی قسمت کا فیصلہ گویا ایٹم بم کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں جن کے ہاتھ میں قلم اور زبان اور فکر کی طاقت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کا یہ خیال کرنا کہ وہ واقعات کی یورش کو روک سکتے ہیں یا ان کے دھارے کو بدل سکتے ہیں ایک بے جا ادعا ہوگا۔ میں بہت خلوص کے ساتھ اس خیال کی صحت کو چیلنج کرتا ہوں اور اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہوں کہ انسانی فکر میں جنگ کے مہلک ترین ہتھیاروں سے کہیں زیادہ قوت ہے اور انسانوں کے مسئلوں کا آخری فیصلہ انسان کی قوتِ فکر ہی کر سکتی ہے نہ کہ وہ آلات جو اس نے ایجاد کئے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں امریکہ کے مشہور رسالے نیو ری پبلک کے اڈیٹر نے اپنے مقالے میں اس حقیقت کو بڑے واضح اور دل نشیں انداز میں پیش کیا تھا اور اب تقریباً پچاس سال گذر جانے کے بعد بھی وہ الفاظ ایسے ہی سچے اور برمحل ہیں جیسے اس وقت تھے:

"اب کسے فکر ہے کہ تصویریں بنائے یا شاعری کرے۔ یا زبان کے میدان میں معنی آفرینی کرے یا مادے کی ساخت کے بارے میں دماغ لڑائے۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے روم میں آگ لگی ہو اور کوئی بیٹھا بانسری بجائے! کسے فکر ہے کہ اخبار اور رسالے نکالے۔ کاغذ پر روشنائی یا فضا میں خیال آفریں جملے بکھیرے جو جنگ کے شور شغب میں طوطی کی آواز بن جائیں۔ یا ان امیدوں کا نوحہ پڑھے جو باسی ہوگئی ہیں۔ اب فکر کا چراغ جلانے سے کیا حاصل؟ پیادہ فوج کے دستے کے مقابلے میں ایک نقاد کی کیا حیثیت ہے؟... لیکن حقیقت یہ ہے کہ توپوں کے مقابلے میں بھی آخری دلیل انسان کی قوت فکر ہے۔ بندوق کا تصور انسان کے ذہن ہی میں پیدا ہوا تھا۔ فوجوں کی نظم وترتیب اسی کا کارنامہ ہے۔ جنگی جہازوں کا وجود فزکس اور کیمسٹری کی ترقی کے بغیر کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ انسانوں ہی نے تخریب کے یہ حیرت انگیز مرقع تیار کئے۔ انہوں نے پہلے اس کا خواب دیکھا اور پھر خیال کی قوت سے اس کو عملی شکل دی لیکن اب یہ طاقت ان کے بس سے باہر ہوگئی ہے اور ان پر ایسی پوشیدہ قوتیں مسلط ہوگئی ہیں جن کو

وہ سمجھ نہیں پائے۔ وہ انہیں اس وقت تک رام نہ کرسکیں گے جب تک وہ خوب سوچ سمجھ کر یہ طے نہ کرلیں کہ انہیں اس تخریب کے دیو کا سر کچلنا ہے اور ایک ایسے تمدن کی تنظیم کرنی ہے جو پوری طرح ان کے قابو میں ہوگا، اور کوئی مشین اس کے ساتھ غداری نہ کرسکے گی۔ ایک تلوار کے بنانے میں اتنی ہی قابلیت کی ضرورت ہے جتنی ایک ہل کے بنانے میں لیکن تلوار پر ہل کو ترجیح دینے کے لئے انسانی قدروں کی زیادہ صحیح پرکھ درکار ہے۔ اگر ہم یہ جانتے ہیں تو قوت فکر کو بےکار سمجھ کر کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ وہ کتنی ہی کمزور اور ناپختہ ہو، اس کے سوا اور کون سی طاقت ہے جو جنگ کی حماقتوں اور مشتعل جذبات کی آگ کو ٹھنڈا کرسکتی ہے؟ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری زندگی کیسی غیر محفوظ بنیادوں پر قائم ہے اور ہماری تہذیب اور تمدن کس قدر کمزور اور تنگ نظر ہیں۔ لیکن ہم مستقبل کو اس طرح بہتر نہیں بنا سکتے کہ جہالت اور خوف کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے رہیں۔ اگر ماضی میں ہمارا فکر بےبس اور ناکارہ رہا ہے تو ہم فکر کا دامن چھوڑ کر خود کو نہیں بچا سکتے کیونکہ بداعمالیوں اور غلط کاریوں کے نامبارک حلقے کو توڑنے کا محض ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اس پر برابر بےلاگ اور بےامان تنقید کرتے رہیں۔ دراصل جنگ کا گناہ اور ذمہ داری ان تمام لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنی زندگی میں فکر سے کام نہیں لیا، جنھوں نے کبھی غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، جو اپنی بےمعنی مصروفیتوں میں اس طرح پھنسے رہے کہ انہیں دنیا کی کوئی فکر نہیں ہوئی، جو آگے بڑھتے ہوئے ڈرتے تھے، انقلاب سے ڈرتے تھے . . . جو ایک جھوٹے اور فریب دہ امن کے خواہاں تھے، جو کبھی معقول اور شریف زندگی کی قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں ہوتے!"

یہ تنقید امریکہ ہی پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر صادق آتی ہے اگر ہم ان قدروں کو بدلنا اور ان نامبارک رجحانوں کو دبانا چاہتے ہیں جو اس زمانے میں ہمارے قومی دل و دماغ کو مسخ کرنے کے درپے ہیں تو پہلے ہمیں کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہم موجودہ صورت حال کے ذمہ دار ہیں اور پھر اس کی اصلاح کے لئے اپنے تمام فکری اور عملی وسائل سے کام لینا چاہیئے۔

ممکن ہے ہمیں اس میں کامیابی ہو، ممکن ہے نہ ہو۔ لیکن کوئی شخص پہلے سے زندگی کے ساتھ شرطیں نہیں کرسکتا بلکہ ایک لحاظ سے کسی اچھے مقصد کے لئے خلوص کے ساتھ جدوجہد کرنا کامیابی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اہل فکر بے جا انکسار، یاس پرستی اور شکست کی ذہنیت ترک کرکے اس بات کا عزم کریں کہ وہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں پوری قوت سے ایک ذہنی اور اخلاقی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جو اس سیاسی انقلاب سے کہیں زیادہ ضروری ہے جس میں ہو کر ہم گزرے ہیں۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں جن افراد کی میں نے سیرت کشی کی ہے ان سب میں کسی نہ کسی حد تک یہ سعی مشکور مشترک ہے۔

جیسا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ حیات برتر کے لئے اس جدوجہد میں ہمارے پاس علاوہ اپنی تہذیبی میراث کے ایک سرچشمہ ہدایت اور بھی ہے اور وہ ہے گاندھی جی کی تعلیم اور ان کا کام۔ انہوں نے ملک کی حالیہ تاریخ میں دو بہت بڑے کام کئے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن دراصل مربوط ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کی اور کیسی شان دار تھی یہ جنگ جس کی مثال دنیا کی سیاسی تاریخ میں مشکل سے ملے گی! یہ بجائے خود ایک ایسا کارنامہ ہے، چالیس کروڑ انسانوں کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا، کہ اس کی وجہ سے تاریخ کے ایوان میں ان کے لئے ایک بلند مقام محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن دراصل ان کی حیثیت محض ایک سیاسی لیڈر کی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ وہ ایک معلم، ایک مصلح اور ایک نئے عالمی پیغام کی آواز بھی تھے۔ انہیں قوم کے اخلاقی اور ذہنی انقلاب کی بھی اتنی ہی فکر تھی جتنی سیاسی انقلاب کی بلکہ اس سے زیادہ۔ وہ دراصل سیاسی انقلاب اس وجہ سے چاہتے تھے کہ اس کے بغیر وسیع تر سماجی اور اخلاقی انقلاب ممکن نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک ہندوستانیوں کے ہاتھ میں سیاسی قوت نہ ہو وہ اپنی مخصوص، تہذیبی، اخلاقی اور روحانی روایتوں اور قدروں کے مطابق زندگی کی تشکیل نہیں کرسکتے۔ انہوں نے ہمارے لئے اخلاقی قدروں اور عملی دانش مندی کی ایک بیش بہا دولت چھوڑی ہے اور اپنے مقصد

کو حاصل کرنے کا ایک نیا راستہ دکھایا ہے جس پر چل کر ہم قوم میں یک جہتی پیدا کر سکتے ہیں اور ان دیواروں کو توڑ سکتے ہیں جو عوام اور خواص، تعلیم یافتہ اور عام لوگوں کے بیچ میں حائل ہیں۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان نہ صرف آزاد ہو بلکہ اس آزادی کا اہل ثابت ہو۔ اس دوسرے مقصد میں اپنی زندگی میں انہیں مقابلتہً محدود کامیابی حاصل ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ایک حیرت انگیز حد تک اپنی سیاسی جنگ کو تشدد اور نسلی نفرت کی آلودگی سے پاک رکھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کشمکش میں چند مقام ایسے آئے جب ان کے ہم وطن ان کے بلند معیار سے نیچے گر گئے۔ لیکن دراصل تعجب کی بات یہ نہیں، تعجب تو یہ ہے کہ انہیں کس حد تک اس انوکھی مہم میں کامیابی ہوئی! اپنے دوسرے مقصد یعنی قوم کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے جہاد میں ان کی کامیابی دو وجہ سے محدود رہی۔ عام اصول ہے کہ جب کوئی قوم آزادی کی جنگ میں مصروف ہوتی ہے تو اس کی توجہ کا مرکز اس کا سیاسی پہلو ہوتا ہے۔ یہی صورت حال ہندوستان میں درپیش تھی۔ اس کشمکش کے دوران میں اخلاقی قدروں کی علم برداری تو زیادہ تر گاندھی جی اور ان کے بعض قریب کے دوستوں اور ساتھیوں کے حصے میں آئی اور عام لوگوں کو زیادہ تر سیاسی ستیہ گرہ کی، بڑے پیمانے پر مل جل کر احتجاج کرنے کی، قانون توڑنے اور اس کی سزا بھگتنے کی تربیت ملی۔ یہ چیزیں سیاسی جدوجہد کے ہنگامے میں ضروری اور مفید ہوتی ہیں۔ لیکن جب آزادی کے بعد قوم کے سماجی نظام کو از سر نو تعمیر کرنا ہو تو یہ نہ صرف اتنی ضروری نہیں ہوتیں بلکہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضبط کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی، اپنے بنائے ہوئے قانون کا احترام کرنے کی، معاملات میں رواداری اور باہمی لین دین کی ذہنیت کی اور ذاتی فائدے کے مقابلے میں اجتماعی فائدے کو مقدم سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ افراد میں یہ صفات اسی طرح پیدا ہو سکتی ہیں کہ ہم مختلف تعلیمی اور سماجی اداروں کے مجموعی اثرات سے کام لے کر ان کی تربیت کریں۔ جب تک وہ سب متفقہ طور پر اس مقصد کے لئے کوشش نہ کریں، ذہنی انقلاب ناممکن ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر ہماری آزادی کے مطلع کو فرقہ وارانہ فساد، لوٹ مار اور خونریزی کے واقعات نے مکدر نہ کیا ہوتا تو لوگ آزادی کی منزل میں ایک خاص امنگ اور تعمیر کا حوصلہ لے کر داخل ہوتے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلے ہی دن سے بلکہ آزادی کے اعلان سے بھی بیشتر ملک کو دوچار ہونا پڑا فرقہ وارانہ فسادوں سے، قانون کی کھلم کھلا خلاف ورزی سے، شرنارتھیوں کی تباہ حالی سے، اور قحط، وبا اور طوفان کی آزمائشوں سے جنھوں نے ہمارے اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دیا اور جس کی وجہ سے نہ صرف آزادی عارضی طور پر خطرے میں آگئی بلکہ شریف اور نیک نیت لوگوں کے حوصلے پست ہو کر رہ گئے اور شر پسندوں کو موقع ملا کہ وہ قانون کے بندھن توڑ کر سماج دشمن حرکتیں کریں۔ خیال ہوتا ہے کہ اگر گاندھی جی چند سال اور زندہ رہ جاتے تو وہ اپنی شخصیت کی تمام قوتوں کے ذریعہ اس اخلاقی ابتری کی روک تھام کرتے اور شاید ان کی محبت، دانش مندی اور روحانی فیض کی بدولت ہماری زندگی میں اس زہر کا اثر زائل ہو جاتا اور قومی صحت خراب نہ ہوتی۔ لیکن یہ نعمت ہماری قسمت میں نہ تھی۔ تاہم ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جب جنون اپنی پوری قوت کو پہنچ چکا تھا انہیں کی ذات تھی جو اس تشدد اور انسان دشمنی کے مقابلے میں، جو ہندوستان اور پاکستان میں پلیگ کی طرح پھیل گیا تھا، ایک مضبوط دیوار کی طرح قائم رہی اور جب موقع آیا تو انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس سیلاب کو روکا جو پورے ملک کو بربادی میں ڈبو سکتا تھا۔ جس وقت سارا ملک آزادی کا جشن منا رہا تھا (جس حد تک ان حالات میں لوگ ایسا کر سکتے تھے) خدا کا یہ ناتواں بندہ، یہ سالک راہ حق بنگال میں گاؤں گاؤں مارا مارا پھر رہا تھا تاکہ فرقہ وارانہ فساد کی آگ کو بجھائے۔ اسے معلوم تھا کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک معنی میں شروع ہوئی ہے۔ اسے تو ایک ایک گھر اور ایک ایک جھونپڑی میں اور لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں اس وقت تک جاری رکھنا ضروری ہے جب تک سمجھداری اور شرافت جنون اور حیوانیت پر غالب نہ آ جائیں۔

اگر وہ اس وقت اس آگ میں نہ کود پڑتے تو نہ معلوم صرف مسلمانوں کی اقلیت ہی کا نہیں بلکہ ہندوستان کا اور اس کی بہترین قدروں اور آدرشوں کا کیا حشر ہوتا۔ ان کی قربانی کا کم سے کم یہ اثر ہوا کہ

کہ عارضی طور پر یہ سیلاب رک گیا اور قوم کو سانس لینے کی اتنی مہلت مل گئی کہ وہ اپنی ہاری ہوئی اخلاقی سکت کو جمع کر کے اپنی زندگی کی شیرازہ بندی کے لئے جدوجہد کر سکے جس طرح ایک سانس اکھڑا مریض اکسیجن لے کر زندہ رہنے کے لئے کرتا ہے۔ اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل نہ ہونے کا ایک اور سبب بھی تھا۔ آزادی کی حفاظت اور قیام کے لئے جو صفات ضروری ہوتی ہیں ان کی تربیت غلامی کے ماحول میں ممکن نہیں۔ جیسے تیرنے کی مشق خشکی پر نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کے لئے پانی میں کودنا ضروری ہے اور جسم میں وہ توازن پیدا کرنا جو اسے ڈوبنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی حال سیرت کا ہے جو آزادی کی کشاکش اور لین دین میں ڈھلتی ہے۔ ممکن ہے سیاسی غلامی کے زمانے میں ان صفات کی بنیاد ڈالی جا سکے اور بعض لوگوں میں وہ پیدا بھی ہو جائیں لیکن عام طور پر یہ صفات اس وقت ابھرتی ہیں جب لوگوں کو آزادی کی فضا میں سانس لینے اور زندگی بسر کرنے کا موقع ملے لہذا یہ توقع کیسے ہو سکتی ہے کہ چالیس کروڑ سے زیادہ انسانوں کو آزاد اور جمہوری اداروں کے عملی تجربے کے بغیر آزادی اور جمہوریت کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے؟ یہ تجربہ تو ہم اب حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن جیسا میں نے کہا اس میں شروع ہی سے ایسی مصیبتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ یہ مشکل کام بہت زیادہ مشکل ہو گیا۔ اگر ہم نے آزادی نارمل حالات میں حاصل کی ہوتی تو اس وقت بھی قومی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن جب ماحول میں نفرت، تعصب اور تنگ نظری کی قوتیں کارفرما ہوں تو معلموں اور ذہنی قائدوں کا فرض کہیں زیادہ مشکل ہو جاتا ہے اور اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ انتشار اور خود غرضی کو روکنے اور باہمی مفاہمت اور دیانت داری کی فضا پیدا کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ لیکن عملی تدبیریں اختیار کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ لوگوں میں شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہو کہ موجودہ صورت حال ناقابل برداشت ہے اور ہم کسی صورت میں ان قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں گے جو ہماری تہذیب کی شریف قدروں کو کچلنا اور مستقبل کے ساتھ غداری کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ابھی تک عوام تو کیا ہمارے بیشتر لیڈروں میں بھی یہ احساس اس درجہ عام اور پُر خلوص نہیں جتنا ہونا چاہیئے بلکہ دراصل صورت حال یہ ہے کہ

سیاسی اقتیار اور قوت حاصل کرنے کے لئے بہت سی جماعتیں لوگوں کے جاہلانہ تعصب اور تنگ نظری سے کام لے کر ان کے گھٹیا جذبات اور چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھڑکانا چاہتی ہیں اور چونکہ اب انتخابات کا زمانہ قریب ہے اس لئے اس نامبارک تحریک میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔ جیسا میں نے اس کتاب میں بار بار بیان کیا ہے۔ عام طور پر اعلیٰ جذبات اور قدروں کی کشش لوگوں کو ایک محاذ پر مشکل سے جمع کر پاتی ہے۔ لیکن نسل، رنگ، مذہب، زبان، ذات پات کے بھید بھاؤ کا واسطہ دے کر ان کو ایک دوسرے کی مخالفت پر آسانی سے اکسایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک خطرہ ہے جس سے ہمیشہ جمہوریت کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ جمہوری نظام میں عوام کی طاقت کو معقولیت اور اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے کے لئے نہ تو کسی "نیک نیت" ڈکٹیٹر سے کام چل سکتا ہے، نہ کچھ لوگوں کو (جن کے ہاتھ میں قوت ہو) مہذب اور ذمہ دار بنانے سے۔ اس کے لئے ان تمام لوگوں کے معیار فکر و عمل اور سیرت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے، جو اس ریاست کے شہری ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کام جہاں زیادہ مشکل ہے وہاں زیادہ ہمت انگیز اور حوصلہ آفریں بھی ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں کو جو خود سیاست کا کھیل کھیلتے ہیں اور ان تحریکوں کو ہوا دیتے ہیں موجودہ صورت حال کی نزاکت کا کس حد تک احساس ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو اس خطرناک کھیل کو باہر سے دیکھ رہا ہو، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ملک کے معلموں، مفکروں اور دوسرے بہی خواہوں کو اس نزاکت کی طرف صاف لفظوں میں توجہ دلاؤں۔ جب آج کل کے بہت سے اخبار یا بعض با اثر لوگوں کی تقریریں پڑھتا ہوں تو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم آگ سے کھیل رہے ہیں، ایک ایسے مکان میں جس میں بارود بھری ہوئی ہو۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں، خواہ مفاد مخصوصہ اس بات سے انکار کریں۔ اگر آئے دن سادہ لوح عوام کے دل و دماغ میں جن کی مناسب تربیت نہیں ہوئی، تنقیدی قوتیں بیدار نہیں ہوتیں جو افلاس کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور آسانی سے لفظوں کا فریب کھا سکتے ہیں، زہریلے خیالات اور جذبات ڈالے جائیں گے تو

ان کی اخلاقی اور دماغی صحت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ اس خطرے سے ان کو بچانا تمام اہل فکر اور نیک نیت لوگوں کا فرض ہے۔ ان کے لئے نہ تو یہ عذر کافی ہے کہ وہ کیا کر سکتے ہیں (وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں)، نہ انہیں یہ خیال تسکین دے سکتا ہے کہ بہت سے دوسرے ملکوں میں جن میں ہمارے پڑوسی ملک بھی شامل ہیں، صورت حال اتنی ہی خراب ہے۔ اگر پڑوس میں آگ لگی ہو تو آگ کے پھیلنے کا خطرہ اور اس کو بجھانے کا فرض بڑھ جاتا ہے، کم نہیں ہوتا! اس لئے ایک طرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم خوش فہمی کے فریب سے بچ کر اس خطرے کو سنجیدگی سے محسوس کریں اور دوسری طرف اس کی روک تھام کے لئے ہر قسم کے طریقے اختیار کریں۔ آج کل ملک میں جذباتی ہم آہنگی اور 'یک جہتی' کے الفاظ بہت چالو ہیں اور کمیٹیاں اور اخبار اور قوم کے لیڈر اس کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں لیکن کوئی مشکل اجتماعی گتھی محض خوش نما اور خوش آواز لفظوں کی انگلیوں سے نہیں سلجھ سکتی۔ اس کے لئے ایک طرف ایسی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تدبیریں اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو اس کے بنیادی اسباب کو دور کریں ان میں سب سے بڑا سبب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ افراد اور جماعتوں کے تعلقات میں انصاف کی کارفرمائی نہیں ہوتی۔ جہاں انصاف نہ ہو وہاں دل صاف نہیں ہو سکتے اور دلوں کی صفائی کے بغیر کسی سماج میں امن اور شانتی اور فراغت کا قیام ناممکن ہے۔ یہ اقلیت اور اکثریت کی کشمکش۔ یہ زبانوں اور صوبوں کے جھگڑے۔ یہ اونچی اور نیچی ذاتوں کا تصادم، یہ مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ، سب اسی ایک بنیادی اور مہلک مرض کے نامبارک مظاہرے ہیں۔ یہ مرض اسی وقت دور ہو سکتا ہے جب سماج میں سے بے انصافی، ظلم اور حق تلفی کا خاتمہ کیا جائے اور ہر جماعت اور طبقے کو اس کے جائز حقوق سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے ــــــ جیسا ہم نے دیکھا ایسے منصوبوں کی داغ بیل پڑ چکی ہے لیکن یہ کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ قوم میں کوئی جماعت یا کم سے کم کچھ افراد ایسے ہوں جن میں جرأت اور دیانت ہو جو متنازعہ فیہ مسائل اور معاملات کے بارے میں اپنی بے لاگ اور سچی رائے دیں۔ خود اس پر عمل کریں اور دوسروں کو عمل کی ترغیب دیں اور اپنی حق گوئی کی قیمت ادا کرنے کو تیار رہیں۔ سچ بولنے کی کم سے کم قیمت افراد کے لئے رسوائی اور

نامقبولیت ہے بقول حالی:

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی — سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

یہ بھی ممکن ہے کہ ان پر الزام لگایا جائے وطن دشمنی کا، اپنی خاص جماعت یا مذہب سے غداری کا اور ان کو مختلف طریقوں سے بدنام کرنے کی کوشش کی جائے لیکن جب تک وہ ان سب ذلتوں کو خاطر نشان نہ کریں قوم کے ضمیر میں انقلاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی سیاسی جماعت اس دشوار گذار اخلاقی امتحان میں پڑنے کو آمادہ ہو تو اسے کم سے کم اس بات کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ وہ انتخابات میں ہار جائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو بدترین رنگ میں قوم کے سامنے پیش کیا جائے۔ مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اس دور میں شرافت کی زندگی نہ تو افراد کے لئے ممکن ہے نہ جماعتوں کے لئے جب تک وہ ان خطروں کو مول نہ لیں! اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشی اور سماجی منصوبوں میں بھی پوری کامیابی اور برکت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ ان کے بہت سے چلانے والوں میں اس اخلاقی جرأت کی کمی ہے جس کا میں مطالبہ کر رہا ہوں اور جو سمجھتے ہوں کہ "عشق کی خاطر دنیا کو کھو دینا ایک نفع کا سودا ہے"۔

ان مخالفتوں میں سب سے زیادہ ناپاک مذہبی مخالفت اور نارواداری ہے۔ کسی شخص یا جماعت کے خلاف اس بنا پر تعصب کرنا یا اس کی حق تلفی کرنا کہ اس کا تصور کائنات یا طریقہ عبادت ہم سے مختلف ہے انتہائی حماقت ہے۔ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اہمسا کے پجاری، گرونانک جیسے صلح پسند انسان کے پیرو اور اسلام کے نام لیوا (اسلام جس کا مفہوم ہی امن اور سلامتی ہے) ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور اس جنون میں انہوں نے نہ صرف خونخوار حیوانوں سے بدتر حرکتیں کیں بلکہ یہ سمجھا کہ وہ اس طرح ہندومت یا سکھ دھرم یا مذہب اسلام کی خدمت کر رہے ہیں! یہ خیال مذہب کی شان میں ایک ناقابل معافی گستاخی ہے اور ہر وہ شخص جو مذہب کو عزیز رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اس داغ کو مذہب کی پیشانی سے دور کرے اور اپنے ہمدردی، محبت اور رواداری کے سلوک سے اس بات کو ثابت کر دکھائے کہ مذہب

وصل کا پیام دیتا ہے فصل کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ ہر انسان کے جذبات کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔ اس کے نزدیک قتل و خون اور فتنہ و فساد کا تو کیا ذکر ہے کسی انسان کی دل شکنی سب سے بڑا اخلاقی جرم ہے جانتا ہوں کہ تاریخ میں بارہا مذہب کو دوسرے اختلافات کے لئے ایک آڑ بنایا گیا ہے تاکہ بدنیت لوگ اپنے ذاتی مقصد حاصل کرنے کے لئے مذہبی تعصب سے کام لے سکیں۔ لیکن ایک جمہوری ملک میں ان اختلافات کو طے کرنے کے دوسرے طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ سیاسی اختلافات کس ملک میں نہیں؟ رائے کا فرق کس ضابطہ اخلاق میں گردن زدنی ہے؟ لیکن سمجھدار لوگ اختلافات کا فیصلہ سر توڑ کر نہیں، سر جوڑ کر کیا کرتے ہیں۔ عقل مند آدمی کی ناک پر مکھی بیٹھ جاتی ہے تو وہ غصے میں ناک کو نہیں کاٹ دیتا بلکہ ہاتھ سے مکھی کو اڑا دیتا ہے۔ جب تک زندگی کی باگ ڈور عقل اور شرافت کے ہاتھ میں نہ ہوگی، جب تک گھٹیا اغراض کو اعلیٰ مقاصد پر ترجیح دی جائے گی، جب تک قدروں کی صحیح پرکھ نہ ہوگی نہ کسی ملک یا قوم کا مستقبل سدھر سکتا ہے نہ اس کی تہذیب محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہ اصول عام اور عالم گیر ہے اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ لیکن اب کہ زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور سائنس نے ساری دنیا کو وابستگی کے ایک نئے رشتہ میں جکڑ دیا ہے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ جو تحریک فرقہ پرستی یا صوبہ پرستی یا باہمی تعصب کی کسی اور شکل میں سرپرستی کرتی ہے وہ ہندوستان کی اصلی تہذیبی روح کے منافی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہماری سیاسی اور اخلاقی قوت اور وقار میں کمزوری پیدا ہو تنوع بجائے خود کوئی بُری چیز نہیں بلکہ اس پر تو انسانی تہذیب و تمدن کی گوناگونی کا انحصار ہے اور اسی میں ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر لوگ اپنی خاص زبان یا مذہب یا جائے پیدائش یا صوبے سے محبت کریں اور ان کی خدمت کر کے انہیں ملک کی زندگی میں ایک اعلیٰ مقام دلانے کی کوشش کریں تو یہ ایک قابل قدر جذبہ ہے لیکن سچّی محبت کا دائرہ تنگ نہیں وسیع ہونا چاہیئے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان دو چیزوں کی محبّت قومی یک جہتی یا انسانی وحدت کے تصور کی راہ میں حائل ہو۔ ایک ماں اپنے بچّے سے شدت کے ساتھ محبت کرتی ہے لیکن اگر اس کی جذباتی نشو و نما صالح ہے اور محبت غلط راستے پر نہیں پڑگئی ہے تو ممکن ہے

وہ وسیع ہو کر ذات اور خاندان کی حدوں کو توڑ کر دوسرے بچوں کو بلکہ دنیا بھر کو اپنی آغوش میں لے لے۔
دراصل تعلیم کا ایک معنی میں کام یہی ہے کہ وہ تنگ تصورات کی بجائے وسیع تصورات اور قریب کے مقصدوں کی بجائے دور کے مقصدوں کی لگن دل میں پیدا کرے اور غلط راستوں کی بجائے، خواہ وہ ظاہر میں کتنے ہی سہل اور دل کش ہوں، صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرے، خواہ وہ کتنا ہی دشوار گذار ہو۔

معلم اور سیاسی پروپیگنڈا کرنے والوں میں ایک فرق (جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں) یہ ہے کہ ایک سیاسی شاطر لوگوں کے تعصب اور اندھے جوش سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ جن غلط خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں ان کا زیادہ اونچی آواز میں اور شدت کے ساتھ اعلان کرتا ہے اور اس طرح ان کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ برخلاف اس کے سچے معلم اور مفکر کو دھارے کے ساتھ بہنے کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جاہلانہ تعصبات اور خیالات کی ہم نوائی کرے۔ اس کا اصلی مقصد صحیح قدروں کی تفسیر اور تلقین ہے۔ وہ لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے تاکہ ان پر اثر ڈال سکے۔ لیکن ان کی تعریف یا خوشامد کا طالب نہیں ہوتا بلکہ ان کی پرواہ تک نہیں کرتا۔ اس میں ضرورت کے وقت دھارے کے خلاف تیرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ میں نے اس کتاب میں جن لوگوں کی سیرت کا ذکر کیا ہے تقریباً ان سب میں خودداری اور حق پسندی کی یہ صفت مشترک ہے۔ ہمیں اس وقت اپنی موجودہ نسل میں روشن خیالی، وسعت نظر، رواداری اور انسانیت کی صفات پیدا کرنی ہیں اور اس کے لئے بہت سے عصری رجحانات کے خلاف جنگ کرنی ہے۔
اگر ہم مضبوطی اور صفائی کے ساتھ ہر اس چیز کی، جسے ہم صحیح کہتے ہیں حمایت کرنے کی اور ہر اس چیز کی جسے غلط سمجھتے ہیں، مخالفت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو 'معلمی' کا کام ہمارے بس کا نہیں۔ تہذیب کی حفاظت کے لئے جہاں ایک طرف اس کی ذہنی اور جذباتی قدروں کی عفت کا قائم رکھنا ضروری ہے وہاں اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم روزمرہ کی شہری زندگی اور عام کارکردگی کے معیار کو بلند کریں۔ جس سماج میں رشوت ستانی، اقربا پروری اور معاملات میں بددیانتی کا رواج ہو 'صناعو'

دستکاروں، دفتر کے کارکنوں، حکومت کے افسروں اور پبلک لیڈروں میں کام کا احترام اور اس کی محبت کم ہو جائے جہاں عام طور پر لوگوں کو یہ شوق نہ ہو کہ ہر کام کو پوری قوت اور قابلیت کے ساتھ کریں بلکہ محض "کام چلانے" کی ذہنیت مسلط ہو۔ وہاں تخلیقی سوتوں کے خشک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ بات قومی زندگی کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ لوگوں کی عملی دیانت کے معیار کو بلند کرے۔ جانتا ہوں کہ ان تمام بیماریوں کا علاج، جن کی جڑیں ہمارے سماجی ماحول میں پیوست ہیں، محض تعلیم اور تلقین نہیں لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ایک بہترین سماجی اور معاشی نظام بھی ان کا تدارک نہیں کر سکتا جب تک تعلیم شروع ہی سے کردار کی تعمیر صحیح اور مستحکم بنیادوں پر قائم نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے معلموں کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے مگر یہ کوئی آسان کام نہیں۔ بیشتر معلم، بدقسمتی سے اس فرض کی ادائیگی کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں نہ خواہش۔ وہ تو اس پیشے میں محض اس وجہ سے داخل ہوئے کہ کسی دوسرے میں ان کو جگہ نہیں مل سکی! کچھ معلم ایسے بھی ہیں جن میں علمی شوق اور صلاحیت ہے لیکن وہ بھی عام طور پر اپنے علمی کاموں اور مطالعے میں مشغول رہتے ہیں اور انہیں اتنی فرصت یا دماغ نہیں کہ اپنے طالب علموں کے سامنے آج کی دنیا کا مکمل اور مربوط نقشہ پیش کر سکیں اور انہیں یہ بتائیں کہ اس میں ان کی جگہ کہاں ہے، اور انہیں کون سے اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ ان کو مختلف علوم بلکہ 'مضامین' پڑھاتے ہیں لیکن نہ زندگی سے ان کے تعلق کی تفسیر کر پاتے ہیں، نہ ان کے دل میں اعلیٰ قدروں اور معیاروں کی لگن پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ خود ان کی ذات میں ان قدروں کے چراغ روشن ہوں۔ ان کے دل و دماغ میں وسعت، خیالوں میں بلندی اور کام کی سچی لگن ہو اور یہ بدقسمتی سے بہت کم معلموں میں پائی جاتی ہیں۔ (میں اس صورت حال کی اقتصادی اور معاشرتی وجوہ سے ناواقف نہیں ہوں اور میرا مقصد الزام دینا نہیں، موجود حالات کی وضاحت کرنا ہے) پھر کیا تعجب ہے کہ ہمارے اکثر طلبہ کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی احساس اور فکر کی دولت سے محروم رہتے ہیں اور محنت اور دیانت داری کے ساتھ کام کرنے اور سوچنے کا عادی نہیں ہوتے؛ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے

کہ آگے چل کر وہ سست اور کم حوصلہ ثابت ہوتے ہیں اور غلط لیڈر شپ اور گھٹیا پروپیگنڈے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے ہماری قوم کی نفسیاتی کیفیت کا ایک رُخ جس سے ہمیں نبٹنا ہے — قومی زندگی کی یہ بے راہ روی اور بہت سے اہل سیاست کی تنگ خیالی اور رجعت پسندی محض سیاسی انتشار کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک گہری نفسی اور اخلاقی بیماری کی علامتیں ہیں۔ جس چیز کو سطحی نظر سے دیکھنے والے افراد یا جماعتوں کی مادی کشمکش سمجھتے ہیں۔ اس کی تہ میں مختلف ذہنیتوں اور اخلاقی قدروں کی کشمکش ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں (بلکہ ساری دنیا میں) اس وقت جو جنگ ہو رہی ہے اس میں دو قوتیں برسر پیکار ہیں، ایک وہ جو عقل، رواداری، انسانیت اور سچی تہذیب کی نمایندگی کرتی ہیں۔ اور دوسری جو تعصب، تنگ نظری، تاریک خیالی اور اندھی ماضی پرستی کی تائید کرتی ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جو لوگ ان دونوں گروہوں میں شریک ہیں ان میں بالکل سفید و سیاہ کی نسبت ہے۔ دونوں طرف مخلص اور ریاکار لوگ شامل ہیں۔ لیکن ان دونوں تحریکوں میں جو تضاد اور تصادم ہے اس کو صاف صاف سمجھنا ضروری ہے اور یہ فیصلہ کرنا کہ ہم حیات بخش قوتوں کا ساتھ دیں گے یا ان قوتوں کا جو زوال اور موت کی طرف لے جا سکتی ہیں۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد اس نازک فیصلہ میں صحیح مشورہ دینا ہے۔ اس کشمکش میں ہم نہ خوش فہمی سے کام لے سکتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح خود بخود بغیر ہماری کوشش کے صورت حال سنبھل جائے گی۔ نہ حق اور ناحق کے درمیان کسی قسم کا سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ یہاں تو مطالبہ حق دوستی، حق پرستی اور اثبات حق کا ہے اور اس کی قیمت ادا کرنے پر آمادگی کا۔ یہ فرض تو ہر انسان پر عائد ہوتا ہے لیکن یہ خاص طور پر ہمارے مفکروں، عالموں، معلّموں، مصنفوں اور نیک نیت مدبّروں کے ضمیر کے لئے ایک چیلنج ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "جس قوم میں نظر نہیں ہوتی وہ ہلاک ہو جاتی ہے"۔ اس "نظر" کے اصلی حامل یہی لوگ ہیں۔ اگر انہوں نے یہ نظر پیدا نہ کی تو ہماری تہذیب کے زوال اور ناکامی کی ذمہ داری انہیں پر ہوگی اور کس قدر خوفناک ہے یہ ذمہ داری تاریخ کی نظر میں!

○